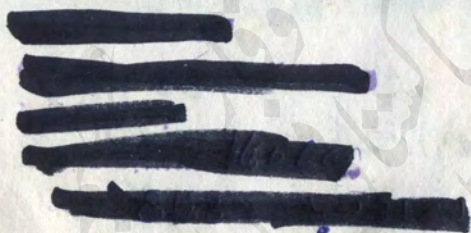


# بارش اور بالکونی

*Matched*



اے حمید خان

## مقبول ایڈری

۱۰، دیال سنگھ منیشن، شاہراہ قائد اعظم، لاہور

# فہرست

صفحہ

عنوان

۷

سیاہ پھول

۱۶۹

شہر اور گلیاں

۲۸۹

ویران جزیرے

۳۶۳

برف باری کی رات

367

جہاں برف گرتی ہے

۴۰۹

سیاہ محمول

یہ داغ جس میں مہک ہے  
 تجھے کہاں سے ملا؟  
 رات تجھے کبھی نہیں سلاتی  
 تو ہمیشہ جاگتا ہے  
 تو ہمیشہ اُداس ہے

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ باہر موسم سرما کے تاریک  
 آسمان پر گہرا اندھیرا ہے۔ سیاہ بادل جمع ہو رہے ہیں۔ کہیں کوئی چاند نہیں  
 کہیں کوئی ستارہ نہیں۔ سرد ہوا چل رہی ہے۔ ایک گہری اور اداس کر دینے والی  
 خاموشی طاری ہے۔ کبھی کبھی اس ویران خاموشی میں دور سڑک پر سے کسی تانگے  
 یا کار کے گزرنے کی آواز آ جاتی ہے جو ماحول کو اور بھی زیادہ اداس اور خوفزدہ  
 بنا دیتی ہے۔ میں ایک کمرہ کے اندر بند کھڑکی کے آگے پلنگ پر آ بیٹھی ہوں  
 پاس ہی میز پر ٹیبل لیمنپ پڑا ہے اس کا رنگ زرد ہے۔ ٹیبل لیمنپ کی اس  
 اداس روشنی میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہی ہوں۔ مجھے اس پلنگ پر لیٹے ہوئے  
 پورے دو ماہ گزر گئے ہیں.....

اس دن اسکول سے واپسی پر تانگے پر سے اترتے ہوئے میرے پاؤں  
 کو بہت زیادہ چوٹ آ گئی تھی۔ اور پھر یہ چوٹ ایسی بڑھی کہ اس نے مجھے شکر  
 بنا کر بستر پر ڈال دیا ہے..... ہلکا ہلکا بخار بھی شروع ہو گیا ہے....  
 اسکول شاید زیادہ دیر تک میری پھیٹاں برداشت نہ کر سکے گا۔ اور چند روز  
 کے بعد میری جگہ کوئی اور استانی آن کر کام کرنا شروع کر دے گی.....  
 اور چند روز تک لڑکیوں کے ذہن میں ایک اداس اور مغموم استانی کا چہرہ  
 گھومتا رہے گا۔ اور پھر وہ بھی بھول جائیں گی..... نئی استانی سے مانوس



ہو جائیگی۔ نہ جانے نئی اُستانی کیسی ہوگی یا کیا وہ میری طرح زندگی کے ہاتھوں دکھی ہو کر زندگی کے دن گزار رہی ہوگی۔ شاید اس امید پر..... کہ کبھی دن اچھے آجائیں گے..... شاید اچھے دن آجائیں۔ اور شاید دن کبھی اچھے نہ آئیں.....  
 پاؤں کی چوٹ دن بدن خوف ناک مشکل اختیار کرنی جا رہی ہے۔ اور ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ شاید پاؤں کاٹنا پڑ جائے..... اُف خدا..... کیا پھر میں نگڑی ہو جاؤں گی!!  
 ایک پاؤں سے چلا کر دل کی؟

ذرا سی چوٹ نے کتنی خوفناک مشکل اختیار کر لی ہے!

ذرا خطا سی باتیں کتنی بڑی بڑی اور گہری مشکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کس طرح انوکھا اور خوفناک روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ اور اس پر میرے شوہر کے یہ طنز یہ جیسے..... آہ!.....  
 رہ رہ کر میرے سینے کو چھیندے ڈال رہے ہیں..... کہ اگر پاؤں کٹ گیا۔ اور مٹی تلخڑی بیوی برداشت نہیں کر سکتا..... میں پہلے ہی بہت کچھ برداشت کر چکا ہوں..... مگر وہ سارا کچھ چھپا ہوا تھا..... لیکن یہ کھلا زخم..... یہ لنگڑا پاؤں.....  
 میں اسے کبھی برداشت نہ کر سکوں گا..... میں لوگوں میں یہ مشہور ہونا نہیں چاہتا۔ کہ اس کی بیوی نگڑی ہے۔ آخر مجھے بھی دینا میں ایک زندگی گزارنی ہے۔

نہ جانے میرا شوہر کیا کیا کچھ کہتا رہا تھا..... آہ!..... اس قدر ظالم اور ننگ دل آدمی ہے..... اس نے میری زندگی کس طرح خوار نہیں کی.....  
 مجھے زندہ رہنا پڑ رہا ہے نہ جانے کس امید پر زندہ ہوں!!.....  
 یہ میرا بڑھا بد مانغ شوہر..... جو مجھے کبھی پتہ نہ دے سکے گا جو میری گود کبھی ہر کہ نہیں کر سکتا..... بچو اپنی خفست یہ کہہ کر مٹا رہتا ہے..... کہ میں دوسری شادی کر لوں گا۔ تمہارے ہاں اولاد نہیں ہوتی..... لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں کہ اس کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوا..... لیکن انہیں یہ نہیں پتہ کہ لوگ اُسے اس لئے عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔

..... کہ اس بڑھے نے کس طرح اس نوعمر لڑکی سے شادی کر لی..... کہاں یہ ساٹھ

سال کا بڑھا..... اور کہاں یہ چھپیس سال کی لڑکی..... اور لوگ تو یہ سوچتے ہیں..... کہ میں نے جاوید کو چھوڑ کر اس بڑھے سے آخر کس لئے شادی کر لی..... ہاں لوگ سوچتے ہیں۔ اور بہت کچھ سوچتے ہیں..... میں بھی سوچتی ہوں کہ میں نے اس سے کیوں شادی کر لی..... مگر یہ سوچ بہت سی سوچوں کے دروازے کھول دیتی ہے..... اور میں ہانگ ہو جاتی ہوں۔ زندگی گزار رہی ہے..... زندگی گزرتی جاتی ہے وقت کبھی نہیں ٹھہرتا..... بگچہ زخم ایک بار دل پر لگ جائے۔ اسے کوئی چیز نہیں مٹا سکتی۔

جاوید! تم اس وقت بیٹھی نیند سو رہے ہو گے۔ اور خواب میں نیلی پھیلوں میں کھیسے ہوئے پھولوں سے محبت کی پراسرار سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہو گے۔ مگر تم کیا جانو..... کہ تمہاری جڑائی کے یہ تین سال میں نے کیسے گزارے ہیں..... اور ابھی نہ جانے کتنے سال اور گزارنے ہیں۔

میں سو نہیں سکتی..... میری نیند بہت کم میرے پاس آتی ہے۔ اور میں اکثر بے خواب راتیں بسر کرتی ہوں۔

نیند کی بھواروں سے لدی ہوئی ہوائیں میرے بچہ بھراؤں سے دُور بہت دور برس رہی ہیں..... میں جانتی تھی۔ تمہاری جدائی مجھے ہلاک کر دے گی۔ اور میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی۔ مگر جاوید! میں اپنے مقام سے گر کر کبھی تمہارے پاس نہ آنا چاہتی تھی..... مجھے جس مقام سے گرنا تھا میں لڑچکی ہوں اب مجھے مزید گرنا نہیں۔ بلکہ وہاں سے اٹھنا تھا..... اور میں نے اٹھ کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ تو میری اس بد مانغ بڑھے سے شادی ہو چکی تھی..... بس کی ایک بیوی موٹکی ہے اور دوسری کو طلاق دے چکا ہے۔ کہ اولاد نہیں ہوتی..... اور اب ایک نوعمر لڑکی سے شادی کی تھی۔ تاکہ اولاد ہو سکے..... بگچا اس بڑھے کے ہاں اولاد کیسے ہوا.....

یہ بڑھا مجھے کبھی پتہ نہ دے سکے گا..... میری کتنی خواہش ہے۔ کہ میرا ایک بچہ ہو۔ پیارا سا بچہ..... اور میں اپنی زندگی کے دکھی دن اس کے سہارے

گزار دوں ..... میں خودکشی کرنا نہیں چاہتی ۔ مجھے موت سے ڈر لگتا ہے  
اگرچہ زندگی نے مجھے کانٹوں اور پتھروں کے سوا کچھ نہیں دیا ۔ مجھ پر بھی مجھے زندگی  
سے محبت ہے ..... اور اسی لئے میں نے اسکول میں نوکری کر لی تھی ۔ تاکہ میرا دل  
رہے ..... محراب ..... اُف خدا ..... کیا اب میں نگڑی ہو جاؤنگی !  
..... میزاشوہر ..... میں نے اس کی ان تین سالوں میں طرح خدمت کی ہے کہ  
نہیں بیان کر سکوں گی ..... مجھ اس نے ہمیشہ مجھے طعنے دئے ہیں ..... اس  
ہمیشہ میرا دل جلایا ہے ۔

کاش ! جاوید ..... تم مجھے اپنے سے جدا نہ کرتے ..... تو آج میرا  
یہ حالت نہ ہوتی .....

جاوید ! اگر ہمارے ملاپ میں وقت یا زمانے کی دیوار مائل ہوتی تو میں ہمیشہ  
جنگلوں میں چلنے والی آندھی بن کر اسے اڑا لے جاتی ..... لیکن اس عالم میں جبکہ  
درمیان تم خود حاکم ہو رہے تھے ..... میں بے بس ہو گئی ..... میں کچھ نہ کر سکی  
..... میں کچھ نہ کر سکی ..... میں کچھ نہ کر سکتی تھی .....

جب تم خود ہی نہیں چاہتے تھے ۔ کہ ہماری شادی ہو ۔ تو پھر ہم کو خدا مہونا ہے  
تھا .....

گزی زندگی کی سادھی باتیں ایک ایک کر کے یاد آرہی ہیں ..... یاد آتی رہتی ہیں  
میں تقریباً جس سی ہوتی جا رہی ہوں ..... مجھ کبھی کبھی مضطرب ہو جاتی ہوں .....  
بے چین ہو جاتی ہوں ..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں تھی !! میں نے اپنا سفر کہاں  
سے شروع کیا تھا اور میں کہاں آں پہنچی ہوں ! میری اس حالت کی ذمہ داری کس  
عائد ہوتی ہے !! .....

اس بھری دنیا میں شاید روزانہ یہی واقعات ہوتے رہتے ہیں ۔ ایک چمکتے  
چلا رہا ہے ..... چلتا رہتا ہے .....

نرات ہو لے ہو لے بیت رہی ہے ..... نہ جانے یہ لمبی رات کب ختم

ہوگی ! ..... ہوگی بھی یا نہیں !!  
ڈاکٹر دزانہ آتا ہے ..... یہ بیمار کس قدر مہربان اور نیک دل ہے کتنی ...  
نوشش سے میرے پاؤں کو بچانے کی فکر میں ہے ۔ مجھ انفوس اسے دیر سے دکھایا  
گیا ہے .....

میرے شوہر کو بھلا پرواہی کب ہے ! وہ تو اب بھی فیصل آباد گیا ہوا ہے .....  
میں کو اس کا چار سو روپیہ ادھار دینا ہے اور اس نے دو سال سے نہیں دیا اور  
یہ ہر چوتھے روز وہاں لینے جاتا ہے اور دو سو روپیہ اپنا خرچ کر چکا ہے ۔ مجھ کہتا ہے  
اپنا ہزار روپیہ بھی خرچ کر دوں گا ۔ مجھ اس سے وہ چار سو روپیہ لیکر بھی رہوں گا .....  
میرے پاس بیٹھا عجیب و غریب باتیں کرتا رہتا ہے ۔ جس سے مجھے ذرا سی بھی دلچسپی  
نہیں ہوتی ۔ بھلا سورج کی گرمی اور برف کی ٹھنڈک ..... پس نیں کیا ملاپ ہو سکتا ہی !!  
..... مجھ یہاں کی بہت سی چیزیں بے ملاپ ہیں ..... ہر چیز کے ٹکڑے ٹکڑے ہو  
چکے ہیں ..... ایک ٹکڑا یہاں ٹرپ رہا ہے ۔ تو دوسرا وہاں سربک رہا ہے .....

فرمانہ اپنی زندگی اختر کے ساتھ بسر کرنا چاہتی ہے ۔ مجھ اسے زبردستی ظفر سے بیاہ دیا  
لیا ہے ۔ اور وہ کچھ نہ کر سکی ۔ مجھ اندر ہی اندر جلتی رہتی ہے ۔

نعمان ۔ روشی کے ساتھ بسر کرنے والی زندگی کے آرزو انگیز خواب دیکھ رہا  
ہے ۔ مگر روشی کا ہاتھ میلان کے ہاتھ میں سوچنے کے لئے سارا خاندان سر سے لیکر پاؤں  
تک زخروں لگا رہا ہے .....

آہ ! میں جاوید کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتی تھی ..... مجھ اس بڑے کے پاس  
بڑی زندگی کو عجیب نظروں سے تک رہی ہوں ۔ سارے گھر میں ایکی ہوں ..... صرف  
لوڑھی میں بوڑھا بابا خان سو رہا ہے ۔ چاروں طرف دیواریں ہیں ۔ بڑی بڑی پتھر کی دیواریں  
اور میسر اسٹنس یہاں گھٹتا ہے ۔ مجھ میں کس سے کہوں !! کبھی زندگی کی کوئی بات  
ادا جاتی ہے ۔ اور کبھی کوئی بات ۔ مختلف تصویروں نظر کے سامنے آتی ہیں ۔ اور گزر جاتی  
ہیں ..... چاروں طرف خاموشی ہے ..... اور اس پُر ہول خاموشی میں میل

دل ز در زور سے دھڑک رہا ہے۔ جیسے ابھی ابھی کوئی جن بھوت اندر داخل ہوا  
اور مجھے کھانچا..... دروازے کے شیشوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی  
ڈر رہا ہے۔ بنگا اس سرد اور تاریک بستر پر ابھی زندگی کی بہت سی باتیں بسر کرنی ہیں  
..... باہر باد لگ رہا ہے ہیں اور بجلی چمک رہی ہے..... سردیوں کی بارش!  
..... میں اپنے دل کی دیرانیوں کو کیسے بہلاؤں!! .....

دن کس قدر روشن تھا۔ اور دھوپ نیلی تھی۔ گہری نیلی دھوپ۔ میں بھاگی بھاگی سلیم  
کے پاس گئی۔ تاکہ اسے بتاؤں کہ وہ جو ہم نے اپنی کیرئیر میں بیچ ڈالے تھے۔ وہاں  
پھول آنے شروع ہو گئے ہیں۔ مگر سلیم اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ میں اسے ڈھونڈنے  
کے لئے نیچے ہال کمرہ میں گئی۔ وہاں بھی نہیں تھا۔ پتہ نہیں سلیم کہاں چلا گیا ہے.....  
تھا دوپہر کو کھانے پر تو ضرور وہی ہو گا..... اور میں اپنے کمرہ میں آگئی۔ کچھ دیر کے  
بعد سلیم بھی آگیا..... جاؤ..... اب مجھ سے کوئی بات نہ کرنا۔ میں تم سے خفا ہو چکی  
ہوں۔ اور میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا..... سلیم نے آگے بڑھتے  
ہوتے کہا۔

واہ! بس اتنی جلدی روٹھ گئیں!! نہ روٹھنے کی وجہ بتائی۔ نہ کوئی بات کی...  
اور روٹھ گئیں۔ تم تو جیل بالکل بچہ ہو۔ بالکل بچہ..... اچھا تو آؤ ذرا میں اپنے  
بے کو بیار تو کروں۔

ہائے اللہ!..... مجھے چھوڑ دو۔ نہیں تو میں چیخ مار کر رو پڑو گی اور ابھی جا کر  
نا جان کو بتاؤں گی کہ سلیم مجھے کس قدر تنگ کر رہا ہے..... ہائے اللہ چھوڑ دو  
..... دیکھو تو تم نے کس بڑی طرح میرے ہونٹ کاٹ کھائے ہیں.....  
نکل آیا ہے..... جاؤ میں تم سے نہیں بولوں گی۔ اور اب نہ بات بتاؤں

دفتر چلے جاتے ..... اور یہ لاڈلے میاں اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے ہر طرف سے بے فکر تھے ..... اسکول سے چوٹی آتی ..... یہ پیسے سے ہی میرے کمرو میں موجود ہوتا اور مجھے پچھلے چھ ماہ شروع کر دیتا۔ سلیم مجھ سے آٹھ ہال بڑا تھا، اور ایف اے میں ٹپل ہو گیا تھا۔ اور پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور اب اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر انگریزی دوائیوں کی ایک دوکان کھولی تھی اور کبھی وہاں جاتا تھا اور کبھی نہیں جاتا تھا۔ میں ان دنوں نویں کلاس میں پڑھتی تھی اور صاب میں کمزور تھی۔ سلیم کو صاب بہت آتا تھا اور میرے پڑھایا کرتا تھا۔ مگر اس نے شرط رکھی ..... تھی کہ ایک ہمال سمجھاتا تھا تو میں دفعہ گن کر میرے ہونٹ چومتا تھا اور جب میں شرم سے دوہری ہو جاتی تھی ..... اور سر نہیں اٹھاتی تھی۔ بس بات یہاں تک ہی پہنچتی اور میں بھاگ کھڑی ہوتی ..... وہ مجھ سے کہتا کہ شادی تو تمہاری میرے ساتھ ہی ہونی ہے نا! اُسے میرے پاس پھرتے مزہ چھکاؤں گا۔ اور میں ڈرجاتی ہم جاتی ..... مجھے میری اس کی منگنی تو بہت بڑی ہو چکی تھی اُمی کی وفات کے بعد ابا نے مجھے چھپے پر دہی کر دیا تھا کہ بعد میں بھی یہ تمہاری ہی بیٹی ہوگی تو ابھی اسے عزت و آبرو سے تم کو ہی پان ہوگا ..... ابا کی ملازمت کبھی ایک شہر میں اور کبھی دوسرے شہر میں ہوتی رہتی تھی، اس لئے وہ مجھ سے ملنے جاسکتے تھے۔ ابا کا خیال تھا۔ جب میں میرے پاس کر لوں گی اور سلیم بھی کچھ کمانے والا ہو جائے گا، تو شادی کر دی جائے گی ..... مگر سلیم کی زبان کو خون نہ جانے کہاں سے لگ گیا تھا۔ حریف نظروں سے مجھے بچتا، غم نہ ہونے کی طرح میرے چاروں طرف چکر کاٹتا رہتا جس سے مجھے بڑا خوف آتا مجھے اس سے نہ محبت تھی نہ نفرت تھی میں سمجھتی تھی کہ میری اس کی منگنی ہو چکی ہے اب شادی ضرور ہوگی۔ بس اسی طرح دن گزر رہے تھے۔

میں ابھی سات لوں گا ..... خدا کے لئے مجھے گود سے اتار دوا بھی کوئی آجائے گا تو کہے گا! تم کو تو کوئی شرم نہیں آتی۔ دیکھتے نہیں۔ میں اب کتنی بڑی ہو گئی ہوں ..... تم کو اب یوں نہ کرنا چاہیے۔

یار نے میں تو اب مزہ آتا ہے۔ پگلی ٹکی!

لیکن مجھے بڑا لگتا ہے سلیم .....

کیوں!! ..... ایمان سے کہو۔ کیا میرے ہاتھ لگانے سے تمہیں مزہ

آتا .....

کیا مزہ! مجھ سے ایسی بے شرمیوں والی باتیں نہ کر دو۔

دیکھو میرا دل دھڑکنے لگ گیا ہے۔

کہاں بھلا دکھاؤ تو .....

لو! ہاتھ رکھ کر دیکھو لو .....

اولی اللہ! میں مر گئی۔ یہ تم نے اتنی زور سے چٹکی کیوں لے ڈالی! سلیم۔ میرا سانس رُک گیا۔ مجھے چھوڑ دو۔ دیکھو مجھ سے اب کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ تم نے یہ نہیں کہتے سے جھوٹا ہے۔ کہ میرا جسم لرزنے لگ گیا ہے۔ اور میں دھڑک دھڑک رہی ہوں۔ کھڑی ہو گئی۔ اور سیدھی ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی ..... دوہری بہت روشن آسمان پر نیلے سفید کتوں کی ایک قطار اڑتی جا رہی تھی۔ سلیم کے ہاتھ لگانے سے جیسے نئے میں چوڑے قاصد کی طرح اڑنے لگا تھا۔

سلیم میرے بہت قریب آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور میرے پرکھنے

تھی۔ اور وہ لول بڑھتا چلا آ رہا تھا ..... جیسے ابھی دلوں سے گ ..... وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی ..... اور اپنے کمرہ میں آن کر اندر سے در

کر لیا۔ اور بے سندھ ہو کر چار پانی پر گر پڑی .....

بس سلیم کی روزانہ یونہی مجھ سے چھڑ چھا رہی رہتی چچی اندر بیٹھی رہتی۔

ایک رات کا ذکر ہے۔ اس دن بہت تیز بارش ہو رہی تھی آسمان بادلوں سے اٹا پڑا تھا..... چچی جان کی بھانجی کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ شام ہی سے وہاں چلی گئی تھیں۔ میرا دوسرا امتحان سر پر کر رہا تھا..... اس لئے میں نہ گئی..... اور میرے پاس ہماری پڑائی خادمہ زینب رہی۔ چچا جان نے بھی کہہ دیا تھا کہ میں رات کو گھر پر نہ آ سکوں گا تم سارے دروازے اچھی طرح بند کر لینا..... سلیم صبح ہی کاروائی پڑی گی ہوا تھا۔ میں اور خادمہ زینب ہم سو گئیں زینب دوسری مر لیتے تھی اور میں نے اُسے اپنے ساتھ والے کمرہ میں سلایا تھا۔ کیونکہ مجھے رات کو گیارہ بجے تک پڑھنا بھی تھا۔

اچانک گرتی بارش میں دروازہ پر دستک دینے کی آواز آئی۔ میں نے سوچا، شاید چچا جان ہیں۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو سلیم تھا..... میں نے کہا: آپ ادھی رات کو یہ واپس آ گئے۔

کہنے لگا..... ہاں..... بہت سہی لگ رہی ہے، تم تو اندر گرم ہو کر بیٹھی ہو۔ کیا کر رہی تھیں..... میں نے کہا پڑھ رہی ہوں.....

یہ کہہ کر میں اپنے کمرہ میں آ گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے واپس بیٹھنا چاہتی تھی کہ سلیم کتب لینے کے بہانے آ گیا اور اب واپس جانے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ اچانک اٹھ کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور کہنے لگا..... آج ہم دونوں اکٹھے

سوئیں گے۔ میں تڑپ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ مگر اس نے اپنے فولادی ہاتھوں سے مجھے پکڑ کر بستر پر گرا دیا اور ٹیل لیمپ بچھا کر میرے منہ پر کھار کھنے لگا۔ میں نے سلیم کی منتیں کیں۔ خدا اور رسول کا واسطہ دیا..... کہ مجھے چھوڑ دو..... جب میری تم سے شادی ہو جاتی ہے تو تم مجھے ابھی کیوں تنگ کرتے ہو مگر اس نے ایک نہ سنی..... بلکہ یہ کہہ کر اگر تم شور مچاؤ گی، تو اپنی خاک اڑواؤ گی..... یہاں سولے بہا لیں گے اور کوئی ہے نہیں اور تمہاری آواز ویاں تک نہیں جاسکتی..... میں نے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ مگر اس نے ایک نہ سنی اپنی لمبی سی زبان سے میرے آنسو چاٹنا جاتا تھا۔

اور صبح کو اس نے مجھے سروں کی طرح بستر پر لٹا کر محاف اڑھاد دیا..... اور کہا کہ اگر تم نے کسی کو بتایا تو میں تمہیں بدلہ کے طور پر گولی مار دوں گا۔ چھ روز تک میں بستر سے نہ اٹھی۔ مجھے بخار ہو گیا تھا۔ اور ایک قدم تک نہ چلا جاتا تھا.....

چچی کو کچھ علم نہ تھا لیکن میں نے چچی سے یہ کہہ دیا تھا چچی جان مجھے بڑے بڑے خواب آتے ہیں۔ مجھے آپ اپنے پاس لٹایا کریں۔ مجھے اپنے سے الگ نہ کریں۔

اس واقعہ نے میری زندگی کو ایک دم بدل دیا..... مجھے نہ صرف سلیم سے نفرت ہو گئی بلکہ دینا کے ہر مرد سے نفرت ہو گئی..... اور میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میرے پاس کس نے کے بعد اسکول میں اتنی بن جاؤں گی..... اور یا تو آجا جان اے پاس چلی جاؤں گی..... یا پھر سڑک میں اٹھ آؤں گی اور آبا جان اور چچی جان کو صاف صاف لکھ دوں گی..... زہر کھالوں گی مگر سلیم سے شادی نہ کروں گی۔

میٹرک کا امتحان دیا..... نتیجہ نکلا..... اور میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گئی۔ سارے گھر والے بہت خوش ہوئے۔ اب میری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اور سلیم آتے جاتے گھورتا اور موقع ملے پر کہتا شادی ہو لینے دو۔ پھر دیکھو میں

تمہارا کیا حال نہیں کرتا۔ تم نے مجھے بہت بتا کر رکھا ہے۔ اور یہ کہہ کر وہ کچھ دکھاتا اور میں ہنسی مار کر بھاگ آتی، جیسے میں نے کسی پھنکار تے ہوئے سانپ کو دیکھ لیا ہو۔ اور میری چاہتا سیال سے بھاگ جاؤں سورنہ یہ سانپ مجھے ڈس لے گا، اور اس کا زہر میرے ریشے ریشے میں پھیل جائیگا۔ اور اس سانپ کا کاٹا ہوا ضرور مر جائے گا۔ کم از کم میں تو مر جاؤں گی۔

میرا دل غلین رہنے لگا۔ بہت نہ پڑتی تھی کہ شادی سے انکار کروں۔ مگر سلیم سے شادی کرنا بھی ایک عذاب سے کم نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ سو جتنی جتنی اگر شادی سے انکاری تو خاندان میں کھیلی بچ جائے گی۔ بابا جان اور چچی جان انکار کی وجہ پوچھیں گی۔ تو میں وجہ نہ بتا سکوں گی اور اگر میں نے وجہ بتا دی۔۔۔۔۔ تو وہ طوفان اٹھے گا کہ دونوں خاندانوں کی آبرو خاک میں مل جائے گی اور میرا جو درمیان میں حال ہوگا۔۔۔۔۔ وہ کس سے چھپا ہوا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن جب مجھے سلیم اور اس رات کا خیال آتا ہے جب مجھے ایک زہریلے سانپ نے کاٹ کھایا؟ اور مجھے یہ ہوش کر دیا تھا۔ تو جان ہی نکل جاتی۔

میرا دل غم میں ڈوبا رہنے لگا۔ میں اداں ہو جاتی اور چھپ چھپ کر رڈ آخر کار ایک رات میں نے بابا جان کو صاف صاف لکھ دیا، کہ اگر آپ نے میری سلیم سے شادی کی تو میں زہر کھانوں گی اور یہ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ خط لکھ کر میں روز جواب کا انتظار کرنے لگی۔ راتوں کی نیند اڑ گئی۔ چار روز کے بعد خط کے جواب کی بجائے بابا جان خود موجود ہوئے۔۔۔۔۔ مگر اب وہ کیا نہ تھے، بلکہ ان کے ساتھ میری سوتیلی والدہ بھی تھیں۔۔۔۔۔

میری سوتیلی والدہ نے مجھے بڑا پیار کیا اور بابا جان سے کہا کہ اب اس کی ماں آگئی ہے۔ اب اسے ہم ساتھ لیکر جائیں گے۔

بابا جان نے اپنی دوسری شادی کر لی تھی۔ اور وہ اپنے سے میرا فرض اتار دینا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ انھوں نے مجھے علیحدہ لیجا کر ویر پوچھی۔ میں نے

رو رو کر کہا۔ بابا جان آپ مجھے زہر دے دیں۔ مگر میں اس سے شادی نہ کروں گی لیکن میں کوئی وجہ بابا جان کو نہ بتا سکی۔ میں انھیں کیا بتاتی!!

نہیں روز تک بابا جان رہے اور مجھے سمجھاتے رہے۔ مگر میں یہی کہتی رہی۔۔۔۔۔ چچی جان کو پتہ چلا۔۔۔۔۔ چچا جان کو علم ہوا سلیم نے بھی ساری بات سنی۔

بس کچھ نہ پوچھیں کہ پھر کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ ایک عجیب ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔ جس میں مجھ پر ہزاروں الزام تراشے گئے کہ میں کسی اور لڑکے کو پسند کر چکی ہوں۔۔۔۔۔ اور اس سے خراب ہو چکی ہوں۔۔۔۔۔

سلیم نے خود بابا جان سے کہا۔۔۔۔۔ کہ یہ جلیہ میرے دوست مسعود سے ناجائز تعلقات قائم کر چکی ہے اور میں خود اس سے شادی سے انکار کرتا ہوں۔۔۔۔۔ اس واقعہ نے بہت فساد پھیلایا۔۔۔۔۔ میں غم کھا کھا کر کاٹا ہو گئی۔ بہر حال۔۔۔۔۔ میری مزا اور میری حالت نے بابا جان کو کچھ متاثر کر دیا۔ میں نے ان کو سلیم کی ساری بات سنا دی، اور بابا جان مجھے ساتھ گھر لے آئے۔

میری سوتیلی والدہ نے شروع شروع میں تو مجھے کافی پیار سے رکھا مگر پھر جب دیکھا کہ وہ خود بھی ماں بننے والی ہے، تو مجھے لوکر انیوں کی طرح رکھنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ مجھ پر حکم چلاتی رعب ڈالتی۔۔۔۔۔ سارا کام لیتی۔۔۔۔۔ اور کبھی کبھی بابا جان سے۔۔۔۔۔ شکایت بھی کر دیتی۔

میں نے سوتیلی والدہ کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ تاکہ کہیں میری شادی نہ کر دے، سلیم سے نہیں بلکہ کسی اور سے بھی نہیں!

شادی کے خیال سے میرے جسم کے رو بگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اور شادی مجھے دنیا کی خوفناک چیز نظر آنے لگتی اور میں رو پڑتی۔۔۔۔۔

دو ماہ کے بعد ہمارے ہاں ایک چھوٹی سی بہن پیدا ہوئی میں اسے بہت پیار کرتی۔۔۔۔۔ بہت چاہتی۔ پھر میں نے اپنی والدہ سے کہہ کہہ کر ان کے پاؤں دبا دیا کہ کالج میں داخل ہونے کی اجازت بابا جان سے لے لی۔۔۔۔۔

اب میں بہت خوش تھی۔ فرسٹ ایئر میں داخل ہو گئی تھی۔ وہاں میری اچھی اچھی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ کبھی کبھی چچی جان اور سلیم کی خبر ملتی کہ وہ ہمارے خلاف کشتہ ماروں سے بہت کچھ کہتے ہیں اور ہمیں بدنام کرتے ہیں..... اور یہ بھی ناکہ سلیم کہتا ہے۔

میں جمیلہ کی شادی کہیں اور کبھی نہ ہونے دوں گا اس کی شادی ہوگی تو میرے سے درجہ کہیں نہ ہوگی۔ اور میں سن کر خاموش ہو جاتی..... سلیم سے شادی تو میری جوتی کرتی تھی اور کسی اور سے کیا سوال؟..... مجھے تو شادی کے نام ہی سے ڈر لگتا تھا.....

اب میرے دن کافی سکون سے گزرنے لگے۔ مجھے پڑھائی سے بہت دل.. چہی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ میں SHALLEY BYRON KEATS اور MILTON کی نظمیں بہت شوق سے پڑھتی تھی۔ مجھے بہت پسند تھا کیونکہ وہ نیچر کا پرستار تھا، اور میں خود نیچر پرست لڑکی بنتی جا رہی تھی۔ میرا دل شہروں سے نفرت محسوس کرتا تھا اور میں اپنی ساری زندگی پہاڑوں کی خواہش پر بند لوں پر بسر کرنا چاہتی تھی کسی چشمے کے کنارے اپنی ساری زندگی بیتا دینا چاہتی تھی۔

مجھے قدرتی نظاروں سے پیار ہو گیا..... اور میں بہت تنہائی اور کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے اچانک میرا جی اداک ہو جاتا..... اور میں بہت تنہائی محسوس کرنے لگتی۔ میرا جی چاہتا کہ میں سمندر کے کنارے ٹھنڈی ریت پر جاندنی لالوں میں خاموش لیٹ جاؤں..... اور کوئی مجھے ستار پر دلفریب نغمے سنائے جنہیں سن کر میری روح جھوم اٹھے۔ میری دنیا جھگکا اٹھے۔

مگر اس پتھروں کی دنیا میں بھلا ایسے خواب کہاں پورے ہو سکتے تھے یہاں تو کالج سے گھر جاتے ہی سارا کام کرنا پڑتا تھا۔ کھانا پکانا پڑتا تھا برتن صاف کرنے پڑتے تھے۔ والدہ کی خدمت کرنی ہوتی تھی..... چھوٹی بہن کے کپڑے تیار کرنے ہوتے تھے..... اور جب رات گئے فارغ ہوتی..... تو اپنے کمرے میں ان کر خاموش بیٹھ جاتی..... اور کھڑکی سے باہر منہ نکال کر آسمان پر ستاروں کو دیکھتی..... اور دل عجیب طرح اداک ہو جاتا پھر بڑی مشکل سے اپنا جی کت بول

میں لگاتی اور یونہی رات کے دو تین بج جاتے ..... اور پھر نہ جانے کب میں  
سو جاتی ۽ اکثر عجیب عجیب سے خواب آتے اور کبھی کوئی بھی خواب نہ دیکھتی .....  
اور صبح کو اٹھنے پر سارا جسم درد کر رہا ہوتا جیسے ساری رات کوئی مارنا رہا ہے ...  
..... سر پتھر کی طرح بھاری ہوتا اور بستر چھوڑنے کی ذرا سی بھی سکت نہ ہوتی مگر  
میں جلدی سے اٹھ بیٹھتی اور مکان کی چھت پر جا کر تھوڑی سی ورزش کرتی ۔ سر دھو لوں  
میں زور زور سے سانس لیتی گلوں کے اوپر پڑی ہوئی شبنم کو منہ پر لگاتی .....  
اور گلاب کی پتیوں پر ہونٹ رکھا کر آنکھیں بند کر لیتی ..... اور بھول جاتی کہ میں کہاں ہوں  
..... کہ اچانک اٹھی کی آواز آتی ۔ اور میں نیچے بھاگ جاتی ..... اور  
کام سے فارغ ہو کر تیار ہو کر کالچ چل دیتی ۔

کلاس میں میری کوئی خاص سہیلی نہیں تھی ..... سبھی لڑکیوں سے ایک جیسی بات  
کرتی تھی ..... یہ لڑکیوں مجھے پسند تو تھیں لیکن دوستی کے لحاظ سے پسند نہیں تھیں  
کیونکہ جب بھی یہ اکٹھی ہوتیں کپڑوں کی باتیں کرتیں ..... زیوروں کی باتیں ، ...  
پاؤں کی باتیں ، زکس اور کاسنی کو شل کی باتیں ..... فلموں پر تنقید کرتیں ،  
علمی گانے گاتیں اور منہ بنا کر باتیں کرتیں ، بھجلا میں ان کی باتوں میں شامل کیسے ہو سکتی  
تھی !! ..... یہ نہیں کہ مجھے ان کی باتیں ..... ناگوار گزرتی تھیں اور میں ایسی  
گفتگو پسند نہ کرتی تھی ویسے ہی نہیں ، بلکہ صرف اس لئے میں ان کی باتوں میں  
شامل نہ ہوتی تھی کہ مجھے ان جیسی باتیں نہ آتی تھیں میرے پاس محض سادے  
کپڑے تھے ..... کیونکہ امی جان کا خیال تھا ..... کہ شادی سے پہلے لڑکیوں  
کو قیمتی کپڑے نہ پہننے چاہئیں ۔ نہ میں کبھی سینا گئی تھی کہ وہاں کی باتیں کرتی ۔ میں نے  
کسی زکس یا کاسنی کو شل کو نہ دیکھا تھا ..... پھر بھجلا میں کیونکہ ان کی باتوں میں شامل  
ہوتی !! ..... !

میں خاموش بیٹھی اُداس چہرہ اُدراٹھا لئے ان کی باتیں سنتی رہتی ..... اور جب  
میری سہیلیاں کہیں کہ تم بھی کوئی بات کرو ، تو میں عجیب سی ہنسی ہنس کر کہتی کہ تم لوگ جواتی  
..... ساری باتیں کر رہی ہو ..... تو کم باتیں ہیں !! اور پھر بھجلا میں ان سے  
باتیں بھی کیا کر سکتی تھی ..... میری باتیں کت بول کی باتیں تھیں ۔ گلاب کے پھولوں کی



تھی۔ مگر میں پھر بھی زندگی بسر کر رہی تھی..... نہ جانے کس امید پر!.....  
میں کسی آنے والے خوفگوار وقت کے انتظار میں تھی..... میں تنہائی میں...  
.... راتوں کی پراسرار خاموشی میں اکثر سہانے خواب دیکھتی۔  
ایک بہت بڑا خوبصورت محل ہے، اور میں وہاں کی شہزادی ہوں اور بڑی  
شان و شوکت سے ادھر سے ادھر آزادی سے پھر رہی ہوں۔

ہر ایک میرے اگے سر جھکا کر کھڑا ہے اور میں آزاد و مختار ہوں۔ لیکن یہ شہزادیوں..  
والے خواب میں بہت کم دیکھا کرتی تھی۔ اکثر یہ خواب دیکھتی..... جیسے ایک بہت..  
خوبصورت بانٹ ہے، جس میں نہریں ہیں، چشے ہیں اور پھولوں کے قالین بچھے ہوئے  
ہیں..... اور چاندنی راتیں ہیں!! اور میں خاموش ایک درخت کے نیچے بے  
تابی سے بیٹھی اپنے شہزادے کا انتظار کر رہی ہوں..... مگر چاہتا پنا بہت سافر  
طے رکھا ہے۔ اور میرا شہزادہ ابھی تک نہیں آیا، اور میں اُداس ہوں اور بہت دیران  
ہوں۔ مگر شہزادہ نہیں آیا اور میری نیند ٹوٹ جاتی ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ میں تو اپنے  
گھر میں ہوں، اور اُسے گھر میں ہوں جہاں شہزادے کا تصور تک برداشت نہیں کیا جا  
سکتا..... جو چہ جائیکہ میں کسی شہزادے کا انتظار کر دوں..... اور وہ مجھ سے  
مٹنے کے لئے آئے!

باتیں تھیں۔ اُداسی کی باتیں تھیں۔ خاموشی کی باتیں تھیں۔ میں ان کو کیا بتا دیتی.....۔۔۔۔۔  
میری زندگی ان لوگوں سے کس قدر مختلف ہے۔ انھوں نے کبھی گھر جا کر کھانا نہیں لپکایا۔  
تھا..... برتن صاف نہیں کئے تھے، فرش نہیں دھوئے تھے اور رات کو دودو  
بچے تک بیٹھ کر کبھی زندگی کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ زندگی ان کے لئے سہانا خواب تھی.....  
جسے میں دن کی روشنی میں بھی صاف نہ دیکھ سکتی تھی.....

یہ سنیں کہ میں ان کے ساتھ کبھی ہنسی ہی نہ تھیں..... نہیں اکثر ہنستی تھی، بلکہ  
انہی کی طرح بن کر رہنا چاہتی تھی۔ میرا بھی سینا دیکھنے کو جی چاہتا تھا..... میرا بھی نہیں  
کپڑے پہننے کو جی چاہتا تھا..... بھلا خوبصورت اور رنگین زندگی بسر کرنے کو کس  
کا جی نہ چاہتا ہوگا..... مگر آدمی کا جو جی چاہے وہ بھلا کب ہوا کرتا ہے!  
اور ایسے موقعوں پر جب میں یہ سوچتی تھی..... کہ میں ان کی طرح زندگی بسر  
نہیں کر سکتی تو پھر میں اُداس سے بھی بڑھ کر اُداس ہو جاتی تھی..... اور یہی  
جی چاہتا تھا کہ بس روتی رہوں..... خاموش..... بے معلوم آواز میں روتی  
رہوں.....

والدہ کا کام یہ تھا کہ رات رات مجھ سے کام لیتی رہتی تھیں چاہے مجھے بخار ہو چاہے  
میں کتنی ہی اُداس کیوں نہ ہوں۔ مگر ان کے کام سے میں انکار نہ کر سکتی تھی.....  
کیونکہ اگر میں ذرا سی بھی ان کی نافرمانی کرتی..... تو مجھے فوراً کانٹے سے لٹکا دھوئے  
پڑتے..... اباجان سے میری چنچیاں لگتی..... اور میری فوراً کہیں نہ کہیں  
شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتیں اور چچی جان جو ہمارے خلاف بائیں کرتی رہتی تھیں  
ان کے بارے میں اباجان کو بتایا جاتا..... مجھے طعنے ملتے اور زندگی نہ جانے  
کہاں سے کہاں نکل جاتی.....

زندگی بسر کرنے کے لئے مجھے اپنی ہر خواہش کو دبا کر اطاعت اور فرمانبرداری  
کی بنی پڑ رہی تھی۔  
میں آزادی کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی اور مجھے مجبوری کی زندگی بسر کرنی پڑ رہی

ان خوابوں کے سہارے آسانی سے گزرتی بھی شروع ہو جائے..... لیکن...  
 اچانک پتہ بھی نہیں چلتا..... اور کبھی امی کا موڈ بگڑ جاتا ہے اور کبھی آباخفا ہو جاتے  
 ہیں۔ بس امی اور آباخفا ہی ہوتے رہتے ہیں۔ پیار تو کبھی نہیں کرتے!! جہاں پیار  
 نہ ہو، وہاں زندگی بسر نہیں ہوتی..... وہاں زندگی کا رنگ سرخ نہیں، زرد ہوتا  
 ہے!..... تو پھر کس طرح زندہ رہا جائے!..... مر جانا چاہیے مگر مر بھی نہیں  
 سکتے..... مانے..... موت سے ڈر بھی کس قدر لگتا ہے۔ زندگی میں تو  
 پھر روشن دن آ جاتے ہیں..... مگر موت تو ایک لمبی اور کالی رات ہے.....  
 جس کے آسمان پر کبھی سورج نہیں نکلتا اور کبھی صبح نہیں ہوتی!..... مجھے موت  
 سے بہت ڈر لگتا ہے..... میں زندہ رہنا چاہتی ہوں..... اور ضرور زندہ  
 رہوں گی..... نہیں بہر حال میں زندہ رہوں گی..... اور ایک بہتر زندگی  
 پاکر زندہ رہوں گی۔

ابھی میں اپنے خوابوں کے سارے دریچے بند کر دوں گی، اور اس وقت تک  
 نہیں کھولوں گی۔ جب تک کہ امتحان میں پاس نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ پاس ہونے کے  
 بعد ہی میں بہتر زندگی پاس کروں گی.....

امتحان سر پر آ رہا تھا..... مگر میری تیاری پوری طرح نہ ہو سکی تھی، اور  
 آبا جان نے کہہ دیا تھا کہ اگر تم فیل ہو گئیں، تو پڑھائی یہیں ختم ہو جائے گی۔ اور تم آگے  
 تعلیم حاصل نہ کر سکو گے اور پھر صاف ظاہر تھا کہ اگر میں پڑھ نہ سکو تو پھر شادی ہی ہوگی نہ  
 جانے کس نامراد نچے گندے آدمی سے شادی ہوگی..... جو بیوی کی روح سے  
 نہیں بلکہ اس کے جسم سے شادی کرے گا۔ اور ایک ایک دن میں دس دس  
 دفعہ شادی کرے گا۔ اور تین چار سالوں کے بعد مجھے مار ڈالے گا۔ مانے! میں  
 ایسا خاوند بھلا کیسے برداشت کر سکتی تھی!

اُف خدا!.....

ان ماں باپ کو لڑکی کی شادی کے سوا اور کوئی بات نہیں آتی..... کیا۔  
 یہ والدین اپنی لڑکی ہمیشہ اپنے پاس شادی کے بغیر نہیں رکھ سکتے!!..... بس  
 جہاں لڑکی موجود ہے، وہاں شادی کا ذکر موجود ہے۔

آبا جان ٹیوشن بھی نہیں رکھ دیتے، گھر کے کاموں سے بھی فرصت نہیں ملتی۔  
 پاس ہونے کی بھی دھمکی ہے۔ ماحول بھی خوشگوار نہیں ہے۔ دل بھی ادا کس ہے  
 کوئی تفریح اور خوشی نہیں..... تو پھر زندہ کس لئے رہا جائے!..... نہیں..  
 رہنا چاہئے۔ روشن مستقبل کی بھی کوئی اُمید نہیں! کئی سال بسر کر کے بھی کتنے ہی ٹھہرنے  
 خواب کیوں نہ دیکھے جائیں۔ اُمید سے بھرے ہوئے مستقبل کے خواب! اور زندگی

اے میرے خیالو! مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ..... میرا ساتھ چھوڑ دو تاکہ  
میں اُداس نہ رہوں!.....

آجکل میں نے اپنی ڈائری لکھی شروع کر دی ہے۔ اُداس سے پہلے جو میرا  
دل اُداس ہو جاتا تھا۔ اب اتنا اُداس نہیں رہتا سارا وقت پڑھتے پڑھتے گزر جاتا  
ہے..... امتحان کی تیاری کیلئے کالج سے چھٹیاں ہو گئی ہیں..... اور صبح  
کو گھر کا سارا کام کر لیتی ہوں..... اور پھر سارا دن پڑھتی رہتی ہوں..... رات  
آبا جان نے بتایا تھا کہ ان کا تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہو رہا ہے..... اور  
میں نے پوچھا تھا۔ آبا جان ایک دہاں کالج ہے!!..... تو انھوں نے بتایا کہ  
نہیں ہے۔ وہ تو پہاڑی علاقہ ہے جہاں پہاڑی علاقہ کے لفظ نے مجھے سرور کر دیا،  
دہاں کالج کے نہ ہونے کا سن کر دل ویران ہو گیا..... انہاں کی ہر خواہش کیلئے  
نہیں پوری ہو جاتی!.....

اگر ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری دم توڑ دیتی ہے یہ خواہشیں جو  
پوری نہیں ہوتیں۔ ان کو نہ پورا کرنے والا کون سا ہاتھ ہے؟ کس کا ہاتھ ہے؟  
..... اگر مجھے پتہ چل جائے تو میں اس ہاتھ کو جا کر چھوڑ دوں اور پوچھا  
..... کہ تیری ذرا سی جنبش سے ہماری تقدیریں بدل جاتی ہیں.....  
پھر وہاں جا کر کیسے پڑھوں گی.....

یہ خیال میرے ذہن کو ویران اور اُداس کر رہا ہے...

دوسرے سے ڈر کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ ایسی زندگی بسر کی جائے  
..... جو دوسروں کو ناگوار نہ گزرے ..... دوسروں کو بری نہ لگے .....  
زمانے کو بری نہ لگے .....  
تو پھر ہم دوسروں کے لئے زندہ ہوئے نا؟! ..... اپنے لئے

تو زندہ نہ ہوئے .....  
اپنے لئے کب زندہ رہیں گے؟ ..... لیکن میں تو حیران ہوں کہ دوسروں  
کے لئے زندہ رہنے کے باوجود یہاں پر کوئی غمگین ہے، پریشان ہے، دیران۔  
ہے۔ دوسروں کے لئے زندہ رہنے کے باوجود دوسروں کو دھوکہ دیتا ہے.....  
دوسرے کو بچا دکھانے کی فکر میں رہتا ہے.....

کاش! ہر شخص محض اپنے لئے زندہ رہے! اور دوسروں کے معاملوں میں دخل اندازی  
نہ کرے..... اور دوسروں کے ساتھ کمینگی نہ پرہیز کرے..... تو کتنا اچھا ہو.....  
لیکن یہاں تو محض ڈرنا سکھایا جاتا ہے گھروں کے اندر والدین، دادا، دادی  
اور بڑے بہن بھائیوں سے ڈرو..... گھر کے دروازے کے باہر ہمسایوں سے ڈرو۔  
اس کے بعد رشتہ داروں سے ڈرو۔ اور کوئی ایسا کام نہ کرو..... جو ان کو ناگوار  
گزرے..... لیکن جو ہم کو ناگوار گزرتا ہے۔ اس کا تو دوسرے کوئی خیال نہیں کرتے!!  
آئی ہمارے ہیں..... اب میں اسے بند کر کے جاتی ہوں۔

امتحان ختم ہو گیا ہے، اور پرچے اچھے ہو گئے ہیں۔ اُمید ہے کہ پاس ہو  
جاؤ گی..... کل آخری پرچہ دے کر آئی ہوں۔ رات کس قدر گہری نیند سوئی!  
..... کوئی خواب نہیں آیا، کچھ پتہ نہیں چلا کہ کہاں رات بسر کی ہے؟ ..... پتہ  
دو ماہ سے پوری نیند حاصل نہیں کر سکی تھی..... روزانہ صبح کو اٹھ کر پڑھنے  
کا خیال آتا تھا مگر آج صبح اٹھی..... تو دونوں ہاتھ مقام کر بیٹھ گئی۔ لیوں  
خالی ہاتھ لگ رہی تھی، جیسے اب کرنے کو کچھ نہیں رہا۔ آج بیٹھ کر اپنے کمرہ کو دھا  
کر دی گئی..... سامان وغیرہ بانڈھوں گی۔ کیونکہ پتہ نہیں کب ابا جان کا تبادلہ ہو  
جائے، اور ہم چلے جائیں..... دل بڑا ادا اس ہے، سوچتی ہوں، میری زندگی  
بھی بھلا کیا ہے؟ آخر یہ میں کس کے لئے زندہ ہوں۔ کس کے لئے یہ سارا کچھ  
رہی ہوں..... یہ میری ساری جدوجہد..... یہ میری کوششیں.....  
یہ میرا سوچنا..... یہ میرا ادا اس ہو جانا..... یہ آخر کس کے لئے ہے  
یہ زندگی کیا ہے!..... اس کا مقصد کیا ہے..... پڑھنا پڑھتے رہنا  
..... یہ اس لئے..... کہ کہیں میری شادی نہ کر دیں..... مگر یہ کیا ہے.....  
..... میں تو ڈری ہوئی..... اور سہمی ہوئی زندگی گزار رہی ہوں۔ نقلی زندگی بسر کر  
رہی ہوں..... دوسروں کو خوش کرنے کے لئے بناوٹی مسک بھر رہی ہوں.....  
تقریباً ہم سب لوگ ایسی ہی بناوٹی زندگیاں بسر کر رہے ہیں..... ایک

جو مجھے سب کچھ بھلا دیتا ہے میری آنکھوں میں اپنے آپ اُٹھو جاتے ہیں.....  
 چاروں طرف ایک اجنبی خاموشی پھیل رہی تھی..... چاند اور بلند مہر رہا تھا  
 ..... چاند کی چاندنی اور اُس کی اداس و ملول فضا..... یہ مجھے ہمیشہ سے  
 پسند ہے..... مجھے اس کی مرمیں روشنی میں ہلکا ہلکا غم، گرب، سوگ  
 اور بے کلی گھل ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ جب چاند اپنی سوگواری نہیں پھینکتا ہے تو  
 مجھے ساری کائنات خواب بن کر فضا میں تیرتی محسوس ہوتی ہے..... فضا اور ماحول  
 سے متاثر ہو کر بعض بعض دفعہ عجیب عجیب سے خیالات و مانع میں اُتے ہیں انسان  
 بالکل اسی ماحول کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ ابھی کچھ دیر اور اس کا  
 ظلم نہ ٹوٹے!..... انسان ذاتی طور پر بہت مضطرب ہو..... تو وہ بہت محاس  
 ہو جاتا ہے۔

میرا دل اور بھی اُداس ہوتا گیا..... اور نہ جانے مجھے کیا سہارا میں نے  
 بھٹوٹ بھٹوٹ کر دنا شروع کر دیا..... مجھے ایک دم اپنی امی یاد آگئیں.....  
 اگرچہ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی تیسری کلاس میں پڑھتی تھی..... مگر پھر بھی مجھے  
 امی کی یاد نے بہت زلانا شروع کر دیا..... کاش! میری امی اس وقت زندہ  
 ہوتیں تو پھر شاید میرا دل اتنا اُداس اور غمگین نہ ہوتا اور اگر ہوتا بھی.....  
 تو میں بھلا کر جاتی..... اور ان کی پُر محبت آغوش میں کھو جاتی..... امی  
 کی گود میں جا کر لیٹ جاتی.....

نہ جانے کیوں مجھے اپنی زندگی خالی خالی محسوس ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے.....  
 کوئی اپنا ہو..... بہت پیارا اپنا ہو جس کے سینے کیساتھ لگ کر میں روتی رہوں  
 ..... یہ نہیں میرا دل کیوں اتنا دیران ہو جاتا ہے؟..... اور تو کسی لڑکی کو میں  
 نے یوں اُداس نہیں دیکھا..... لڑکیاں سنہتی ہیں..... خوش رہتی ہیں.....  
 مگر میں بہت اُداس رہتی ہوں!!

آبا جان کے تباہ کار کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل سکا..... سارا دن یونہی اُداسی  
 میں گزر جاتا ہے..... زرد و دھوپ چاروں طرف چھائی رہتی ہے۔  
 رات میرا دل بہت اُداس ہو گیا تھا۔ میں کام سے فراغت پا کر اُوپر چھت کے  
 ایک سنان کو نے میں جا بیٹھی۔ ان خاموش اور کھوئی کے ویران لمحات میں کسی اچھوتے  
 غم کا مجھے احساس ہوتا ہے۔ چاروں طرف دکھی دکھی چاندنی فرط غم سے سمٹی جا  
 رہی تھی۔ دُور شہنیوں کے پیچھے سے چاند ابھر رہا تھا..... گول اور مسخو کر دینے والا  
 چاند..... میں بے خود سی ہو کر اسے دیکھتی رہی۔..... ہلکی ہلکی چاندنی چاروں  
 طرف پھیلتی جا رہی تھی اور گہرا نیلا آسمان تھا کہیں کہیں پھیکے سے ستارے چمک رہے  
 تھے..... چاند کی تیز روشنی میں کوئی ستارہ اپنی پوری روشنی نہیں دے رہا  
 تھا! چاند کی محبت کے سامنے ان کی محبت ماند پڑ رہی تھی۔

اور میں نے سوچنا شروع کر دیا..... کس قدر اچھا ہو، جو میری زندگی یہیں  
 ٹھہر جائے..... یہیں رک جائے..... اور میں یونہی تنہا بیٹھی چاند کو دیکھتی رہوں  
 ..... کاش! زندگی ایک ایسا سہانا خواب بن جائے..... جسے میں تاروں کی  
 چھاؤں میں گھاس اور تپیلوں پر لیٹ کر دیکھوں..... دیکھتی رہوں..... ایسے  
 اجنبی اور انوکھے لمحے مجھے بڑے عزیز ہوتے ہیں..... یہ وہ وقت ہوتا ہے

دیر ہو گئی ہے۔ مجھ سے ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہرا جاتا... ہم کپڑا پھر آن کر لیں گے۔

رضیہ کہنے لگی۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہے! کپڑا خریدنے آئیں، اور کپڑا نہ لیں... آخر ایک خراب کی ہو گیا ہے تمہیں؟ اور پھر اس نے دوکاندار سے کہا... ذرا جلدی سے ہمیں پہلے یہ کپڑا دے دو...

میرا دل نہ جانے کیوں اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا پھر ہم نے کپڑا لیا... اور گھر کی طرف چل دیں... پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہ تھی... آخر ایک منہاں سی جگہ پر آن کر میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو دونوں آ رہے تھے... میں نے ہونٹ اور حلق خشک ہو گئے۔ رضیہ نے پہلے پیچھے دیکھا اور پھر میری طرف... اور کہنے لگی۔ بات کیا ہے؟...

میں نے کہا۔ نہ جانے کون بد معاش ہیں یہ!!... کتنی ہی دیر سے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔

رضیہ کہنے لگی۔ تم ٹھہرو۔ میں انہیں ابھی ٹھیک کرتی ہوں۔  
میں نے کہا۔ خدا کے لئے ان لوگوں کے منہ نہ سگو۔ چلو جلدی چلو ہم اپنے گھر چلے جائیں۔ اگر کوئی بات بڑھ گئی تو مجھے تو آبا جان زندہ ہی جلا دیں گے۔  
رضیہ کہنے لگی اسے تم خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہی ہو۔ ان حرام زادوں کی بھلا اتنی ہمت ہے کہ کچھ کہہ سکیں...

ایک دوبار رضیہ نے جو پلٹ کر دیکھا، تو سلیم ذرا آگے آگیا... اور کہنے لگا... جیلہ! کہو کیا حال ہے؟ تم نے تو ہمیں بالکل ہی بھلا ڈالا ہے۔ کم از کم مجھے بھلایا تھا... تو مسعود کو تو نہ بھلایا ہوتا...!

رضیہ نے بھٹی بھٹی نظروں سے میری طرف دیکھا... میں نے کہا۔ رضیہ! خدا کی قسم... میں ان بد معاشوں کو نہیں جانتی یوں لگتا ہے، جیسے یہ میرے چاکا لڑکا سلیم ہے، اور دوسرا نہ جانے کون ہے!!... تمہیں ان کا نہیں پتہ... گھر جا کر تمہیں بتا دوں

نہی بٹو کے فرا کوں کے لئے کچھ کپڑا خریدنا تھا... امی کی طبیعت خراب تھی... اتنے میں رضیہ میری سہیلی جو ہمارے ساتھ کے مکان میں رہتی ہے، وہ آ گئی... تو امی نے کہا تم اس کے ساتھ جا کر بے آؤ... اور میں کپڑا خریدنے کے لئے چل دی... میں اور رضیہ راستے میں باتیں کرتی جاتی تھیں... کچھ دکانوں پر کپڑا دیکھا مگر پسند نہ آیا۔ رضیہ کہنے لگی۔ اب آگے چل کر دیکھیں گے مجھے دیر ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ رضیہ! امی خفا ہوں گی۔ تم جلدی چلو۔ تمہیں پتہ ہی ہے۔ امی نے آتی دفعہ کیا کہا تھا کہ جلدی پلٹ آنا۔ کہیں سہیلیوں میں ادھر ادھر نہ چلی جانا... حالانکہ رضیہ تمہیں پتہ ہے۔ میں کبھی سہیلیوں کے ہاں نہیں گئی۔ نہ میری کوئی سہیلیاں ہیں...

مگر امی کو یوں ہی شک ہوتا رہتا ہے...  
آخر ایک دکان پر کپڑا پسند آ ہی گیا... دوکان پر پہنچ کر ہم دونوں نے نقاب الٹ دی تھی...

اچانک مجھے کسی مردانی آواز کا احساس ہوا... جو میرا نام لے رہا تھا... پہلے تو میں نے خیال نہ کیا... کہ یہ کون ہو سکتا ہے؟ مگر جب دو تین بار مجھے ہی لپکار گیا تو میں نے پلٹ کر دیکھا اور میری جان ہی نکل گئی... سلیم کھڑا تھا... اور اس کے ساتھ اس کا دوست مسعود بھی تھا...

میں نے جلدی سے گھر کر نقاب ڈالی لی۔ اور رضیہ سے کہا رضیہ! جلدی چلو بہت

گی۔

اور ان دونوں نے ہم کو یوں دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔۔۔ گلی میں ایک موٹر آگیا۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک مکان تھا۔ اس کی ڈیوڑھی بہت بڑی تھی۔۔۔ میں نے کہا۔ رضیہ! ٹھہر جاؤ۔۔۔ ہم یہاں چھپ جاتے ہیں۔ یہ آگے نکل جائیں گے تو پھر گھر جائیں۔ رضیہ کہنے لگی۔ تو کیا اب دیر نہ ہوگی؟۔۔۔ تم کیوں ان سے ڈرتی ہو ان کی کیا مجال جو تمہیں کچھ کہہ جائیں!۔۔۔ اگر یہ ذرا اور آگے آئے۔۔۔ تو ہم لوگوں کو۔۔۔ تبا دیں گے۔

میں نے کہا۔ خدا کے لئے رضیہ! تم ٹھہر جاؤ، تم میری سہیلی ہو، میری بات مان لو۔۔۔ تمہیں نہیں پتہ۔۔۔ یہ بہت بد معاش ہیں یہ تو جان بوجھ کر فائدہ کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ لیکن ان کا کچھ نہ جانتا تھا میں بدنام ہو جاؤں گی۔۔۔ آبا۔ مجھے مار ڈالیں گے۔۔۔ اور لوگ نہ جانے کیا کیا باتیں کریں گے۔۔۔ اگر مجھے امی اور آبا پر یقین ہوتا کہ وہ حالات کو صحیح روشنی میں دیکھیں گے تو میں بھی ان کو جو تیاں لگا کر پولیس کے حوالے کر دیتی۔ مگر تم نہیں جانتیں۔۔۔ ڈکیوں کے معاملے بڑے نازک ہوتے ہیں اور ان نازک معاملوں میں والدین ڈکیوں کی سچائی نہیں دیکھتے بلکہ سنی سانی باتوں پر ایمان لاتے ہیں۔۔۔ ایسے موقعوں پر کتنی جھوٹے بی پی دا ہو جاتے ہیں۔۔۔ جو یقین دلا دیتے ہیں!

میرا رنگ فاقی ہو رہا تھا۔۔۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔۔۔ جلتی اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔۔۔ ہم مکان کی ڈیوڑھی میں چھپ گئے۔۔۔ اور دس پندرہ منٹ کے بعد جب ہم نے باہر دیکھا، تو وہ دونوں نہیں تھے۔۔۔ میری جان میں جان آگئی۔ میں نے کہا۔ رضیہ! وہ ضرور آگے کی طرف گئے ہیں۔ ہم پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور واپس بازار جا کر بازار کے راستے گھر جاتے ہیں۔

دیر بہت ہو رہی تھی۔۔۔ مگر رضیہ نے میری بات مان لی اب جو سہی ہم نے مکان کی گلی میں قدم رکھا۔ تو یہ دیکھ کر میں لرز اٹھی کہ وہ دونوں کھڑے ہنس رہے تھے۔۔۔

سليم کہنے لگا۔ اب بچ کر کہاں جاؤ گی؟۔۔۔ اتنی مدت کے بعد ملے ہو۔ تو کیا تم سمجھتی ہو، ہم تمہیں یونہی جانے دیں گے! میری جان! تم اب تو گھر نہیں جاسکتیں، اور اگر شور مچاؤ گی۔۔۔ تو سارے محلے میں بدنام ہو جاؤ گی۔۔۔ تمہارے باپ کا نام بدنام ہو جائے گا۔۔۔ اور وہ تمہیں زہر دے دیگا۔

چلو ہمارے ساتھ!۔۔۔

رضیہ کہنے لگی۔ اگر تم لوگوں نے ایک قدم بھی آگے اٹھایا، تو یاد رکھنا۔۔۔ ابھی پولیس کے حوالے کر دیں گے۔۔۔

سليم ہنس کر کہنے لگا۔۔۔ لیکن میری جان! تمہیں بھی تو پولیس کے ساتھ حالات میں بیان دینے کے لئے جانا ہی پڑے گا نا۔۔۔ پھر تباؤ کیسی بدنامی ہوگی؟۔۔۔ میں نے کہا۔ میں کہہ دوں گی۔ یہ بد معاش آدمی ہے اور سباز اس سے کوئی واسطہ

نہیں ہے!۔۔۔

سليم کہنے لگا۔۔۔ لیکن میں ان سے کہوں گا کہ یہ تو میری بیوی ہے۔ میری اس کی بچپن کی منگنی ہو چکی ہے۔۔۔ اور یہ مجھ سے ہزاروں روپے لیکر کھا چکی ہے اور میرے ساتھ کئی راتیں سوئی رہی ہے۔ اس کے بعد اس نے مجھے چھوڑ دیا۔۔۔ اور میرے اس دوست مسعود سے دوستی کر لی۔۔۔

کیوں بے مسعود ٹھیک ہے نا!۔۔۔ اور مسعود حرام زادہ جو سگریٹ پی رہا تھا۔۔۔ سگریٹ کا آخری کش لگا کر اسے زمین پر پھینک کر بڑی آواز سے پاؤں تلے مسل کر، جاسٹوں جیسی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولا۔۔۔

کیوں نہیں۔۔۔ میرے ساتھ تو اس نے شادی کا بھی وعدہ کیا ہوا ہے۔۔۔ ہم دونوں کھڑی کانپ رہی تھیں کہ کہیں کوئی اپنا ہمسایہ نہ دیکھ لے۔۔۔ کوئی دیکھ نہ لے۔۔۔ آخر رضیہ کی چالاکی کام آئی۔۔۔ کہنے لگی۔۔۔

اچھا، اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہی ہوگی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ لڑکی اس قدر۔۔۔ خراب اور ذلیل ہے۔۔۔ اور اس نے تم جیسے شریف لوگوں کو برباد کر دیا ہے۔۔۔ میں آپ کے ساتھ ہوں آپ کوئی فکر نہ کریں اگر آپ کی امانت ہے تو آپ تک

ضرور پہنچا دوں گی۔ مگر مجھ سے ایک وعدہ کرو۔

سلیم جلدی سے بولا۔ وہ کیا؟؟...

رضیہ کہنے لگی... میں تم لوگوں کو قتل دیتی ہوں کہ جیلہ کو تم لوگوں تک ضرور پہنچا دوں گی۔ مگر ایک وعدہ پر... وہ یہ کہ... تم اس وقت ہم کو جانے دو... کیونکہ میں اسے ابھی ٹھیک کروں گی... اور دوسرے اس کی والدہ ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی... اور پھر تم ابھی ہو رہی ہے... اور اگر یہ اب گھر نہ گئی تو بہت بری بات ہوگی... لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہ کل ٹھیک دس بجے آپ جہاں کہیں گے، وہیں آ جاؤ گی میں کسی نہ کسی بہانے سے اسے پہنچا دوں گی...

مسعود کہنے لگا... اور اگر یہ بات جھوٹ ثابت ہوئی تو؟

سلیم کہنے لگا۔ بالکل نہیں بالکل نہیں! یہ سراسر دھوکہ ہے۔ تم کو اسی وقت ملے

ساتھ چلن ہوگا...

رضیہ نے ذرا محل کر کہا... تو پھر تم کو مجھ پر یقین نہیں ہے۔ حالانکہ میں نے تمہیں اپنا سمجھ کر بڑے مان سے کہا تھا... تم نے ہمارا دل توڑ دیا ہے... اب نہ ہم سے بولن...

سلیم کہنے لگا... تو کی خفا ہو گئی ہو؟...

رضیہ بولی... ہاں ہاں، خفا... بالکل خفا؟...

اچھا خفا نہ ہو... میں تمہاری بات کا اعتبار کرتا ہوں لیکن اپنا نام بتاتی جاؤ... اور اپنی شکل بھی دکھاتی جاؤ... اور یاد رکھو اگر کل نہ آئیں تو ہم مکان کا دروازہ... کھٹکھٹا دیں گے۔

تم کتنے بے اعتبار ہو... جب ایک دفعہ وعدہ کر دیا، تو پھر چاہے

جان چلی جائے... مگر وعدہ ضرور پورا ہوگا...

اچھا اپنا نام بتاؤ...

سبح سبوح بتاؤں یا جھوٹ؟...

نہ بالکل سچ!...

میرا نام زائدہ ہے...

کتنا پیارا نام ہے اور کھڑا تو اس سے بھی زیادہ پیارا ہوگا! لو اپنا نقاب ہٹا کر چہرہ دکھاؤ۔

لیکن یہاں راستے میں کیسے دکھاؤں؟

پھر کیا ہے... بس ذرا سا ہلٹ دو۔

لو دیکھ لو...

ہاں دیکھ لیا... بہت پیاری ہو... اچھا تو اب جاؤ، اور کل دس بجے اسی جگہ

آ جانا...

بہت اچھا...

لیکن دیکھو... وعدہ ضرور پورا ہو...

ضرور... ضرور...

اور جب وہ نام ادا چلے گئے... تو ہم دونوں گھر میں داخل ہوئیں... میں نے کہا... رضیہ! میری جان سے پیاری سہیلی! تم کتنی سمجھ دار اور کتنی عقل مند اور کتنی اچھی ہو... تم نے کس خوبی سے ان کو ٹر خایا ہے... ورنہ وہ کبھی نہ جلتے رضیہ کہنے لگی...

اور تم... جیلہ! تم سراسر بدھو ہو۔ بالکل پاگل... اگر ایسے موقعوں پر انسان ادا نہ خطا کرے... تو پھر بالکل ہی بیوقوف ہو جاتا ہے... ورنہ تم دیکھتیں، کہ یہاں کیا ہو جاتا!...

مائے! رضیہ بہن! اگر میں اکیلی ہوتی۔ تو کی ہوتا؟ میں تو بے ہوش ہو کر گر پڑتی... لیکن رضیہ! کل کو کیا ہوگا؟

رضیہ بولی۔ ابھی تم چپ رہو... کل دیکھا جائے گا... کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں جاننے دوں گی؟... تو بہ! چلو اور چلیں پیسے ہی بہت دیر ہو رہی ہے۔ میری امی



بھی خناہوں گی۔ میں ابھی خالہ کو سارا کچھ بتا دوں گی۔

خدا کے لئے رخصت ہوں نہ کرنا... ورنہ میں زندہ دفن کر دی جاؤں گی... تم نہیں جانتیں... میرے آپس قدر سخت ہیں۔ وہ سپے ہی لوگوں سے سنتے ہیں کہ سلیم ہمارے خلاف کیا کیا کچھ کہتا ہے... اور اگر اب ان کو یہ پتہ چل گیا... تو وہ توکل کی بجائے آج ہی میری شادی کر دیں گے... اور تم جانتی ہو... مجھے شادی سے نفرت ہے... میں شادی نہیں کرنا چاہتی... پھر کیا ہوگا؟... تم ابھی خدا رسول کے واسطے چپ رہو اور گھر میں کوئی اور سببانہ کر دیتے ہیں کہ کیوں دیر ہوگئی اور بعد میں دیکھا جائے گا۔ لیکن... رخصت ہوں... اگر انھوں نے کل کو ان کر دروازہ کھٹکھا دیا... تو؟... کبھی نہیں... میں نے کہا... رخصت ان کی اتنی جرات نہیں ہے۔ وہ جب خود اگر دروازہ کھٹکھا دیا گئے تو آبا جان خود سمجھ لیں گے... کیا پتہ وہ نہ ہی آئیں اور تم آج کا واقعہ سنا کر میرے لئے مشکلات پیدا نہ کرو۔ اگر وہ نہ کہنے تو اس سے زیادہ اچھی اور کوئی بات نہیں، اور اگر وہ آگئے... تو پھر دیکھا جائیگا... عزیزیکہ رخصت ان گئی... اور ہم امی کے کمرہ کی طرف گئے...۔۔۔۔۔

امی نے مجھے دیکھ کر برا سامنے بنایا۔ اور کہا۔ اتنی جلدی کا ہے کو آگئی ہو؟۔۔۔ ذرا اور سیر کر کے آنا تھا...۔۔۔۔۔

رخصت ہوں... خالہ جی! ہم تو بہت جلد آجائے مگر راستے میں نیمہ کانوکر مل گیا... اور ہم نے اس سے نیمہ کا حال پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ سخت بیمار ہے... اسے ڈبل نمونیا ہو گیا ہے۔ یہ شکر پھر کیسے رہا جاتا؟ اور پھر مکان بھی اسی بازار میں تھا بس وہاں چلے گئے۔ جلیلہ تو جاتی بھی نہیں تھی... میں زبردستی ساتھ لے گئی تھی۔ امی بولیں... لیکن دیکھو شام ہونے کو آگئی ہے۔ اور ابھی اس کے آبا دفتر سے آجائیں گے اور کھانا تک تیار نہ ہو سکا۔

میں نے کہا۔ امی جی! آپ فکر نہ کریں۔ میں پانچ منٹ میں ہی تیار کر لیتی ہوں... میں ابھی جاتی ہوں... یہ فرار تم دکھا دو رخصت... اور میں باورچی خانہ کی طرف

چل دی۔

اگ جلائی... مگر آگ بجھ گئی۔ پھر جلائی... پھر کچھ کٹی لکڑیاں لگی تھیں... دھوئیں سے سارا کمرہ بھر گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو گئے... اپنی امی ہوئیں... تو لوں دھوئیں میں مجھے گھرا ہوا دیکھ کر کس قدر پریشان نہ ہوتی؟ وہ مجھے لڑی ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں...۔۔۔۔۔

حالانکہ آبا جان کی سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ ہے۔ تو کیا یہ کام کرنے کے لئے نوکریں رکھ سکتیں؟... آبا جان نے کئی بار کہا ہے مگر میرے ہوتے ہوئے امی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ نوکریں رکھیں!

امی کہتی ہیں۔ لڑکیوں کو کھانا پکانا سیکھنا چاہئے... ضرور سیکھنا چاہئے لیکن اگر ہزار لڑکیوں میں سے ایک لڑکی نہ سیکھے گی، تو کیا ہو جائے گا... اور پھر اس کے حالات کا بھی یہ تقاضہ نہیں کہ وہ ضرور کام کرے... اگ جلائی اور کھانا تیار کرنے لگی...۔۔۔۔۔

دل غم سے ٹھہرا ہوا رہا تھا... کہ کل کیا ہوگا؟...۔۔۔۔۔ اور رخصت یہاں سے آگئی!۔۔۔۔۔

اگر امی اور آبا کو پتہ چلا تو وہ مجھے آگے پڑھنے کو کبھی کانچ نہ بھیجیں گے۔ رات ہوئی۔ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لئے دو چار نواسے ہی لٹکے...۔۔۔۔۔

رات گہری ہو گئی... بارہ بجے... ایک... دو وقت ہوئے ہوئے تھے الگا... مگر نیند تھی... کہ آنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی... کئی بار روئی... یہی چوتھی تھی کہ اگر امی کی وفات کے بعد آبا مجھے اپنے پاس رکھتے... تو سلیم کو یہ جرات تو کبھی نہ ہوتی... اور وہ میری زندگی یوں خراب تو نہ کرتا...۔۔۔۔۔

لیکن شاید آبا کا بھی قصور نہیں ہے... آبا تو یہی چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی زیادہ سے زیادہ محفوظ طریقے سے رہے... اس لئے انھوں نے چچی کے سپرد کیا تھا

لیکن چچی کو بھی کیا خبر تھی!!  
 لیکن نہیں چچی کو خبر تھی اور ضرور خبر تھی کہ سلیم مجھے تنگ کرتا ہے... مجھ  
 ہے، میرے چنگیاں لیتا ہے، میرا منہ چومتا ہے... میں بھلا کوئی چھوٹی سی تو  
 پچھے خدا! میری مدد کرنا... میری عزت تمہارے پُرو ہے، اسے ربر  
 الغرت!... اسے پھولوں کو ہبک اور ستاروں کو روشنی بخشنے والے بلند معبود!..  
 اسے نیلے آسمان پر رہنے والے خدا... میں بن مال کی بیچی ہوں... میری  
 کرنا... اُن دونوں نامرادوں کو راتوں رات نیست و نابود کر دینا... اور کل کا  
 خوشیوں کا دن طلوع کرنا!  
 میرے پیارے خدا! تم جانتے ہو، میں کسی لڑکی ہوں، مجھے میری نیت  
 مراد دینا!...

آج کئی روز کے بعد ڈائری لکھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ کل ہم اس شہر سے  
 بھٹت ہو رہے ہیں... اس گھر کو الوداع کہہ دیں گے ہم تو ابھی کسی جگہ نہ جاتے،  
 و نامراد سلیم کی وجہ سے جلد جا رہے ہیں... دوسرے روز تو وہ نامراد نہیں آیا  
 غا۔ مگر تیسرے روز اس نے کیا کیا کہ معبود کے ہاتھ ایک رقمہ بھیجا۔ جس  
 میں لکھا تھا...

میری جان! میری ہونے والی بیوی جیلہ!  
 آئینہ دیکھ کر میری طرف سے اپنا منہ چومنا...

میری پیار کا!... وعدہ کے باوجود اس دن تم نہ آئیں نہ زائدہ آئی...  
 میں تمہارے بغیر اب زندہ نہیں رہ سکتا... یا تو میرے پاس بھاگ کر آ جاؤ...  
 پھر گھر والوں کو کہو کہ وہ میرے ساتھ تمہاری شادی کریں... میں اب تمہارے  
 بغیر زندہ نہیں رہ سکتا... تمہارا غولہ و رت جسم مجھے یاد آتا ہے... اور وہ تل بھی  
 جو تم نے مجھے دکھایا تھا... تمہاری چھاتی پر یہ تل کتنا پیارا لگ رہا تھا...  
 مجھے وہ تل کب دکھاؤ گی؟ کل میں اسی جگہ جہاں تم ملی تھیں کھڑے ہو کر  
 ہمارا انتظار کر دوں گا... ضرور آنا۔ فقط

تمہارا خاوند  
 تمہارا چاہنے والا عاشق ماس

ہیں اُدپر چھت پر بیٹھی تھی کہ نیچے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا - اور میرادل تیزی سے دھڑکنے لگ گیا ... کیونکہ دروازہ کھٹکھٹانے کا انداز بڑا اجنبی ... بڑا خوفناک تھا ... میرے پاس امی بیٹھی تھیں اور ماسی زینب کو جو بازار سے سودا وغیرہ لاتی ہے -

امی نے زینب کو بھیجا کہ جا کر دیکھو ... کون ہے ... زینب نے کھڑکی دیکھ کر کہا ... کہ کوئی آدمی کھڑا ہے ... کہتا ہے ... نیچے اُن کریہ خط لے جاؤ ... میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا مگر میں کچھ نہ کر سکتی تھی ... ماسی زینب نیچے رقعہ لینے گئیں ...

وہ نامراد کہنے لگا ... یہ رقعہ جا کر جلیہ کو دینا ... اور کسی کو نہ دینا ... یہ کہہ کر چلا گیا ...

ماسی رقعہ لیکر اُپر آئی اور اسی طرح لفظ دہرا دے - میں نے زرتے ہوئے ہاتھوں سے رقعہ پڑھا - میرا فنی رنگ دیکھ کر امی کے ہاتھ پر بل پڑ گئے ... کہنے لگیں ...

ماسی! رقعہ مجھے دو ... لاؤ ادھر ... جیلا ادھر دے دو - یہ لیجئے ... میرا آواز جیسے کسی ریگستان سے اٹھ رہی تھی انھوں نے رقعہ پڑھا ... اور دانت پیٹے ہوئے کہنے لگیں -

تو یہ بات ہے ... ہاں ... میں پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ جو سارا راز دق کھوئی کھوئی سی رہتی ہے، اور راتوں کو جاگتی ہے - فال میں ضرور کالا کالبے ... بے پڑھ ہے، اپنے یار کا خط ... ہم سے پوچھ لیں یہی تو ہے اپنا خاندان چن لیا؟ ...

میں نے کہا ... امی جی! خدا کے لئے یوں نہ کہیں - میں تو جانتی بھی نہیں کہ یہ کون نامراد ہے ... اور اس نے کیوں ایسا خط لکھا ہے -

ہاں ہاں، تو کیوں جانتے گئے گی ... تیری زبان کو چارٹا لگی ہوئی ہے ... اسی لئے تو تو روتی تھی کہ کالج ضرور داخل ہونا ہے تاکہ اُنے جانے کا سلسلہ بن جائے ... میں بھی کہتی تھی کہ جیلا ایسا شوق کہاں سے مجھے آگیا؟ ...

کی سلیم کا واقعہ کوئی کم واقعہ ہے ... اس سے تیری تسلی نہ ہوئی تھی؟ ... سلیم سچ کہتا تھا کہ تیرا کوئی اور یار بھی ہے - تبھی تو نے وہاں شادی نہ کی تھی ... میں نے تو اُن کو جھوٹا سمجھا تھا ... مگر اب پتہ چلا ہے کہ وہ سچے تھے ... آج تیرا باپ آئے، یہ خط اسی کو ملے گا ...

کیوں ماسی زینب؟ کیا ایسا اندھیرا بھی کبھی نہ تھا؟ لوگ پھر کہیں گے ... بیوٹی ماں تھی ... جوان لڑکی کا خیال نہ کیا ... پتہ نہیں ... اس کے باپ کو کیا ہو گیا ہے - جوان لڑکی کو گھر پر بٹھا رکھا ہے ... میں تو کہتی تھی کہ شادی کر دو ... اب بس سے پتہ چلے گا جب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا ...

میں تو اپنی شہزادی بلو کی بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی شادی کر دوں گی ... نہ بابا ... لڑکیوں کی رکھوالی نہیں ہو سکتی ... اب تم ہی کہو ... میں اس کا کتنا خیال نہیں رکھتی تھی ... ذرا بھی ادھر سے ادھر نہیں ہونے دیتی تھی - مگر دیکھ لو ... اس کا یار نکل ہی آیا ہے ... میں روئی جاتی تھی اور کہتی تھی ...

امی جی! مجھے تو پتہ ہی نہیں کہ یہ کون نامراد ہے، امی میسری! میری بات کا اعتبار کرو ... امی مجھے آپ کی عزت کا خیال ہے - ہیں ایسی حرکت کیسے کر سکتی تھی! اباجان کو نہ کتنا اچھی امی! میں ساری عمر آپ کی خدمت کر دوں گی ... مگر ان کو نہ کہنا ... آپ خود میری ماں ہیں - آپ خود اس واقعہ کی تحقیق کریں ... اگر یہ بات سچی نکلے تو پھر بے شک اباجان کو کہہ دیں - مگر ابھی نہ کہیں ...

پیاری امی! یہ سراسر انہی ذلیل لوگوں کی شرارت ہے - یہ سلیم نامراد کی شرارت ہے ... امی کہنے لگیں مگر دو سالوں کے بعد وہ کیسے یہ شرارت بیٹھے بٹھائے کر سکتے ہیں ... میں نے کہا نہیں امی یہ انہی کی شرارت ہے ... امی کہنے لگیں - تو پھر تمہیں

پتہ ہوگا۔  
 نہیں، مجھے انکا کیا پتہ؟ لیکن اور تو کوئی بات ہی نہیں ہے امی جان! میں نے امی کی بہتری منت کیس۔ مگر امی نے جھڑکوں کے درمیان کچھ نہ سنا میرا دل ایک دم ادا کس ہو گیا۔ میں نے اپنے آلو، خشک کئے، اور چپکے سے ان کو اپنے کمرے میں آگئی۔ اندر سے دروازہ بند کیا اور شمال اور دکھانے پر لیٹ گئی اور پھر اس قدر روئی، اس قدر روئی کہ آنسوؤں کا آخری قطرہ تک نہ چڑ گیا...  
 مجھے اپنی ماں یاد آرہی تھی... ماں... میری پیاری ماں! اگر تو اس دنیا میں ہوتی... اپنے اس گھر میں ہوتی... یہاں ہوتی... میرے پاس ہوتی... تو ماں میں تیری گود میں سر رکھ کر روتی میں تجھے ایک بار منت سے نہیں چل کر ہی کہتی کہ یہ چھوٹا ہے۔ ابا کو نہ بتانا۔ تو میری ماں... تو انہیں کبھی نہ بتاتی... میری بات کا یقین کر لیتی... مال... تو کیوں اتنی جلدی مجھ سے روٹھ کر چلی گئی... تو مجھے بھی ساتھ لے جاتی ماں!...  
 میری پیاری ماں!... اور میں بلک بلک کر روتی رہی... جوں جوں رات ہو رہی تھی... ابا کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ مجھے بخار ہو رہا تھا۔...  
 آخر کار آیا آئے... ان کو بتا دیا... تنگ مزاج لگا کر، وہ سیدھے میرے کمرے میں آئے میں پتنگ پر لیٹی تھی... اٹھ کر بیٹھ گئی...  
 جیلہ!... ایک گرج وار آواز گونجی...

جی ابا جان!...

یہ کس کا خط آیا ہے؟...

پہلے تو جی چاہا بالکل خاموش رہوں... جو ابا جان کا جی چاہے وہ کہیں جو وال کا جی چاہے وہ کرے... میں مارتک کھانے، بلکہ نہ ہر تک پینے کو تیار ہو گئی تھی۔ مجھے زندگی سے نفرت سی ہو گئی... سوچتی تھی جب میری بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا، تو ان سے کچھ بھی کیوا کہوں؟...

میں تو امی کی بھی اتنی منتیں کر کے پھٹا رہی تھی۔ جب کوئی سچائی کو سمجھنے والا... ماننے والا اور سننے والا نہیں، تو انسان پھر کیوں ذلیل ہو؟...  
 جب میری بات کا کوئی یقین نہیں کرتا... تو پھر میں کا ہے کو یقین دلاؤں؟ مگر میں خاموش نہ رہ سکی... ایک بار گوشہ نشین کر کے دیکھنے کو دل چاہا کہ شاید ابا میری بات کا یقین کر لیں اور اگر نہ کریں گے تو پھر جو بھی عتاب نازل ہوگا، بہرہ دل گی۔ مگر پھر منت نہ کر دی گئی۔  
 اور میں نے کہا...

ابا جان! یہ بالکل جھوٹا خط ہے۔ خدا جانے کس نامراد نے دشمنی سے مجھ پر یہ جھجی کے گھر سے ہی کسی کی شرارت سمجھی ہے ابا جان! میں آپ کو خدا پاک کی قسم کھا کر یقین دلاتی ہوں کہ میرا اس خط سے کوئی تعلق نہیں ہے...  
 لیکن ابا جان بڑے... اگر کوئی بات نہیں ہے... تو پھر بیٹھے بٹھائے اتنی دیر کے بعد کسی کی جرأت کیونکر ہوئی کہ وہ ایسا خط لکھے؟...  
 ابا جان! میں آپ کو کچھ نہیں کہتی۔ آپ خود تحقیق کر کے دیکھ لیں اگر میں کوئی ایسی خواب دیکھ کر ثابت ہوئی اور خط کا انداز صحیح ثابت ہوا تو پھر ابا جان!... آپ مجھے خاموشی سے زبردستی پا لہ لاکر دے دیں اور آپ یقین کریں... میں آپ کی عزت کی خاطر اسے چپ چاپ پی لوں گی... اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی...  
 یہ سنکر ابا جان خاموش ہو گئے... اور جب اٹھ کر جانے لگے تو کہنے لگے...

کسی بہیلی کو نہ تو خط لکھنا ہے اور نہ کہیں جانا ہے... میں دیکھ لوں گا کہ خط لکھنے والا کون ہے؟...

میں نے بخار کی دھج سے رات کو روٹی نہ کھائی... دوسرا دن خاموشی سے گزر گیا ابا جان دفتر سے آتے ہی سیدھے میرے پاس آئے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کبھی نہ آتے تھے... مہینوں گزر جاتے تھے۔ تب کہیں جا کر وہ میرے کمرے میں آتے...

تھے...

تیسرے دن دوپہر کی ڈاک سے پھر ایک خط آیا...  
میری جان جیکہ!

تم نے میرے خط کا جواب نہیں دیا... نہ تم ملنے کو نہیں... میں سارا وقت کھڑا کرتا رہا... میں ایک بار پھر تمہیں موقع دیتا ہوں کہ تم کل آ جاؤ... اگر تم کل نہ آؤ تو پھر یاد رکھو۔ اس کا انجام بڑا ہوگا... آ جاؤ گی، تو کچھ نہ ہوگا۔ فقط تمہیں چاہئے والا  
م۔س۔

رات کو آبا جان آئے۔ انہیں یہ خط دیا گیا۔ وہ پڑھ کر فکر مند سے ہو گئے مجھ پر بار پھر طویا، اور پوچھا کہ کوئی بات ہے... لیکن کوئی بات نہ تھی تو میں بتاتی۔ کچھ دیر کے بعد آبا جان اٹھ کر چلے گئے... اور میں امی کے پاس بیٹھی رہ گئی... میں نے امی سے کوئی بات نہ کی... میں نے بڑو کو بھی نہ بلایا... جب اپنی خدمت کے باوجود امی کو میرا درد سنیں، امی کو میرا خیال تک نہیں... اتنی منٹوں کے باوجود امی نے آبا تک بات پہنچا دی... میں امی کو کیا کہتی؟... کچھ دیر کے بعد میں اٹھ کر اپنے کمرہ کی طرف آئی... تو دیکھا... آبا جان میرے کمرے کی تلاشی لے رہے تھے... اگرچہ کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہ تھی... لیکن ان کا یوں تلاشی لینا مجھے بہت ناگوار گزرا...

جے شک وہ میرے باپ تھے... لیکن کیا باپ کو اپنی بیٹی پر یقین نہ تھا، اور اگر یقین نہیں تھا... تو پھر تلاشی لینے کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے اپنی کاپیوں میں کچھ شعر لکھے ہوئے تھے، انگریز شاعروں کی نظمیں تھیں... اور سب سے زیادہ خندہ جس بات کا مجھے ہوا، وہ یہ تھا کہ میری دائری کیا ان کے ہاتھ نہ لگ جائے... اگرچہ اس میں بھی کچھ نہ تھا۔ مگر پھر بھی مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا۔۔۔

مجھے دیکھ کر آبا جان خاموشی سے باہر چلے گئے... اور میں اجنبی بن کر چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گئی... میں اس گھر کی کچھ نہیں سمجھتی نہ میسر آتا کون سی بات ہے یہ کسی اور کا گھر ہے، اور میں غیروں میں رہ رہی ہوں... میرا اپنا گھر کہاں ہے اے میرے اپنے گھر! میں کب تیرے دروازے میں داخل ہوں گی؟ ساری رات یوں ہی اُداس رہی...

دوسرے دن صبح کو آبا جان آئے... اور کہنے لگے... تم سامان وغیرہ باندھ لو... تبدیلی اسی ہفتے کے اندر اندر ہو رہی ہے... اور دیکھو باورچی خانے کے کام سے فارغ ہو کر ذرا اپنی امی کو سامان باندھنے میں مدد دینا۔

بہت اچھا، آبا جان! اور آبا جان دفتر چلے گئے... آبا جان کچھ نئی روشنی اور کچھ پڑائی روشنی کے ہیں۔ وہ جہاں نئی باتیں پسند کرتے ہیں، وہاں پڑائی باتوں پر بھی جان دیتے ہیں... امی ان کی دوسری بیوی ہے... آرام طلب... فیشن پرست اور سخت عورت... جس نے آبا جان کو مکمل طور پر اپنے قابو میں کر لیا ہے۔

امی کے والدین غریب ہیں اور امی سے جہاں تک ہو سکتا ہے۔ ان کی مدد کرتی رہتی ہیں... امی کا ایک بھائی ہے اور تین سہیلیں جو امی کے خرچ پر ہی سکول میں پڑھتی ہیں... بھائی کلک ہے... اور بھائی کے دو گندے سسے پٹے ہیں۔ باپ نہیں ہے۔ اب اسے ایک بہن کی شادی کرنی ہے۔ آبا جان کو سارا کچھ معلوم ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتے میرا جی چاہتا ہے کہ میں امی سے پوچھوں۔

امی! میری قمیضیں اگر ایک سے دو ہو جائیں تو آپ کی نظروں میں کھلتی ہیں... والا کچھ یہ میرے آبا کی کمائی ہے اور میرا جتنا جی چاہے میں خرچ کروں... مگر یہ جو آپ پر مینے تین سو روپیہ وہاں بھیجتی ہیں وہ کس حساب سے بھیجتی ہیں؟... مگر میں کسی کو کیا کہہ سکتی ہوں؟...

شام کو آبا جان دفتر سے آئے تو پتہ چلا کہ دو بج رہی ہیں تبادلہ ہو جائے گا...  
ہم نے تمام سامان باندھ لیا ہے، اور کل روانہ ہو جائیں گے...  
اس گھر میں یہ آج ہماری آخری رات ہے... اس گھر نے مجھے خوشی کے چند  
لمحے بخشے ہیں... اور جاتی دفعہ تو کس قدر پریشان دی ہے...  
آبا جان کہتے تھے... کہ شام کی ٹھوڑی سے چلے جائیں گے... نہ جانے ہمارا  
نیا گھر کیا ہو گا؟؟... کیا ہم پھر دوبارہ کبھی اس شہر میں آ سکیں گے یا نہیں؟...  
خدا جانے!...

نہ جانے آنے والے دنوں میں ہمارے لئے کیا کچھ ہے۔ آنے والے دنوں  
کو تو چھوڑ دو۔ آنے والے لمحوں تک کا پتہ نہیں... کی خبر آنے والا لمحہ ہمارے لئے۔  
خوشی لائے یا غم؟... زندگی کا پیغام دے یا موت کی خبر سنانے؟...  
کچھ پتہ نہیں ہوتا!....

ہم نئے شہر میں آ گئے ہیں...  
یہاں ابھی آبا جان کو رہنے کے لیے جگہ نہیں ملی۔ ایک ہفتہ تک مل جائے  
گی... یہاں آبا جان کو سرکاری کوٹھی ملے گی امی کا خیال ہے... کہ وہ خوش قسمت  
دلہن آئی ہیں۔ کیونکہ جب سے امی جان آئی ہیں... آبا جان کی ترقی ہو رہی ہے۔  
درزا امی کی شادی کے وقت تو ان کی دو سو روپے تنخواہ تھی اور اب سات سو روپے  
ہو گئی ہے۔ اسی لئے امی اپنی خوش قسمتی کی قیمت کے تین سو روپے ہر مہینے گھر  
بھجواتی رہتی ہیں...

ابھی ہم امی کے ایک رشتہ کی بہن کے ہاں ٹھہرے ہیں... ایک ہفتہ تک  
اپنی کوٹھی میں چلے جائیں گے... جب سے مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ وہاں بار بھی نہیں  
اور درخت بھی ہیں اور چاروں طرف پہاڑ ہیں، اور بڑا خوبصورت علاقہ ہے... میل  
دل خوش ہے۔

مگر... یہ خوشی دوسرے ہی لمحے ویران ہو جاتی ہے۔ کہ یہاں کو کھانج نہیں۔ جہاں  
میں اپنی بی۔ اے کی پڑھائی جاری رکھ سکوں گی۔ اور میں تو بہت سا پڑھنا چاہتی ہوں۔  
امی کی یہ سن... جو میری خالہ سگتی ہیں، اور جنہیں ہم بھی خالہ زینت کہتے تھے...  
بہت اچھی عورت تھیں۔ امی جس قدر تنگ نظر اور تعصب پرست تھیں۔ یہ اتنی ہی اچھی تھیں  
اور ایک دو روز میں ہی یہ مجھے بہت پیار کرتے لگ گئی تھیں... یہ جب مجھے بیٹی کہہ

پیار سے بلاتیں۔ تو ان کا لہجہ اس قدر شیریں ہوتا اور اس میں اتنی محبت ہوتی کہ میں ہر دکھ بھول جاتی...

ان کی ایک بیٹی فرخندہ تھی۔ جو ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ اور ایک بیٹا جاوید تھا۔ جو ڈاکٹری پڑھتا تھا اور لاہور میڈیکل ہسپتال میں رہتا تھا...

فرخندہ مجھ سے بہت جلد مانوس ہو گئی... اور میں اسے پڑھانے لگا...

وہ مجھ سے بڑے شوق سے پڑھتی تھی... ہماری بوجھ دو سال کی ہو گئی تھی...

اور وہ بھی پاس آ بیٹھی پچھلا، ہفتہ جس قدر پرانی کے عالم میں روتے ہوئے میں نے گزرا تھا۔۔۔ یہ ہفتہ اتنا ہی مہربان اور پرسکون تھا... نہ جانے آنے والے تیز سے ہفتے میں میرے لئے کیا ہے؟... اور پھر اس سے لگے ہفتوں میں؟... خدا بہتر جانتا ہے!!

خالہ زینت نے میرا کتوں کا شوق دیکھ کر جادو کے کمرہ کی چابی دے دی... کہ اس کے پاس بہت سی کتابیں ہیں... تم کو پڑھنے کے لئے جو لینی ہوں... لو... میں نے خوشی کو بڑی شکل سے دباتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا... ایک بڑا خوبصورت سجا ہوا کمرہ تھا... کمرہ میں دو مین بڑی خوبصورت سیزیاں لگی ہوئی تھیں ایک طرف پتنگ بچھا تھا... پاس ٹیبل پر اس کا اپنا ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ سامنے صوفہ سیٹ پڑا تھا... ایک طرف کونے میں کھڑکی کے پاس فیشے کی الماری تھی... اور ساتھ ہی کتوں کی الماری تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں سارے کمرہ کا جائزہ لے لیا... اور پھر چھوٹی ٹیبل کو دیکھا جسے میں نے ابھی تک نہ

دیکھا تھا... وہاں ایک بڑے سائز کی جادو کی فوٹو تھی... جس میں وہ سوٹ پہنے ہوئے ہے، اور بڑے ہی پیارے اور تیکھے انداز میں مسکرا رہا ہے۔ یہ تصویر مجھے بہت اچھی لگی... اور میں گنتی ہی دیر تک کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ لیکن اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟! اور میں نے تصویر کو ایک طرف رکھ دیا... اور کتوں کی الماری کھول کر کتوں کو دیکھنے لگی... چند کتیاں نکالیں، اور باہر باغ میں خاموشی سے بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

یہاں میں بڑی مسرور ہوں۔ کوئی کام وغیرہ نہیں کرنا ہوتا۔ کیونکہ خالہ زینت کے ہاں نوکر کام کرنے والے ہیں۔ کاش! میری ساری زندگی یہیں گزر جائے۔

کبھی نہ مانیں... وہ تو اپنا جان سے کہہ کر مجھے بہت ہی برا بھلا کہلا رہیں...  
 کاش! امی کی جگہ خالہ زینت میسری امی مہتیں تو کس قدر اچھا  
 مہتا!!...

جاوید کی کئی تصویریں الماری میں سے نکلی ہیں... جی چاہتا ہے ایک تصویر  
 چاکر ساتھ لے جاؤں... مگر میں ایسا کبھی نہیں کر سکتی! اگر کسی نے تصویر دیکھ لی تو  
 مجھے تو دنیا جہاں کی ذیل اور آوارہ لڑکی سمجھ لیا جائے گا... کتنی عجیب بات ہے!۔  
 اگر کوئی چیز اچھی لگے... تو سبھی کو اچھی لگتی ہے، اور اچھی اور خوبصورت چیز کا  
 تعریف کرنے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ مگر ہمارے ملک میں تو لڑکیوں کو اتنا بھی حق  
 حاصل نہیں ہے جتنا مردوں کو تو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی لڑکی کو دیکھیں تو اپنی پسند کا  
 اظہار کر سکتے ہیں... مگر ہم لڑکیاں نہیں کر سکتیں۔ مرد لڑکی کی خوبصورتی کی تعریف کر سکتا  
 ہے، مگر لڑکی مرد کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کر سکتی اور جس نے ان قیود کو توڑ کر اپنی  
 آزادانہ رائے دینے کی کوشش کی۔ اسے بد معاش سمجھ لیا جاتا ہے... کتنا ذلیل  
 ملک ہے ہمارا... جہاں مردوں کی اس قدر گندی ذہنیت ہے!!...

فرخندہ اپنے بھیا کی بہت تعریفیں کرتی ہے کہ میرا بھیا بہت اچھا ہے اس کے  
 لئے بہت سی چیزیں لاتا ہے... اسے بہت پیار کرتا ہے... بہت مہناتا ہے  
 کیا میں جاوید کو دیکھ سکوں گی؟ لیکن اگر میں نے اسے دیکھ بھی لیا، تو کیا ہے  
 میں کوئی اس کے سامنے آ سکوں گی... نہ اس سے بات کر سکوں گی...  
 خالہ زینت تو کبھی کبھہ نہ کہتیں۔ وہ تو کس قدر اچھی ہیں۔ مگر امی تو تو بہ تو



خالہ زینت کہنے لگیں۔ بیٹی وجہ کیا تھی آخر؟...  
میں نے کہا۔ خالہ جی! مجھے پڑھنے کا شوق تھا... اور اس لڑکے کو ڈکلیں  
لو تانچے جھانچے کا شوق تھا... ہمارا کہاں گزارہ ہو سکتا تھا؟...  
خالہ سننے لگیں... اور کہا۔ تو کیا اب پڑھتی ہو؟...  
ہاں! میں نے ایف اے کا امتحان دیا ہے۔

پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔ پڑھنے کا شوق تو خدا ہر بیٹی کو دے... پھر  
خالہ میری امی کو کہنے لگیں... کہ نعیم بہن! سچ پوچھو تو مجھے تو جلیلہ بہت پسند آئی  
ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم ابھی اسے پڑھنے دو اور جتنا اس کا جی چاہے  
یہ پڑھ لے اس عرصہ میں میرا بیٹا بھی ڈاکٹر بن جائے گا... پھر تم اسے میری بیٹی  
بنادینا۔

امی تو یہ سن کر جیسے بہت پریشان ہو گئیں... اُن کا تو یہاں اپنی بہن کی شادی  
رنے کا خیال تھا۔ کہنے لگیں۔ بہن! یہ تو اس کے باپ کی مرضی پر منحصر ہے نا!۔  
وہ جہاں چاہیں گے۔ وہیں اس کی شادی ہوگی۔ میری بات وہ بھلا کب...  
انہیں گے؟

اُن کا تو اپنے بھائی کے یہاں شادی کا خیال ہے۔  
خالہ زینت کہنے لگیں۔ میں اُن کو خود کہوں گی اور آج ہی پوچھوں گی۔ ایسی  
پانڈ کی بیٹی بھلا کیا روز روز ملتی ہے!!

خالہ زینت کی یہ باتیں سُن کر میں نے بظاہر تو سر نیچا کر لیا تھا اور خاموش رہی  
تھی۔ خاموشی تو رہتا ہی تھا۔ لیکن سچ پوچھو تو مجھے اندر سے اس قدر خوشی ہو رہی  
تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مائے ایک کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے؟...  
جاوید میرا ہو سکتا ہے؟ کیا میں اتنی خوش قسمت ہو سکتی ہوں کہ جاوید  
میرا ہو ہی جائے... خدا دیکھ کے بعد دیکھ کے بعد دیکھ دیتا ہے۔ میں  
نے جو اپنی یہ عمر اسی اور میرانی میں گزارا ہے تو کیا پتہ خدا کو اب میری خوشی

رات ہم سب بیٹھے ریڈیو پر ڈراما سن رہے تھے... میں نے آبا جان۔  
سے کئی بار کہا ہے کہ آپ ہمیں بھی ریڈیو لادیں۔ مگر وہ نہیں لاتے... امی کہیں تو  
ابھی لادیں... ہم ریڈیو سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ میں  
خالہ زینت کے پاس لوگو کو دہلے بیٹھی تھی اور فرخندہ بھی میرے پاس تھی...  
میری طرف دیکھتے ہوئے خالہ زینت امی سے کہنے لگیں...  
جلیلہ کی اچھی منگنی وغیرہ کہیں کی ہے یا نہیں؟!...  
امی کہنے لگیں... نہیں کہیں بھی نہیں کی... یہ تو شادی ہی نہیں کرتی... کہتی ہے

نہیں کرنی...

میں نے آنکھیں نیچی کر لیں...  
خالہ زینت کہنے لگیں... کیوں جلیلہ بیٹی! کیا بات ہے؟! شادی تو ایک ضروری چیز  
ہے۔ یہ تو ہر لڑکی کی ہوتی ہے...

امی کہنے لگیں۔ چچی کے لڑکے سے تو بچپن کی منگنی اس نے توڑ دی ہے  
... وہ کوئی کم شور تو نہیں پڑا تھا نا... بس یہی کہتی تھی کہ یہاں شادی نہیں کرنی، کبھی  
نہیں کرنی۔ اگر یہاں شادی کی تو زہر کھلوں گی... باپ بیٹی کی منہ کے آگے کیا کر سکتا تھا  
! ہم خاموش ہو گئے۔

منظور ہو لیکن مجھے امی پر غصہ آ رہا تھا جنہوں نے یوں بڑی طرح خالہ کو جواب دیا۔  
 امی بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتی ہیں کہ کوئی میری تعریف کرے... انہوں نے کتنی جلدی  
 کہہ دیا کہ میری شادی اباجان کی مرضی سے ہوگی۔ حالانکہ اباجان ہر بات اندر  
 پوچھ کر کرتے ہیں۔ بس ہمارے گھر میں جو یہ چاہیں وہی ہو سکتا ہے اور اگر  
 کوئی کچھ چاہے۔ تو وہ نہیں ہو سکتا۔ چاہے وہ اباجان ہی کیوں نہ ہوں؟...  
 لیکن یہاں دیکھو۔ ان عورتوں کو دیکھو۔ دوسروں کے سامنے اپنے آپ  
 کو کس قدر مظلوم اور بے کس ظاہر کرتی ہیں۔ جیسے بہت دکھی ہیں۔ اپنی اہل  
 حالت کس طرح چھپا کر رکھتی ہیں۔ کتنی جھوٹی ہوتی ہیں... بھلا یہ اگر کہیں... کہہ  
 سارا کچھ ہماری مرضی سے ہوتا ہے تو دوسری عورتیں انہیں کھا تو نہیں لیں گی...  
 مگر ان عورتوں کی اپنی الگ سیاست ہوتی ہے جھوٹی، بناوٹی اور کھوکھلی سی۔  
 ہوتی ہے... بس یہ اپنا دکھ ہی ظاہر کرتی رہتی ہیں... گھر میں ہزاروں شکھ مول  
 یہ اپنے آپ کو دکھی ہی ظاہر کریں گی۔ لیکن اگر گھر میں ذرا سا بھی دکھ ہو جائے تو جین  
 چنچ کر کہیں گی لیکن... شاید یہ بھی ٹھیک بات نہیں ہے... یہاں ان جو کچھ  
 وہ کم ہی ظاہر کرتا ہے بعض عورتیں دکھی بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ظاہر یہ کرتی ہیں کہ ہم  
 نہایت خوش ہیں اپنے غم کو چھپا چھپا کر مسکاتی ہیں۔ اور زمانے کو یقین دلاؤ  
 ... کہ اے لوگو! ہم بہت خوش ہیں۔ ہم بہت مسرور زندگی بسر کر رہے ہیں  
 جن عورتوں کے خاوند ان سے بات نہیں کرتے وہ بیماری لوگوں کو سنسن سنسن  
 یقین دلاتی ہیں کہ ہم بہت مسرور زندگی بسر کر رہی ہیں اور جن عورتوں کے خاوند  
 کے قدموں پر زندگی بچھا کر رکھنے کو تیار ہیں وہ لوگوں سے کہتی ہیں کہ بہن! کیا کر  
 زندگی کے دن پورے کر رہی ہیں۔

میں سوچتی ہوں اگر میری اس سوتیلی والدہ کی جگہ میری سگی ماں ہوتی...  
 تو وہ جاوید سے شادی کی تجویز سن کر کس قدر خوش ہو جس بلکہ وہ تو خود کو  
 کر کے شادی کو کہیں! کون ماں نہیں چاہتی کہ اس کی بیٹی خوش رہے... زندگی!

مہانے خواب کی طرح گزار دے!... اور یہ سب کچھ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو  
 آئے اور میں چپکے سے اٹھ کر باہر برآمدے میں نکل آئی۔ فرخندہ بھی میرے پیچھے  
 چلی آئی... اور میرا۔ ادا اس چہرہ دیکھ کر پوچھنے لگی۔...

باجی! آپ ادا اس کیوں ہو گئیں۔ آپ تو اتنی اچھی باجی ہیں۔ ہم آپ کو اپنی  
 بھابی بنائیں گے۔ امی رات اباجان سے کہہ رہی تھیں۔ میں نے بھی کہا تھا۔ امی  
 ہم جیلہ باجی کو بھابی بنائیں گے۔ لیکن باجی! آپ ادا اس کیوں ہو گئی ہیں؟ کیا آپ  
 لوجھیا اچھے نہیں گئے؟...

لگی لگی! میں نے پیار سے فرخندہ کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا...  
 میں نے تو تمہارے بھیا کو ابھی دیکھا تک نہیں، تو پسند اور ناپسند کا کیا سوال  
 ہے؟... اور پھر جب تم اس قدر پیاری لڑکی ہو تو کیا تمہارے بھیا پیارے نہیں  
 گئے؟... مگر فرخندہ تم ابھی چھوٹی سی بچی ہو۔ تم سنیں جان سکو گی کہ میں کیوں ادا اس  
 ہو گئی ہوں... خدا کرے تم پر ہمیشہ شکھ کا آسمان چھایا رہے... چلو چھوڑ واس  
 نصے کو... اور بتاؤ آج اسکول میں کیسے دن گزارا؟...

لیکن فرخندہ نے چل کر کہا... نہیں باجی! میری پیاری باجی! بتائیں آپ  
 ادا اس کیوں ہیں؟ آپ کے کونسا دکھ ہے؟

اور میں نے جھک کر پیار سے فرخندہ کا منہ چوم لیا۔ کتنی پیاری اور مٹھنی بچی ہے  
 ... اور پھر ہاتھ سے اس کے ماتھے پر سے بال ہٹاتے ہوئے میں نے کہا  
 فرخندہ جب تم مجھے باجی اور پھر پیاری باجی کہتی ہو۔ تو تم مجھے اتنی خوشی بخشی  
 ہو کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ تم جانتی ہو میری کوئی چھوٹی بہن نہیں ہے۔ ہاں بلو ضرور  
 ہے مگر ایک تو وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ دوسرے وہ بڑی بھی ہو گئی تو اپنی  
 ال کی بیٹی رہے گی میری بہن شاید ذہین سکے... اہم جب مجھے باجی کہہ کر لکارتی  
 ہو تو مجھے بڑا شکھ ملتا ہے... لیکن فرخندہ! ایک دور واز تک تو ہم اپنی کوٹھی  
 بنا چلے جائیں گے اور پھر تم جڑا سو جاؤ گی۔ پھر مجھے کون باجی کہے گا؟...

فرخندہ! بتاؤ کیا تم مجھے خط لکھا کرو گی؟ ...  
خط کا نام لیتے ہی ایک دم مجھے اُن ذلیل لوگوں کے خطوں کا خیال آ گیا ...  
اور پھر سوتیلی والدہ کا ... اور میں لرز اٹھی اور کہا ... لیکن فرخندہ تم خط وغیرہ نہ لکھو  
شاید امی کو یہ بات پسند نہ آئے ... بلکہ اگر تمہارا دل چاہا کرے تو تم خود ملنے  
کے لئے آ جا یا کرنا ...

لیکن باجی! کیا تم ملنے کے لئے نہ آیا کرو گی؟ امی اجازت دیں گی تو آؤں گی نا؟ یہ  
نے کہا۔ میں خالہ جان سے خود کہہ دوں گی۔ وہ ضرور اجازت دیں گے ...  
اور باجی! فرخندہ نے مجھ سے پوچھ کر کہا۔ آپ مجھے اپنی چھوٹی بہن بنا  
اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بنالیں ... اچھی باجی! آپ بہت اچھی ہیں ...

اور میں نے فرخندہ کو گلے سے لگا لیا کہ تم اب ہمیشہ کے لئے میری بہن ہو  
فرخندہ سے یوں باتیں کر کے میرا دل بڑا مسرور ہو گیا۔ اور پھر ہم دونوں  
میں بیٹھنے کو چل دیں ... اور وہاں جا کر ہم کچھ دیر بیٹھنے کے بعد بیچ پر بیٹھ گئے  
پھر فرخندہ نے مجھے اپنے بھائی جاوید کی باتیں سنانی شروع کر دیں ... کہ  
کس قدر اچھے ہیں اور وہ آپ جیسی لڑکی سے شادی کر کے بہت خوش ہوں گے  
میں نے کہا۔ فرخندہ خدا کے لئے یوں نہ کہو۔ میری امی نے یہ باتیں سنا  
تو وہ مجھے آبا جان سے کہہ جان سے ہی مروا ڈالیں گی۔ تم نہیں جانتیں کہ امی میر  
معاذے میں کس قدر سخت ہیں وہ تو آبا جان سے شکایت لگا دیں گی کہ تمہاری  
جہاں بھی دو دن کے لئے جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات پیدا کر دیتی ہے اور پھر  
نے فرخندہ کو اپنی جچی کا سارا واقعہ سنایا۔ فرخندہ بڑی سمجھ دار لڑکی تھی ... اس  
خاموشی سے ساری باتیں سنیں ...

اس کے بعد ہم خاموشی سے چل کر اپنے کمرہ میں آ گئے۔ رات بھر وہی تھی  
اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا ... امی خالہ کیساتھ باورچی خانے میں تھیں۔ بلو پنگ  
رہی تھی ... اور آبا جان ابھی تک نہ آئے تھے ... میں اپنے کمرہ میں اُن کر

چاپ کھڑکی کے آگے بیٹھ گئی کھڑکی میں سے سرو ہوا کے جھونکے اندر داخل  
ہو رہے تھے جو بڑے لمبے لگ رہے تھے۔ اپریل کا خوشگوار مہینہ تھا مگر پھر  
بھی شام کو سردی بہت زیادہ ہو جاتی۔ میں نے کوٹ نکال کر پہنا سر پر مفلر لپیٹا  
اور شال اوڑھ کر ہنگ پر نیم دراز ہو گئی اور ریڈیو اون کر دیا۔ ریڈیو جالندھر سے  
سہگل کا ریکارڈ لگا ہوا تھا جو مرزا غالب کی غزل گارہا تھا۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک  
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک  
اور میں اس غزل میں کھو گئی!!

کہاں وہ شہر کی گندری گلیاں... کہاں یہ پہاڑ کی خوبصورت اور کھلی فضا...  
 کہاں وہ گندے لوگ... مرلے لوگ اور کہاں یہ پہاڑی بے فکرے لوگ... صبحت  
 مند... یہاں امی نے ایک لوگر بھی رکھ لیا ہے اور ایک عورت بلو کو کھلانے والی  
 بھی رکھ لی ہے... اگرچہ بچے باورچی خانے کا کام کرنا پڑتا ہے مگر میں اب خوشی خوشی کام  
 کرتی ہوں... صبح مندا اندھیرے میری نیند ٹوٹ جاتی ہے بلکہ سچ پوچھو تو جب سے  
 یہاں آئی ہوں خوشی کے مارے سوئی تک نہیں... راتوں کو ستارے دیکھتی رہتی  
 ہوں۔ باغ میں پُر اسرار اندھیروں کو دیکھتی ہوں... بھولوں کی سرگوشیاں سنتی ہوں  
 اور مندا اندھیرے کمرے کا دروازہ کھول کر باغ میں نکل جاتی ہوں... اور شبنم سے  
 منہ ہاتھ دھوئی ہوں... اور ٹھٹھاتی رہتی ہوں اور پھر جلدی سے واپس آکر باورچی خانے  
 میں لوگر کی مدد سے چائے وغیرہ تیار کرتی ہوں... آبا جان کے سامنے بہت کم جاتی  
 ہوں... نہ جانے کیوں اب مجھے اُن سے بہت زیادہ ڈر گئے لگا ہے وہ بھی مجھ  
 سے کوئی بات نہیں کرتے... اُن کے سامنے میں آنکھیں پٹی کر کے بیٹھتی ہوں  
 جیسے میں کوئی چور ہوں... نہ جانے میں کیوں ایسا محسوس کرتی ہوں؟...  
 لیکن یہ آبا جان خود محسوس کرتے ہیں... وہ میری طرف جب خفگی سے..  
 دیکھتے ہیں اور بغیر بلائے مجھے دیکھ کر گزر جاتے ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں  
 کوئی گناہ گار روح ہوں اور ایسے میں میرا دل بہت دیران ہو جاتا ہے...  
 اور میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں...

امی میرے خلاف آبا جان کو نفرت کے انجکشن لگاتی رہتی ہیں... جس کا اثر  
 ان کے ریشے ریشے میں پھیل چکا ہے۔ جب میں اکیلی بیٹھی کام کر رہی ہوتی ہوں  
 اور پاس سے آبا جان گزر جائیں... تو کئی بار جی چاہتا ہے اُن کو روکوں اور اُن  
 سے پوچھوں آپ مجھ سے کیوں نہیں بولتے آبا جان؟... آبا جان میں نے کونسا  
 قصور کیا ہے؟... امی تو مکر فرماتا ہے کہ میں نے کیا... مگر آبا جان! آپ جیتے جی خدا  
 ہو گئے ہیں!! اور پھر آبا جان کے سینے کے ساتھ لگ کر گھنٹوں روتی رہوں

آج ہم اپنی کوٹھی میں آگئے ہیں...  
 یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دُور تک  
 کوٹھیوں کی قطار چلی گئی ہے...

یہ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ کھڑکی سے باہر کا منظر اتنا خوبصورت نظر آتا  
 کہ میں بیان نہیں کر سکتی... کوٹھی بے حد شاندار ہے اور چاروں طرف پھولوں سے  
 مٹی ہے۔ مگر امی یہاں اُن کو خوش نہیں ہیں... وہ کہتی ہیں۔ یہ کیا سنان اور  
 جگہ پر آگئے ہیں... اپنوں سے دُور ہو گئے ہیں ہاں بات ہے بھی ٹھیک...  
 امی اپنے ماں باپ اور بہنوں کے شہر سے نکل کر دوسرے شہر میں آگئی؟  
 پھر وہ کیوں نہ آداس ہوں؟ ان کی دل چاہی تو شادی کے بعد بھی والدین کے گھر کے  
 اندر ہی موجود ہے۔ شوہر کے گھر والوں سے یا شوہر کے گھر میں کم ہی دل چاہی لیتی ہیں  
 یہاں مجھے ایک ایسا کمرہ مل گیا ہے جس کی دونوں کھڑکیاں باغ میں کھلتی ہیں...  
 مائے امی! میں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنی خوش ہوں یہ کوٹھی پا کر! صبح کو جب اپنے  
 کمرہ کی یہ کھڑکیاں کھلتی ہوں۔ تو پھولوں سے مہکی ہوئی ہوا اندر داخل ہوتی ہے...  
 اور دُور تک... جدتہاں تک خوبصورت پہاڑیاں اور سرسبز و شاداب وادیوں  
 سلسلہ، اُپر نیلا آسمان... پھیلا ہوا آسمان... یوں لگتا ہے، جیسے میں اپنے خوابوں  
 کے جزیروں میں آگئی ہوں...

... مگر میں بھلا ایں کیونکر کر سکتی ہوں؟ ...  
 اباجان پاس سے گزر جاتے ہیں ... اور میں یہ سب کچھ سوچ کر خاموش ...  
 آنکھوں میں آنسو لئے مری جاتی ہوں ... میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟! .....

ساری رات نہیں سو سکی ... دل دھڑکتا رہا ... اور میں خدا سے دعائیں ...  
 مانگتی رہی ... یا خدا مجھے پاس کر دینا رات ہو لے ہو لے جیتی رہی ...  
 اور آخر کار صبح ہوئی ... اخبار والے کی آواز آئی ...

اور میرا دل اتنی شدت سے دھڑکا جیسے ابھی پھٹ جائے گا ...  
 اباجان کے دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی آواز آئی ... اس کے بعد خاموشی ...  
 میں نے جلدی سے بستر چھوڑا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی تاکہ  
 ادھر کی آوازوں سے اندازہ لگا سکوں کہ میں پاس ہوئی یا نہیں! ... کیونکہ صاف  
 ظاہر تھا ... اگر میں فیل ہو گئی تو اباجان کی جھڑکیوں کی آواز آئے گی اور اگر پاس  
 ہو گئی تو سنہی کی آواز آئے گی ... اباجان نے رات ہی سے میرا دل نمبر نوچھ لیا تھا  
 ... اچانک اباجان کی آواز آئی ...

لوجھیلہ بیٹی پاس ہو گئی ہے ... اور حیرانی کی بات دیکھو فرسٹ ڈوپرن میں  
 پاس ہوئی ہے ...

ماتے ان کی یہ بات سن کر جس طرح میری نگاہوں کے سامنے سے سہار  
 کے قافلے گزرے اور قوس و قزح کے رنگ بکھرے ... میں نہ بتا سکوں گی ...  
 مجھے ڈر لگا کہیں مجھے شاید مرگ نہ ہو جائے میں تیرے سے باہر نکلی اور اباجان  
 کے کمرہ کی طرف گئی ... انہوں نے دور ہی سے مجھے دیکھ کر مبارک باد دی اور

ہمیں اس کوٹھی میں آنے پندرہ بیس روز ہو گئے ہیں ... مگر فرخندہ ایک بار  
 بھی ملنے کے لئے نہیں آئی ... اور مجھے ان کے ہاں جانے کی اجازت نہیں ...  
 ہے ... فرخندہ نے تو لپکا وعدہ کیا تھا کہ پہلے ہفتے ضرور آؤں گی ... مگر وہ نہیں  
 آئی ... لیکن میں بھی کتنی لپکی ہوں ... بھلا اسے کیا ضرورت ہے آنے کی؟ ...  
 وقتی طور پر ایک دوسرے سے مل لیا تھا ... اب بعد میں اُکڑنے کی بھلا اسے  
 کیا ضرورت ہے! ... امی نے نہ جانے خالہ زینت کو کیا کچھ سکھا دیا ہوگا کہ میں  
 بہت بڑی لڑکی ہوں اور فرخندہ کو مجھ سے دوستی پیدا کرنی نہیں چاہیے ... اچھا  
 اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر میں کبھی اس سے نہ بولوں گی ... میں خاموش ہو جاؤں  
 گی ... میں اس دنیا میں ایکی آئی ہوں ... اور اکیلی ہی چلی جاؤں گی ...

رات اباجان نے بتایا کہ تمہارا بیچہ کل نکل رہا ہے ... یسٹن کر میرا دل دھڑکنے  
 لگا ... اگر میں فیل ہو گئی تو اباجان کس قدر خفا ہوں گے ... امی طرزیہ نہیں بنیں  
 گی اور میری زندگی کتنی دیران ہو جائے گی ... خالہ زینت کو تپ چلے گا ... تو وہ مجھ  
 سے نفرت کرنے لگیں گی ...

یا خدا! مجھے پاس کر دینا ... تمہارے سوا اور کوئی میری بات سننے والا نہیں ...

آپ ہیں کہ سچی منہ چھپانے۔ اتنے میں خالہ زینت کو پتہ چلا... وہ بھی اگلیں...  
جاوید کہنے لگا... لو... اگر یہ پردہ کرتی ہیں تو پھر ہم بھی پردہ کریں گے...  
اور پھر اس نے فرخندہ کا دوپٹہ لیکر گھونگھٹ نکال لیا...  
خالہ زینت کہنے لگیں... یہ بے ہی ایسا مسخرا... بات کیا ہے فرخندہ...  
بیٹی جمیلہ! بھلا پردے کی کیا ضرورت ہے تمہارے پاس ہونے کی خبر نہ کر پج مجھے تو  
بے اندازہ مسرت حاصل ہوئی ہے... اور پھر تم فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی  
ہو!...

جاوید کہنے لگا... ہم نے تو بڑی مشکل سے تھرڈ ڈویژن لی تھی...  
خالہ کہنے لگیں... کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ تم تو اپنی کلاس میں فرسٹ آئے تھے  
اور خالہ کا سر فرسے اونچا ہو گیا... اور پھر میں جاوید کے سانسے ہو گئی...  
خالہ کسی کام سے اُدھر گئیں تو فرخندہ بھی، ابھی آئی، لیکر بھاگ گئی...  
اب میں اور جاوید اکیلے رہ گئے... میرا دل دھڑکنے لگا... یا خدا! کہیں ہماری نوکرائی  
بلوکوے کرنا آجائے۔ وہ اسے باہر بندر کا تماشا دکھارہی تھی... اور ابھی تک  
اندر ہی نہ آئی تھی...۔

جاوید میرے سامنے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا... اور مجھے گہری نظروں سے  
تک رہا تھا...  
ہم دونوں خاموش تھے...  
میر کی نظر میں بچی تھیں... اور شرم سے دوہری ہوئی دوپٹے کے پلو کو انگلیوں  
میں سرور رہی تھیں...  
آخر جاوید بولا...

جد ہے آپ اس قدر شرم رہی ہیں... آپ کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔ آپ ذرا ٹھیک  
طرح بیٹھیں... آپ تو کالج میں پڑھنے والی لڑکی ہیں... اور کالج کی لڑکیاں تو اس قدر  
نہیں شرماتی... مگر میں خاموش رہی... کچھ دیر کے بعد میں نے انگلیوں سے پلو نکال

جب میں اندر گئی تو انہوں نے مجھ سے لگایا اور میل سر جوڑ لیا... امانی  
بھی مبارکباد دی... میرے تو نصیب کھل گئے...  
یقین نہ آتا تھا... کہ آج کا دن اتنا خوش قسمت بھی ہو سکتا ہے! آج کون سا  
طلوع ہوا ہے جس نے مجھے یوں خوشی بخشی ہے!...  
میں نے کہا... آبا جان اور امانی جان!... آپ لوگوں کی دعاؤں کی بدولت ہی  
مجھے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ورنہ میں کہاں اس قابل تھی؟...  
اسکے بعد میں نے آبا جان سے اجازت لے لی تھی... اور بھئی بکو کو ساتھ لیکر تیار  
ہو کر خالہ زینت کے ہاں گئی۔ امانی نے جانے کی اجازت دے دی... آج تو  
امنی بھی مجھ پر مہربان ہو گئیں...

وہاں پہنچی تو فرخندہ ہمارے یہاں آنے کو تیار ہو رہی تھی... اُدھ گھنٹے کا تو  
راستہ تھا... مجھے دیکھتے ہی مجھ سے لپٹ گئی میں نے کہا... چلو مٹو اب منہ دیکھو۔  
محبت جتانے لگی ہو... ایسی ہی باجی سے محبت ہوتی... تو اتنے روز ہو گئے ہیں تمہنے  
نہ آئیں!...

کہنے لگی... ہاں باجی! یہ نہ کہو... میں تو ہر روز آپ کو یاد کرتی تھی مگر بھیا آنے  
والے تھے اور میں چاہتی تھی کہ وہ آجائیں تو ان کے ساتھ آپ کے گھر آؤں...  
اب وہ اپنے کمرے میں تیار ہو رہے ہیں... ہم دونوں اکٹھے ہی آپ کے  
گھر جا رہے تھے۔ آپ کو مبارکباد دینے کے لئے... میں نے اسکول سے چھٹی لے  
لی ہے... اسے لود لیجھو... بھیا تو میاں آگئے ہیں... بھیا! یہ ہیں ہماری باجی جمیلہ  
... اور یہ ہیں ہمارے بھیا جاوید!...

میں یوں بے باکی سے کسی غیر مرد کے سامنے کیسے ہو سکتی تھی ہم کو تو سخت پردے میں  
رکھا جاتا ہے... میں نے بڑی مشکل سے سلام علیکم کہا... اور پردہ کر لیا۔ فرخندہ  
نے جلدی سے میرا دوپٹہ کھینچا۔ واہ باجی! آپ بھی کمال کرتی ہیں... بھلا اپنوں  
سے بھی کہیں پردہ کیا جاتا ہے... ہم تو میاں آپ کی تعریفیں کر کر کے مر گئے اور

کر پھڑ دیا، اور میری پڑی ہوئی کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔ یہ انگریزی کی بڑی موٹی کتاب تھی۔

جاوید کہنے لگا... یہ تو ڈاکٹری کی کتاب ہے۔ آپ کی سمجھ میں کہاں آئے گی...

اور میں نے کتاب میز پر رکھ دی...  
جاوید کہنے لگا... لیکن میرا یہ مطلب تو نہ تھا کہ آپ اسے رکھ دیں...

اس کے بعد پھر خاموش چھائی رہی... جاوید اٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا... اور باہر دیکھنے لگا... اور میں نے چور نظروں سے اسے دیکھنا شروع کر دیا... درمیانہ قدر... چوڑے شانے... مضبوط جسم... اور خوبصورت چہرہ... وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھا رہا تھا... یوں لگتا تھا جیسے کوئی یونانی دیوتا ہے وہ مجھے بہت اچھا لگا... اس کے چہرے پر ایک اداس چمک تھی۔ بہت زیادہ کھلا ہوا چہرہ تھا مگر چمک اداس تھی۔ اچانک اس نے میری طرف دیکھا... اور اپنی محمور اور شرمیلی آنکھیں میرے چہرہ پر گاڑ دیں اور کہا... آپ چوری چوری مجھے دیکھ رہی تھیں... اور یہ چوری اچھی نہیں!... مگر میں خاموش تھی...

میں نے ابھی تک اس سے کوئی بات نہ کی تھی...

پھر جاوید کہنے لگا... ادھر آئیے... آپ کو باہر کا ایک تماشہ دکھاؤں۔ اور میں چپکے سے اٹھی اور اس کے ساتھ کھڑکی میں لگ کر کھڑی ہو گئی... اب ہم دونوں پاس پاس کھڑے تھے... اور اس کا گرم گرم سانس میرے چہرے کو چھو کر گزر رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر کہا...

کیا ہے؟

وہ دیکھو باہر!

کیا دیکھوں باہر؟

وہ سامنے سپاڑا آپ دیکھ رہی ہیں؟

ہاں ہاں! دیکھ رہی ہوں...

کیا اس کے اوپر پڑے ہوئے پتھر پر آپ کو بیٹھا ہوا آدمی نہیں معلوم

ہو رہا؟...

ہاں... ایسا لگتا ہے جیسے کوئی آدمی ہے...

آدمی ہی تو بیٹھا ہے...

اچھا! لیکن اتنی بلندی پر کیسے پہنچ گیا؟...

کیا آپ نے اسے سپانا نہیں؟

نہیں تو...

پہلے میری طرف دیکھیں اور پھر اسے دیکھیں...

اور میں نے جاوید کی طرف اپنا چہرہ اٹھا دیا...

جاوید مجھے دیکھنے لگا...

میں اس کی طرف زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکی... اور آنکھیں پٹی کر لیں...

یہ میں ہی تو ہوں جو سپاڑا کی اس چوٹی پر بیٹھا ہوں اور چوٹی تک پہنچنے کا راستہ بھی کوئی نہیں ہے... اب تب ہی اگر آپ مجھ سے ملنے آئیں تو وہاں تک کیسے پہنچیں گی...

لیکن آپ وہاں تک کیسے پہنچ گئے؟...

میں تو پیدا ہی وہاں ہوا تھا...

اور یہاں کون کھڑا ہے؟

یہاں میں کھڑا ہوں۔

اور وہاں کون بیٹھا ہے؟

وہاں جاوید بیٹھا ہے۔

اور ہم دونوں ہنس دیئے...

لیکن مجھے یقین تھا کہ امی تو بظاہر مان جاہیں گی مگر آبا جان کبھی نہ مانیں گے...  
 خالہ کے سامنے امی ہاں کہہ دیں گی مگر آبا جان سے خود کہہ کر آنا ہوگا!... اور  
 وہ بواور نوکرانی کے ساتھ چلی گئیں... اب میں فرخندہ اور جاوید رہ گئے...  
 فرخندہ کہنے لگی۔ چلو باجی! باغ میں چل کر تیلیں پھڑپھڑائیں۔  
 میں نے کہا۔ جب تک خالہ نہ آجائیں۔ میں فکر مند ہوں اور سہیں بیٹھوں گی۔ اگر  
 اجازت مل گئی تو پھر باہر باغ میں جا کر خوشی منائیں گے... آج کل راتیں بھی چاندنی ہیں  
 واہ ابھی آپ بہت جلد گھبرا جاتی ہیں... بھلا وہ آپ سے کیا کہیں گے! آپ

بہت زیادہ ڈرتی ہیں...  
 میں شرمندہ سی ہو گئی۔ میں اس سے کیا کہتی کہ تم کی جانو فرخندہ! مجھے اپنی اجی  
 اور آبا سے کس قدر ڈر لگتا ہے! میرے لئے زندگی بیل کے سینے میں چھپا ہوا کانٹا ہے  
 اور تمہارے لئے زندگی سہارا میں مہکنے اور کھٹنے والا پھل ہے... تمہارے لئے زندگی  
 دلچسپ کہانی ہے... مگر میرے لئے زندگی غم کی کالی لمبی رات ہے...  
 میں ان لوگوں سے بہت ڈرتی ہوں... کیونکہ تمہارے جیسے ماحول میں رہنے  
 والی لڑکیوں کی تقدیریں ان کے ہاتھ میں ہوتی ہیں... ہم ان کے رحم و کرم پر ہیں... یہ  
 جو چاہیں کر سکتے ہیں...

پھر ان سے میں کیوں نہ ڈر دوں؟... لیکن میں خاموش ہو گئی... ماحول کا یہ تضاد  
 دیکھ کر میرا دل اُداس ہو گیا تھا۔ اور میرا چہرہ اتر گیا تھا... مجھے پتہ تھا کہ خالہ جان امی  
 اور آبا کو مانا بھی آئیگی تو بھی ان کا غدا مجھ پر نازل ہوگا... گھر کا کام کون کرے گا  
 امی کہیں گی۔ جان بوجھ کر وہاں بیٹھ گئی اور خالہ کو سکھا کر بھیج دیا۔ اور آبا جان کو بعد میں  
 نمک مریخ لگا کر سکھائیں گی۔ امی تو پہلے ہی چاہتی ہیں کہ خالہ مجھ پر محبت کی نظر نہ ڈالیں...  
 پتہ نہیں کیا ہو؟...

ایک جی چاہتا تھا... بغاوت کر دو... اور ایک ہفتہ میاں رہو اور زندگی سے جی  
 بھر کر لطف اندوز ہو...

اتنے میں فرخندہ امی اور ہم چائے پینے کے لئے دوسرے کمرے میں چلے گئے  
 میں نے بواور نوکرانی کے سامنے جاوید سے پردہ کیا۔ اس کے بعد وہاں  
 باتیں ہوتی رہیں... جاوید چائے پینے کے بعد اٹھ کر چلا گیا اور ہم وہیں بیٹھے  
 منتے رہے۔ شام ہو گئی... میں جانے کے لئے تیار ہوئی... تو خالہ زینت  
 کہنے لگیں کہ میں آج تو نہیں جانے دوں گی... اب ایک ہفتہ تو میاں رہو  
 میں یہ سن کر پریشان ہو گئی۔  
 مگر خالہ جی! امی جان خفا ہوں گی۔

نہیں۔ وہ کیوں خفا ہوں گی... یہ بواو کو لیکر جائے گی تو میرا پیغام پہنچا دے  
 گی...  
 مگر آبا جان نہیں مانیں گے... آپ مجھے اب اجازت دے ہی دیں...  
 نہیں بیٹی! آج تو نہیں جانے دوں گی... ایک ہفتہ کے بعد جانا ہوگا...  
 لیکن مجھے امی اور آبا سے بہت ڈر لگتا ہے...  
 خالہ جان کہنے لگیں... کتنی بھولی بچی ہے... تم نہ ڈرو میں خود جا کر ان سے  
 کہہ آؤں گی۔

لیکن خالہ جان! آپ مجھے ساتھ لے چلیں۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی  
 تو آپ کے ساتھ واپس آ جاؤں گی...  
 لگی بیٹی! تم کیوں گھبراتی ہو؟ یہیں بیٹھو، میں خود جاؤں گی وہ کبھی خفا نہ ہوں گی...  
 اور اگر خالہ وہ خفا ہو گئیں تو پھر آپ کی ذمہ داری ہوگی۔  
 ہاں ہاں... تم مجھ پر رہنے دو...

ہائے میں تو خود گھر نہیں جانا چاہتی تھی... میرے لئے اس سے زیادہ اچھا  
 اور کوئی بات تھی؟... کہ وہاں رہوں جہاں خوش بختی ہے۔ فرخندہ رہتی ہے  
 جاوید کے سانوں کی عیب ہے... پھول ہیں اور ستارے ہیں...  
 گھر جا کر مجھے کیا کرنا تھا؟... کاش! میں ہمیشہ یہیں رہ سکتی!...



دوسرا جی چاہتا تھا کہ جب پھر اسی قفس میں چلے جانا ہے... اور اُداس دن گزارنے میں تو ان خوشی کے دنوں کو، چند لمحوں کو کیا کرنا ہے خوشی تو وہ ہوتی ہے... جو ہمیشہ کے لئے مل جائے... یہ وقتی اور مانگی ہوئی خوشی تو مجھے اور بھی اُداس کر دے گی...

پھر جب خوشیوں کے اس ماحول سے نکل کر وہاں جاؤں گی۔ تو وہاں کی تنہا اور بھی کاٹ کھانے کو دوڑے گی... لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا... ننھا سا دل لرز رہا تھا... اور ننھا سا دل خوشی سے جھوم بھی رہا تھا... فرخندہ باغ میں چلی گئی... میں کمر میں اکیلی رہ گئی... جاوید باہر سے سیلا بجاتا آیا... اور میرے پاس بیٹھ گیا...

آپ اُداس کیوں ہو گئیں؟

نہیں تو... اُداس تو نہیں ہوں!

تو پھر خاموش کیوں ہیں؟ فرخندہ اور امی کہاں ہیں؟

فرخندہ باہر ہے اور امی ہمارے گھر گئی ہیں۔

کیوں؟

ابا جان سے اجازت لینے کے لئے کہ میں یہاں ایک ہفتہ تک رہوں گی۔

آخا! پھر تو بڑے مزے میں دن گزریں گے۔

لیکن مجھے ڈر ہے۔ ابا جان اجازت نہ دیں گے۔

”کیوں...؟“

بس وہ میرا کہیں بھی جانا پسند نہیں کرتے... اور یہ کہہ کر میں اُداس ہو گئی!

آپ اُداس ہو گئی ہیں...

میں چپ رہی...

آپ اتنی اُداس نہ ہوں... امی ضرور اجازت لے آئیں گی... لیکن وہ آپ کو اجازت کیوں نہیں دیتے؟...

بس وہ پسند نہیں کرتے آنا جانا...

جاوید خاموش ہو گیا...

لیکن آپ تو ان سے کہہ سکتی ہیں نا... کہ میں رہتا جا چکی ہوں...

میں پھکی سی سنہی سنہی دی... میں بھلا کیسے کہہ سکتی ہوں۔

کہیں نہیں کہہ سکتیں؟...

ہمارے گھروں میں لڑکیوں کو کوئی اختیار نہیں ہوتا...

جہاں لڑکیوں کو بات تک کرنے کا اختیار نہ ہو... وہاں لڑکیاں اپنا حق خود حاصل کرتی ہیں...

لیکن اگر میری اپنی امی ہوتیں تو پھر آپ نہ ہوتا...

لیکن آپ ان سے بھی کہہ سکتی ہیں...

سنہیں میں نہیں کہہ سکتی... اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میرا دل بھر آیا

راؤ وار کاٹ سکی گئی...

آپ تو ٹنگیں ہو گئیں... یوں لگتا ہے جیسے آپ بہت رنجیدہ رہتی ہیں... دیکھیں

آپ کا پھل سا چہرہ کسلا جا بیگا آج تو آپ کو ضرور اجازت مل جائے گی۔ کیونکہ

آج تو آپ پاس ہوئی ہیں نا... پچ! آپ بڑی قابل لڑکی ہیں... اتنے شاندار

رہتے ہیں...

آپ سے زیادہ قابل تو نہیں ہوں؟

اچھا لائیے میں آپ کا ہاتھ دیکھوں...

آپ کو کچھنا آیا ہے؟

ہاں ہاں اکیوں نہیں... کسی زمانے میں میں بخوبی بھی رہا ہوں...

اور کیا کیا رہے ہیں؟

پہلے ہاتھ دکھائیے... پھر بتاؤں گا...

میں نے اپنا ہاتھ کھول کر اس کے آگے کر دیا...

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

آپ کا ہاتھ تو بڑا گرم ہے... درزن عام طور پر لڑکیوں کے ہاتھ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں...

آپ نے لڑکیوں کے ہاتھ دیکھے ہوں گے... ہاں نجومی رہا ہوں... اس لئے دیکھنے ہی پڑتے تھے... گرم ہاتھ محبت کی نشان دہی کرتے ہیں...

جاوید کی یہ بات سن کر میں مسکادی... جاوید کہنے لگا... تمہارے ہاتھ میں بہت دولت کھپی ہوئی ہے... تمہیں کسی محبت بھی ہو جائے گی... اور بچے تو بیٹا رہیں... کوئی ایک سو کے قریب!!... چلو شکریہ چار سو بیس کے قریب تو نہیں ہیں نا!... یہ کہہ کر ہم دونوں ہنس دئے...

اور جاوید نے میرا ہاتھ زور سے دبا یا... اور کہا... اگر محبت ہے تو چھڑا کر! اور میں نے زور لگانا شروع کر دیا... مگر ہاتھ نہ چھوڑا... میں نے کہا... خدا کے لئے میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے... کوئی آنہ جائے... یہاں آپ بے فکر ہو کر رہیں... یہاں کوئی نہیں آتا... لیکن اب میں ہاتھ نہیں چھوڑوں لگا... اب ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا... میں خاموش ہو گئی... اور چھڑا کی کوشش چھوڑ دی جاوید مجھے دیکھ رہا تھا اور میں صوفے سے ٹیک لگائے بیٹھ گئی اور کبھی کبھی مسکراتی ہو کر اسے دیکھنے لگ جاتی! اسے دیکھتی تو یوں لگتا جیسے یہ کوئی میرا اپنا ہی بیٹھا ہے اسے دیکھ کر مجھے سا بھی اجنبیت کا خیال نہیں آ رہا تھا... وہ مجھے بالکل اپنا جانا پہچانا معلوم آ رہا تھا...

تھوڑی دیر کے بعد خالہ آگئیں... فرخندہ ماسٹر سے پڑھنے چلی گئی تھی... میں جلدی سے خالہ کے پاس پہنچی... خالہ کہنے لگیں... بڑی مشکل سے اجازت لیکر آئی ہوں امی جان تو مان گئیں...

اب نہیں مانتے تھے... فرخندہ بھی ماسٹر سے پڑھ چکی تھی... بھاگی بھاگی آئی اور خوشی سے مجھ سے چمٹ گئی... میں بھی بہت خوش ہو گئی اور گھر بار سب کو بھول گئی۔ یہ لوگ کس قدر اچھے ہیں مجھ سے کس قدر پیار کرتے ہیں... حالانکہ امی نے نہ جانے خالہ کو کیا کیا باتیں بتائی... ہل گئی مگر خالہ مجھ پر اسی طرح مہربان ہیں... یہ خیال کہ یہ پورا ہفتہ میں یہاں گزار دل لیا... مجھے کس قدر خوشی بخش رہا تھا!!

جاوید بات بات پر ہنس رہا تھا۔ ادویوں محبت سے میری طرف دیکھتا جیسے میری روح کھینچ کر باہر نکالے گا، میرا دل دھڑکنے لگتا اور میرے انگ انگ میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ راستے میں جاوید نے گانا سنا یا... اس کی آواز نے اس کے چہرے سے زیادہ مجھے مسحور کیا۔ اس کی آواز پہاڑوں کے دل چیرتی نکل گئی... مجھے کبھی خیال بھی نہ تھا کہ جاوید اس قدر اچھا گاتا بھی ہوگا۔

فرخندہ نے بھی گانا سنا یا... وہ مجھے بھی کبھی رہی کرتی تھی سناؤ مگر میں کیا سناتی تھی۔ میں نے کبھی گایا ہی نہ تھا۔ زندگی نے مجھے کبھی گانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ ہم کچھ ہی آگے گئے تھے کہ فرخندہ کو نیند آنے لگی!

جاوید کہنے لگا۔ چلو فرخندہ کو چھوڑ آتے ہیں... اور ہم اور آگے جائیں گے ابھی ہم گھر سے دوڑ نہیں آئے تھے۔ رات کے نو بج چکے تھے... فرخندہ کو گھر چھوڑ کر ہم باہر نکل آئے... ٹھنڈ زیادہ سہو رہی تھی اور مجھے کوٹا میں سردی محسوس ہو رہی تھی... جاوید نے میرا ہاتھ پکڑا تو بہت ٹھنڈا تھا... کہنے لگا...

آپ تو سردی سے کانپ رہی ہیں... آپ کے ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے ہیں میں نے کہا... نہیں! بس یونہی ہو گئے ہیں... ابھی چلوں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔ لیکن جاوید آگے نہ گیا۔ ہم وہیں ایک طرف چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف چاندنی چھائی ہوئی تھی...

پہاڑوں پر چاندنی رات اتنی خوبصورت ہو جاتی ہے؟... اس کا مجھے کبھی علم نہ تھا... اور پھر اس وقت جبکہ جاوید بھی میرے پاس تھا... جس کو دیکھتے ہی مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی... پھر چاندنی رات کیوں نہ حسین ہو جاتی؟!... ان پانچ چھ گھنٹوں کی ملاقات میں ہی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں جاوید کو ہمیشہ سے جانتی ہوں وہ مجھے کبھی بھی نہیں پکڑا تھا... اچیت کا کوئی خیال نہیں تھا۔

ہم دونوں کتھی ہی دیر تک وہاں خاموش بیٹھے رہے۔ جاوید نے میرا سر اپنے

پورا ہفتہ بیت گیا... زندگی کے سات دن اور گزر گئے... مگر یہ محض سات دن نہیں گزرے... خوشی کا ایک رنگ اور سہانا زمانہ تھا، جو پلک بچکنے میں بیت گیا... میری زندگی کا یہ ہفتہ... میں اسے عمر بھر نہ فراموش کر سکوں گی... یہاں محبت نے پہلی بار میرے دل میں آنکھ کھولی ہے! اور اب جبکہ میں اس گھر جا رہی ہوں... میرا دل اُداس بھی ہے اور مسرور بھی... کبھی کبھی میں سو کرتی تھی کہ میرا اپنا گھر کہاں ہے؟ خوشی سے بھرا ہوا گھر... اس دنیا میں کہیں ہے ہم نہیں!... سات دن رہ کر میں نے اپنے مال باب کو پالیا تھا، اپنے سہن بھائی کو پالیا تھا... اپنے محبوب کو پالیا تھا... اپنے گھر کو پالیا تھا... اپنی خوشی کو تھا...

اسی شام جب امی نے رہنے کی اجازت دے دی... تو زندگی ایک رنگین خواب بن کر سامنے آگئی... رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد فرخندہ اور جاوید سیر کو چل دئے...

چاند کا سہ کالے پہاڑوں کے پیچھے سے لیوں ابھر رہا تھا۔ جیسے ز کی دیواروں میں گھری ہوئی کوئی فہرادی سیاہ لباس پہنے باہر جھانک ہو۔ مباحث معمول خوشیوں سے بھری ہوئی تھی اور ہم سیر کو جا رہے تھے

سینے کے ساتھ لگایا۔ اور ہونے ہوئے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔  
میرے رخساروں پر ہاتھ پھیرنے لگا... مجھ پر ایک سحر طاری ہونے لگا۔ ایسا  
جو کلی کو چٹکنے پر مجبور کرتا ہے...

جاوید کہنے لگا۔ جیلہ!... میں سوچتا ہوں۔ ہم لوگ کیسی عجیب زندگی رہا  
ہیں... زندگی کتنی دل چسپ اور پیاری چیز ہے مگر لوگ اس سے بالکل نا آشنا  
وہ زندگی کی قدر و قیمت بالکل نہیں جانتے... وہ زندگی یوں بسر کرتے ہیں جیسے  
کوئی سزا جھگت رہے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے میں بڑی حین اور خوبصورت اور صحت  
زندگی بسر کروں۔ اور لوگوں کو زندگی کا پیغام دوں۔

سہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی طرف بلاؤں۔ اور  
زندہ رہنے کا سبق پڑھاؤں۔ مجھے سہاڑوں کی یہ پڑاسرار خاموشی... یہ چانا  
... یہ سر پر نیلا آسمان یہ سب کچھ اتنا پسند ہے کہ میں بتا نہیں سکتا... میرا  
ہے... میں اپنی ساری زندگی یہیں بیٹھے بیٹھے گزار دوں اس خوبصورت  
رات میں تمہارے پاس بیٹھ کر مجھے زندگی سے اور زیادہ پیار ہو گیا ہے۔  
طرف جیلہ! آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھو... لیکن مجھ سے آنکھیں نہ کھول  
پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔

میں خاموش آنکھیں بند کئے، اس کے سینے کے ساتھ جی بیٹھی رہی  
نہیں جانتی تھی کہ یہ ظلم ٹوٹے مگر وہ سو رہی تھی... پھر ہم دونوں گھر آ گئے  
کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چل دئے... ساری رات رنگین خواب  
دوسری صبح کو آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ چکا تھا۔ میں جلدی سے اٹھی،  
اور ناشتہ کیا۔ پتہ چلا۔ جاوید ابھی تک سو یا ہوا ہے... میں اور فرخہ  
اٹھانے چلے... فرخہ نے اسکول سے آج بھی چھٹی لے لی تھی...  
ہم نے باہر اسے بلایا۔ فرخہ کہنے لگی۔ بھیا! جلدی سے اٹھو  
دیر کیوں لگا دی؟ مگر بھیا صاحب کوٹ بد کر پھر سو گئے...

بھیا! صبح کے دس بج گئے ہیں۔ آپ کب اٹھیں گے؟... دیکھئے جیلہ باجی  
میں آپ کو بلارہی ہیں... میرا نام سنتے ہی اس نے سیدھے ہو کر نیند سے بھری ہوئی  
شرابی نیم دا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور منکا دیا...  
اب تو اٹھنا ہی پڑے گا... ادھر یہ بکر جاوید بستر سے نیچے اتر آیا۔

پھر وہ پھر کو اکٹھے کھانا کھایا...  
جاوید کہنے لگا۔ جیلہ پاس ہوئی ہے۔ آج رات ہم اس کی دعوت کریں گے  
... اور اسے پھولوں کی خنزا دی بنائیں گے  
رات کو بڑی شاندار دعوت ہوئی... فرخہ نے اپنی سہیلیوں کو بھی بلایا...  
اور مجھے خانہ نے تحفے میں ایک شاندار ساڑھی دی... جو میں نے رات کو پہنی اور  
جاوید نے پہن دیا۔ فرخہ نے انگوٹھی دی اور جاوید پھولوں کا زیور لے آیا۔  
میرے سر پر گلاب کے سبز شکوفوں کا تاج پہنایا گیا گئے میں ہار ڈالے گئے،  
گجرے پہنائے گئے اور بہت سے پھول بالوں میں لگائے گئے۔  
رات کو فرخہ کی سہیلیوں نے ڈھولک بجا کر، گیت گائے اور گیارہ بجے تک  
ایک ہنگامہ رہا...

اور جاوید مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا...  
اب سو جیتی ہوں تو یہ گزرا ہوا ہفتہ خواب کی طرح لگتا ہے!  
اور رات کو... جب سب چلے گئے، گھر والے سو گئے... تو جاوید مجھے  
باہر ان میں لے گیا... اور ہم بیچ پر بیٹھ گئے۔

درختوں کی پڑتھک چھاؤں سے ہم بیچ پر بیٹھے تھے۔ جاوید کہنے لگا۔ پھولوں  
کی خنزا دی! مجھے بتاؤ... کیا تم مجھ سے پیار کرتی ہو؟ دیکھو میری طرف!... زندگی  
کی ان خوبصورت راتوں کو بغیر پیار کئے مانع نہ کرو۔ میری طرف دیکھو اور مجھے بتاؤ۔  
کہ یہ تم نے ایک ہی روز میں مجھ سے کیا کر دیا ہے؟... میرا جی چاہتا ہے... میں نہیں اپنے  
سینے کے ساتھ لگانوں اور ساری زندگی تو یہی سینے کے ساتھ لگائے بیٹھا رہوں...

اور یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے ساتھ لٹکایا... اور مجھے نیند سی آنے لگی اور میری آنکھیں بند ہونے لگیں... اور پھولوں کی ٹہنزدی!... اپنے محبوب کے کنارہ اور ہونٹوں پر سر رکھے خواب دیکھنے لگی!...

اس رات جاوید نے پہلی بار میرے ہونٹوں کو چومنا اور میرا سارا جسم یوں لڑا تھا جیسے پھول کو توڑتے وقت سلیکی ٹہنی کا پتہ اٹھتی ہے۔ ہم وہاں کوئی ایک گھنٹہ تک بیٹھے رہے۔ اس کے بعد سردی زیادہ بڑھ گئی اور ہم واپس پلٹ آئے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں اپنے کمرے میں...

میں نے کپڑے بدلے اور لستر پر دراز ہو گئی مگر نیند نہ آئی... ایک نشہ تھا مجھ پر چھایا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا... جیسے خواب دیکھ رہی ہوں... غرضیکہ پورا ہفتہ اسی محبت اور پیاریں گزر گئیں... خالہ کہنے لگیں۔ میں تمہیں بہت جلدی اپنی بنالوں کی اور جب میں آنے لگی... تو جاوید کس قدر اس تھا میرا اپنا دل دیران رہا تھا۔ زندگی کا سہانا خواب پلک جھپکنے میں بیت گیا... کاش! اس خواب میری نیند کبھی نہ ٹوٹتی جاوید پندرہ روز کی چھٹی پر آیا ہوا تھا رخصت کے وقت اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں اُسے ضرور خط لکھوں اور یہ کہ وہ مجھ سے ملنے کیلئے ہمارے گھر آئے گا... لیکن میں ڈر رہی تھی... میں اسے کیونکر خط لکھ سکتی تھی!...

اگر امی کو پتہ چل گیا... تو کیا کچھ نہ ہوگا؟... ہائے! میرا ذرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں یہاں سے جاؤں۔ چلتے وقت میری آنکھوں میں آنسو بھی آگئے!... لیکن مجھے آنا ہی پڑا...

زندگی کا حین خواب بیت گیا تھا۔ ادراپ میں تلخ حقیقتوں کی طرف آ رہی تھی میں نے خالہ سے کہا۔ آپ مجھے خود چھوڑ کر آئیں۔ خالہ میرے ساتھ آئیں جاوید کو خدا حافظ کہا۔ فرخندہ سے رخصت ہوئی اور بوجھل اور سست قدموں گھر کو روانہ ہو پڑی۔ ایک قدم گھر کی طرف اٹھاتی تھی تو چار قدم پیچھے کو پلٹ جاتا تھے۔ راستہ میں خالہ باتیں کر رہی تھیں اور میں اٹے سیدھے جواب دے رہی تھی یا

ان کر مجھے پتہ چلا تھا... کہ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔

گھر پہنچی۔ امی سے ملی۔ بھوکو گود میں لیا۔ خالہ امی کے پاس بیٹھی رہیں... پھر وہ رخصت ہو گئیں اور دوبارہ ان کو دروازے تک چھوڑ کر امی کے پاس آگئی... میں نے امی کو سڑھی، انگوٹھی اور پین دکھایا۔ امی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ میرا دل کانپ اٹھا۔ امی نے کہا۔ یہ چیزیں تم نے خالہ کے سامنے کیوں نہ دکھائیں ہاں کو لینے کی کوئی ضرورت نہ تھی...

اور دوسرے روز امی نے وہ چیزیں ان کو واپس بھجوانے کے لئے اپنے پاس رکھ لیں... میں کتنی ہی دیر تک امی کے پاس بیٹھی رہی مگر امی نے کوئی بات نہ کی...

بھوکو گود میں لینا چاہتا تو امی کہنے لگیں۔ رہنے دو اسے! امی کا مود تلخ سے تلخ تر ہو رہا تھا... اور میرا دل ڈوب رہا تھا... آخر میں نے کہا۔ امی! آپ چپ چپ کیوں ہیں؟... تمہیں مجھ سے کیا؟...

کیوں امی؟... آپ تو میری امی ہیں... وہاں تمہیں اس لئے نہیں بھیجا تھا... کہ تم جا کر بیٹھ ہی جاتیں... اب کیا کرنے آئی ہو؟ اب بھی وہیں چلی جاؤ! بھلا کہیں کنواری لڑکیاں بھی دوسروں کے گھر ماں باپ کے بغیر رات بسر کرتی ہیں؟ تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تھا تو میری ہی عزت کا خیال کر لیا ہوتا...

لیکن امی! آپ نے اجازت دی تھی تب ہی تو میں رہی تھی نا؟ تو کیا اجازت نہ دیتی۔ جب تم نے خالہ کو سکھا کر بھیج دیا! امی! میں نے تو خالہ کو نہیں سکھایا تھا۔ وہ تو خود کبھی تھیں اچھا!... اب آئندہ سے نہیں جاؤں گی!... مجھے کیا، جاؤ یا نہ جاؤ... کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے بغیر گھر کا کام نہ ہو سکتا؟

اور اُداس!... میرے آنسو خشک تھے مگر میرا چہرہ رور رہا تھا... مجھے بھلا کس پر ہان تھا؟ اپنی امی ہوتی تو اس کے سینے سے چمٹ کر کبھی۔ امی! میری ابھی شادی نہ کرو اور اگر میری شادی کرنی ہے تو پھر وہاں کرنا، جہاں میں تم سے کہو گی... میں نے اس امی کو کچھ نہ کہا اور مجھے کہنا بھی کیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور تھکی دی تو آنسوؤں کا بند ٹوٹ گیا... اور میں اُن کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی... امی کہنے لگیں... میت روتی بیٹیوں کو آخر ایک نہ ایک دن اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے، آخر کب تک تم یہاں رہ سکتی ہو!... ایک نہ ایک روز تمہیں جانا ہی ہو گا۔

امی! میں نے روتے ہوئے کہا... پیاری امی! میں ایک نہ ایک روز چلی جاؤں گی مگر ابھی میری شادی نہ کریں۔ میں اگر ہمیشہ آپ کے پاس نہیں رہ سکتی، ہمیشہ اس گھر میں نہیں رہ سکتی تو آپ کچھ روز اور مجھے یہاں رہ لینے دیں! پیاری امی! میں آئندہ آپ کی ہر بات مانوں گی... میں خالہ کے یہاں بھی نہیں جاؤں گی!...

لیکن امی کہنے لگیں... رات کو تمہارے ابا! ایک گے۔ تم اُن سے بات کر لینا... میری تودہ نہیں ہاں گے...

نہیں امی! میں ابا سے کبھی بات نہ کر سکوں گی۔ میں ان کو کچھ نہ کہہ سکوں گی... آپ ہی کو ان سے کہنا ہو گا... میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں امی!... امی! آپ مجھے لمبکی استانی سمجھ کر ابھی رکھ لیں... اور دو تین سال کے بعد میری شادی کریں... مجھے ابھی شادی نہیں کرنی...

امی کہنے لگیں... اچھا۔ تمہارے ابا سے بات کر دوں گی... وہ لڑکا بڑا اچھا ہے، بنگ میں نوکر ہے، تین سو روپیہ تنخواہ ملتی ہے بی۔ اے پاس ہے، ٹھیک دمورت کا بھی اچھا ہے... اور نیک شریف بھی ہے، اپنے والدین کا سب سے بڑا لڑکا ہے۔ باقی تین بھائی ہیں۔ وہ چھوٹے ہیں... دو بہنیں ہیں... اچھے۔

اتنے میں آبا جان بھی آگئے... وہ مجھے دیکھ کر خفا ہونے لگے کہ وہاں جا کر تم ایک ہفتہ کیوں رہیں، شام کو آ جانا تھا... آبا جان نے امی کے سامنے بہت جھڑکیاں دیں۔ میں رونے لگی اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرہ میں آگئی۔

ایک ہفتہ کے بعد اپنے کمرہ میں داخل ہوئی تھی... کرسی پر بیٹھ کر بہت رونی مگر دیران دیران نظر آیا...

کہاں وہ خالہ کے گھر کی رونق؟ اور کہاں یہ خاموشی اور اُداس گھر!... مجھے رہ کر خالہ کے گھر میں گزرے ہوئے دن یاد آنے لگے۔ جاوید یاد آیا... اور میں... پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی! جاوید بھتا ہے۔ میں خوش رہتی ہوں... اسے کیا پتہ کہ میں کس قدر دکھی ہوں... اس نے پکا وعدہ لیا تھا کہ میں اسے خط لکھوں گی... لیکن اُن لوگوں کو کیا پتہ!...

جاوید! تم میری زندگی کو کیا جانو... تمہیں کیا پتہ کہ گھر اگر میری کس قدر شامت آئی... رات کو کھانا بھی نہ کھایا... اور سارا وقت اپنے کمرہ میں بیٹھی رہی... امی اور آبانہ جانے کیا بڑبڑاتے رہے، بولتے رہے... رات کو نیند بھی نہ آئی اور میں ساری رات روتی رہی۔ دوسرے روز امی کی زبانی پتہ چلا کہ آبا رات میری شادی کے بارے میں باتیں کرتے رہے...

امی نے کہا... وہ اپنے ایک رشتہ کے بھائی کے ہاں شادی کرنا چاہتے ہیں اُن کا بیٹا ایک مہینہ سے آیا ہوا ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم بات کرنا... میں نے تم کو بتا دیا ہے... جو ان لڑکی کو آخر کب تک گھر میں بٹھایا جاسکتا ہے اور پھر اب تم پاس بھی ہو گئی ہو!...

اب بیٹی! ہم نے سوچا ہے۔ تمہاری شادی کر دیں۔ ادھر یہ کہہ کر امی نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور میری پیٹھ پر ہتھکی دی۔

امی جب تک شادی کا ذکر کرتی رہیں۔ میں بھری بیٹھی رہی۔ خاموش، دیران

کھاتے پیتے لوگ ہیں، بڑی چاہ کرتے ہیں... ایسے ایسے رشتے روز روز نہیں ملا کرتے...  
بیٹی! ہر ماں کو اپنی اولاد کا فک ہوتا ہے۔ میں اگرچہ تمہاری سگی ماں نہیں ہوں لیکن تمہیں سگی بیٹیوں سے بڑھ کر چاہتی ہوں...  
ہاں امی! میں جانتی ہوں، آپ تو مجھے بوسے بھی بڑھ کر پیار کرتی ہیں... اسی لئے تو امی میں آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں... اگر مجھے آپ کے پاس دکھ ہو تو میں آپ کے پاس کیوں رہوں؟!...  
اچھا، میں رات کو بات کروں گی...  
امی! ضرور کرنا...  
..... اور امی چلی گئیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر تک یوں بیٹھی رہی کہ جس وحشت دہلی کر رہی تھی... گزری زندگی کی مختلف تصویریں میرے سامنے سے گزرنے لگیں، اور جی کے گھر کی زندگی سے لیکر جاوید کی غلاقات تک کے تمام واقعات لگا ہوں میں پھر گئے... اور پھر نہ جانے کب وہاں سے اٹھی۔ اور بستر میں جا کر لیٹ گئی... نہ میں نے رات کا کھانا کھایا... اور نہ آبا جان کی باتیں سنیں... اور یوں ہی پڑی رہی... صبح کو سینہ ٹوٹی تو طبیعت میں بڑی آداسی تھی... نہ جانے کے باوجود میں باورچی خانے میں چلی گئی... اور امی کے ساتھ کام کرنے لگی۔  
نہ تو امی نے مجھ سے کوئی بات کی، نہ میں نے اُن سے کچھ کہا۔  
نہ جانے کیا بات ہے... امی کا منہ ایک دم بن جاتا ہے!  
اور کام سے فراغت حاصل کر کے میں باہر دھوپ میں باغ میں جا بیٹھی اور لمبو کا سوئیٹر بننے لگی اور ساتھ ہی اپنے خیالات میں گم ہو گئی۔

میری تمام سہیلیاں اگلی کلاسوں میں داخل ہو گئی ہیں میں داخل نہیں ہو سکی... میرا دل کا لچ جانے کے لئے شعلے کی طرح مضطرب ہے... لیکن میں کیسے جاؤں؟... آبا جان سے بات کہے... تو وہ کہتے ہیں... اب آگے پڑھنے کا نام نہ لینا... حالانکہ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم پاس ہو گئیں تو تم اگلی کلاس میں داخل ہو جانا... لیکن اب جیسے آبا جان بھول گئے ہیں... اصل میں جب سے آبا جان نے دوسری شادی کی ہے، اُن کی اپنی کوئی مرہمی نہیں رہی، وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے... بس امی کی ہاں میں ہاں اور امی کی ناہی میں ناکر دیتے ہیں!...

ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مجھے اگلی کلاس میں داخل کریں یا نہ کریں... میری شادی کریں یا کالج میں پڑھائیں... اگر آج امی ان سے کہہ دیں تو آبا جان کہیں گے۔ بالکل ٹھیک ہے... اور اگر آج امی کہہ دیں کہ غلط ہے تو وہ کہیں گے۔ بالکل غلط ہے تو پھر امی کو منایا جائے...

نہ امی بھی نہیں سنتیں... یا خدا! کیوں کروں؟... ذلیل ہو ہو کر امی کی خوشامدیں کرتی ہوں... ہائے خدا! یہ تم مجھے کس گاہ کی سزا دے رہے ہو؟

میں نے جلدی سے کہا — میں سمجھی نہ جانے کون ہے، اور یہ کہہ کر رسی سے —  
اٹھنے لگی۔

کیوں، کیوں؟ — آپ اٹھنے کیوں بیگیں — اور یہ کہہ کر اس نے میرے  
گلے میں بازو ڈال دیا — اور میرے چہرے پر جھٹک آیا اور مجھے یوں لگا جیسے  
سورج آسمان سے اتر کر اپنی گرم اور مہربان روشنی سے میرے چہرے پر جھٹک آیا...

ہے....؟

خدا کے لئے کوئی دیکھ لیگا — مجھے چھوڑ دیجئے — اگر کسی نے دیکھ لیا تو  
سمجھ لیجئے گا کہ تمام سے پہلے میں مر چکی ہوں گی۔

کوئی نہیں دیکھتا — تم اتنی جلدی گھر کیوں جاتی ہو؟  
خدا کے لئے مجھے چھوڑ دیجئے — ایمان سے کوئی دیکھ لیگا! آپ کا تو کچھ نہ  
جائے گا اور میں ماری جاؤں گی۔ دیکھیں وہ امی آرہی ہیں۔

کہاں؟ — اور اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا — یہاں  
تو کوئی بھی نہیں ہے — آپ بے فکر ہو کر بیٹھیں — میری امی آپ کی امی  
کے پاس ڈرائنگ روم میں منرنے سے بیٹھی ہیں — یہاں آنے کی بجائے ان  
کو کیا ضرورت ہے؟

تو کیا خالہ جان بھی آئی ہیں؟ ....

ہاں — ہم دونوں آئے ہیں!

فرخندہ نہیں آئی؟ ....

نہیں وہ اسکول گئی ہوئی ہے... کل میں جا رہا ہوں نا تو آج تم سے ملنے آیا  
ہوں... یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے یاد کیا یا نہیں؟ ...

میں نے خاموشی سے سر جھٹکایا... اور پھر کہا... آپ پہلے سائے والی کڑی  
پر بیٹھ جائیں تو بتا دوں گی...

اچھا... اگر میں اتنا ہی بڑا لگتا ہوں تو بیٹھ جاتا ہوں...

آج میں کام سے فارغ ہو کر باہر باغچے میں کرسی پر بیٹھی تھی کئی روز سے۔  
آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے... مگر اس وقت سورج چمک رہا تھا... اور  
اس کی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی... میں آرام کر رہی پر نیم دراز ایک  
انگریزی رسالہ دیکھ رہی تھی کہ اچانک مجھے پیچھے سے قدموں کی چاب سنانی لگی  
سمجھی... شاید ہماری نوکرانی ہوگی... اور اسی طرح رسالہ دیکھنے میں محو رہی...  
اچانک کسی نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا... مضبوط اور سخت ہاتھ... میں نے  
گھبرا کر مٹانے چاہے مگر گرفت اور مضبوط ہو گئی! ...

خدا کے لئے چھوڑ دیجئے... پتہ نہیں کون ہیں آپ؟... حالانکہ مجھے معلوم  
ہو گیا تھا کہ یہ جاوید صاحب ہیں... لیکن میں نے جان بوجھ کر کہا تھا...

جاوید نے ہاتھ چھوڑتے ہوئے کرسی کے بازو پر میرے ساتھ ہی بیٹھتے  
ہوئے کہا...

بس... آپ اتنی جلدی بھول گئیں کہ میں کون ہوں؟ مجھے آپ سے  
یہ امید نہ تھی!

یوں اچانک اور پھر اس قدر اپنے قریب جاوید کو پا کر اور وہ بھی اپنے  
گھر میں... جس سے میں خود ہمیشہ خوف زدہ رہی! میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا  
اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا... میرے ہونٹ خشک ہو گئے... لیکن



اور میں نے جواب دینے کی بجائے شکایت آمیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا... اور وہ مکرادیا...

جاوید کہنے لگا...  
اصل میں میری عادت بڑی کھلی قسم کی ہے... میں نے کھلے ماحول میں پروٹل پائی ہے... اور اس لئے میں ایسی جگہ ان کر جہاں پڑنے کی پابندی ہو، بھول جاتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے... تو آپ مجھے معاف کر دیا کریں...

اچھا بتائیں۔ کیا آپ نے مجھے یاد کیا؟  
لیکن میں اسے کیسے بتاتی کہ اس کا خیال اب زندگی بھر مجھ سے کبھی جدا نہ ہو گا۔

میں نے کہا۔ پھر بتا دوں گی۔

پھر کب؟

پھر کسی روز؟...

لیکن میں تو واپس جا رہا ہوں...

اچھا...

پھر جاوید میرے ہاتھ سے رسالہ لیکر دیکھنے لگا اس کے بعد لولا... بتاؤں...  
امی کس لئے آئی ہیں!

کس لئے؟

تمہاری شکایت کرنے کے لئے!...

کیسی شکایت؟

سی... کہ تم جتنا عرصہ ہمارے گھر رہیں... چوری کرتی رہیں!

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ کیسی چوری؟

جاوید نے میرے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

آپ کو نہیں معلوم؟... عجیب بات ہے۔ خود ہی چوری کی ہے اور خود ہی

نہیں معلوم!

سچ! میں بالکل نہیں جانتی...

جب آپ خود نہیں جانتیں... تو پھر میرے بتانے سے بھی نہ جان سکیں گی...

لیکن آپ بتائیں تو ہسی... ممکن ہے مجھے یاد آجائے!

نوسو پھر... اگر واقعی تمہیں نہیں معلوم... میری امی اس لئے آئی ہیں کہ وہ تمہاری

امی سے کہیں کہ اس نے میرے اکلوتے بیٹے جاوید کا دل چرایا ہے... اس لئے چو

لو اب ہمیشہ کے لیے ہمارے گھر بھیج دیں...

اور میں نے جاوید کی یہ بات سن کر شرمناک جلدی سے دونوں ہاتھوں سے چہرہ

چھپایا...

تو اب شرماتی کیوں ہو؟ کیا کبھی چور بھی شرمایا ہے؟ لیکن میں نے کتنی ہی دیر تک

ہاتھ چہرہ پر رہنے دینے... اور پھر خود ہی جلدی سے ہٹائے کہ کہیں کوئی ادھر سے

نہ آجائے!

اس کے بعد جاوید نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے بہت یاد کرتا رہا ہے لیکن میں ایک

دم ادا اس ہو گئی تھی۔ جاوید نے پوچھا۔ تم ادا اس کیوں ہو گئی ہو؟

اور اب میری آنکھوں میں آنسو بھی آگئے... اور جاوید کے ایک دوبارہ درپوچھنے

پر میں نے اسے بتایا کہ امی کبھی نہ مانیں گی۔

کیوں؟

بس آپ دیکھ لیں گے کہ ہماری امی کبھی نہ مانیں گی...

تو کیا تمہاری امی ہمیں برا بھتی ہیں؟

نہیں... اس لئے نہیں...

تو پھر کس لئے؟

اگر میری سگی والدہ آج زندہ ہوتیں!... تو وہ آپ کی راہ میں آنکھیں پچھا دیتیں

وہ اس رشتے سے خوشی سے بھول نہ سکتیں... لیکن میری یہ امی کبھی پسند نہ کریں گی

یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر کیوں؟ ...  
پتہ نہیں کیوں؟ میری سمجھ میں تو خود نہیں آ رہا ... کہیں اور سے رشتہ آیا ہوا ہے؟  
یہ وہاں میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔

لیکن کون لوگ ہیں وہ؟ ...  
اور میں نے جاوید کو سب کچھ بتا دیا ... اور یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے پڑھنے کا کم  
شوق ہے ... مگر میری بات کوئی نہیں سنتا ... اور یہ بھی ... کہ امی اپنی بہن کی  
تم سے کرنا چاہتی ہیں ... اس انکشاف پر جاوید حیران رہ گیا ... اور خاموش  
پھر کہنے لگا ... تم کوئی فکر نہ کرو، سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا میں خود ٹھیک کر لوں گا ...  
چلو تم اندر چلو ...

اور جاوید باہر کے راستے سے اور میں اندر کے راستے امی کے پاس پہنچی ...  
کو سلام کیا ... کہنے لگیں ... کہاں تھیں؟  
میں نے کہا ... باہر بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ آپ کے آنے کی خبر سنی تو ان  
آگئی ...

خالہ کا حال احوال پوچھکر میں خالہ کے پاس بیٹھ گئی۔ امی بھی بیٹھی ہوئی تھی  
کچھ دیر بعد میں باورچی خانے میں چائے تیار کرنے چلی گئی۔ اور جب چائے لیکر آئی  
تو جاوید بھی وہاں بیٹھا تھا ... میں نے اسے دیکھکر جلدی سے پردہ کھینچ لیا ...  
اپنی اس حرکت سے بڑی گھن سی آئی ... اور یہ دھوکہ بازی مجھے پسند نہ آئی  
جاوید کے ہاں رہی ... تو اس کے سامنے کھلم کھلا باتیں کرتی رہی بلکہ اس نے  
پیار بھی کیا تھا ... اور یہاں بھی اس کے سامنے بیٹھ کر باتیں کرتی رہی، اور  
امی کے سامنے پردہ کر لوں! ...

مجھ اپنی اس گھٹیا حرکت پر سخت تادمات ہوئی مگر میں مجبور تھی ... اسی  
پر لوگ ... یہ بڑے بزرگ لوگ ہمیں خود سکھاتے ہیں ... اب اگر میں جاوید  
سامنے ہو جاتی تو کیا ہو جاتا؟ میرے دل میں بھی کوئی چور نہ رہتا ... مگر آپ

کہیں کرکے ہو جاتا ...

جناب! ان لوگوں کو دھوکہ اور فریب ہی پسند ہے۔ یہاں وہ کچھ ہوتا ہے  
بیان نہیں کیا جاسکتا ... ابا جان ڈنڈا لیکر مارتے اور امی زندگی بھر طعنے دیتیں ...  
بس یہاں چھپ کر بے شک دل نو۔ مگر کسی کے سامنے نہیں یہاں چھپ کر سب  
پھر رو تو کوئی بری بات نہیں مگر سامنے کی معمولی سی لغزش بھی سنگین جرم بن جاتی ہے  
ایسے ماحول میں میرا دم گھٹنے لگتا ہے ... اور جی چاہتا ہے کہ ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں  
سچائی کی حکومت ہو ... اور کوئی روک ٹوک نہ ہو۔ کیونکہ روک ٹوک جرم کو دعوت  
دیتی ہے اور امی کو بھی دیکھ کر خالہ اور جاوید کے سامنے کہنے لگیں ... اسے جیلہ! تم  
جاوید سے پردہ کر بھییں بھلا کہیں نہیں بھی سمجھائیں گے چھپتی ہیں ... لیکن میں ...  
میرانی ہنسی ہنس کر باہر چل دی ...

خالہ جان دو گھنٹے بیٹھی رہیں اور پھر جب جانے لگیں تو امی سے کہنے لگیں ...  
کل پھر جیلہ کو ضرور بھجودینا ...

امی کہنے لگیں ... ہاں ... اس کے آبانے اجازت دی تو ضرور آئے

...  
نہیں نہیں ... خالہ کہنے لگیں ... ابا کا کیا ہے؟ ... اجازت دینے والی ماں  
ہوتی ہے ... تم خود جیلہ کو لیکر آنا۔ کل دس بجے تم لوگ پہنچ جانا ...  
اور ان کے جانے کے بعد پتہ چلا کہ کل فرخندہ کی سالگرہ ہے اور جاوید نے  
بھلے بالکل نہیں بتایا تھا ...

ان کے جانے کے بعد میں نے امی کا رد عمل دیکھا۔ مجھ سے کہنے لگیں ...

کل ملنا چاہتی ہو؟ ...

امی! اگر آپ اجازت دیں گی تو چلی جاؤں گی۔

میری اجازت کا کیا ہے؟ ... تم جانا چاہو گی تو تمہیں کون روک سکتا ہے؟  
اے جوان لڑکیاں دوسروں کے گھر نہیں جایا کرتیں ... ہمارے ہاں یہ دستور نہیں

ہے اور پھر تمہیں پتہ ہے۔ تمہارے آہان باتوں کو پسند نہیں کرتے ...  
میں کچھ دیر خاموش رہی اور پھر بولی ...

لیکن امی! آپ کو کل ضرور جانا چاہیے۔ ورنہ خالہ خنا ہو جائیں گی۔ یہ  
رہوں گی۔ آپ خالہ سے کہہ دیجئے گا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس  
وہ نہیں آئی۔

ہاں میں کہہ دوں گی ...  
اور میں باورچی خانے کا کام سنبھالنے کے لئے چلی گئی۔ میرا دل ادا  
مٹھا ... اور اٹھ بیٹا سوختے !!

رات کو جب امی اور بابا کے کمرے سے پاس سے گزری، تو باتوں کی آواز آئی ...  
جس میں میرا نام یا جا رہا تھا۔ جی تو نہیں چاہتا تھا کہ یوں چھپ کر باتیں سنوں کیونکہ  
یہ ایک اخلاقی جرم تھا ... لیکن چونکہ میرا نام امی اپنی تیز آواز میں بار بار لئے جا  
رہی تھی تو میرا دل دھڑکن شروع ہو گیا تھا ... اور پھر مجھے پتہ بھی تھا کہ آج کل گھر  
میں میری شادی کی بات ہو رہی ہے۔ اور ادھر سے جاوید کا پیغام بھی آیا ہوا ہے ...  
اس لئے میں رُک کر سنتے سنی ... امی کہہ رہی تھیں ...

ہاں ہاں لڑکا بہت اچھا ہے ... بی۔ اے ہے ... آپ اس کی شادی  
بہت جلد کر دیں ... آج خالہ زینت آئی ہوئی تھیں اور وہ بھی کہہ رہی تھیں ...  
کہ جس لڑکی کی یون بچپن میں منگنی وغیرہ چھوڑ چکی ہو ... اس کی فوراً شادی کر دینا چاہیے  
... لڑکی کا کیا ہے؟ میں نے اس سے پوچھا تھا ... اور وہ خاموش رہی تھی اور  
بھلا لڑکیوں سے بھی کبھی کوئی پوچھتا ہے؟ ... آپ ہاں کر دیں اور ایک ماہ تک شادی  
کی تیاری کر دیں ... ہم اگلے مہینے کے پہلے مہنتہ میں شادی کر دیں گے ...

اور آبا جان ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے ... یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو اُڑا  
چھال ... اور میں جلدی سے اپنے کمرہ میں واپس آ گئی۔ پہلے تو جی چاہتا تھا کہ بھاگ  
کر جاؤں، اور آبا جان کو رو رو کر سب کچھ بتاؤں ... اور کہوں کہ میں صرف جاوید

سے شادی کرنا چاہتی ہوں، آپ کو اگر میری شادی کرنی ہے تو جاوید سے کر دیں اور اس خیال سے اٹھی بھی کہ اگر خاموش رہی، تو ساری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ یہ مجھے تو سہی ہمت کر لینی چاہئے لیکن چند قدم چل کر واپس آگئی... جاتی دفعہ قدم تیز تھے اور غصہ، غم اور جو شس نے میرا چہرہ تپ رہا تھا... لیکن واپسی پر سہجکاٹے... زلزلہ چہرہ لٹے... بوجھل قدم اٹھائے واپس آگئی...

اے جمیلہ! تو کس سے دل کی بات کہنے جا رہی ہے؟... یہاں تیری کوئی بات نہیں سنی جائے گی... یہاں تیری کوئی بات نہیں مانی جائے گی... یہاں تیری حقیقت ایک کیڑے سے بھی کمتر ہے۔ واپس پلٹ آ... تیرا ان پر کیا مان؟... تو بہت سی باتوں کو سمجھا رہی ہے... اور جب تو نے آج تک کبھی شکایت کا ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا، کوئی ناخرمانی نہیں کی... تو اب کیوں کرتی ہے ہونے دے جو ہوتا ہے... اور میں واپس آن کر چپ چاپ کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی...

باہر پر اسرار رات چھائی ہوئی تھی... سیاہ اور کالی رات! آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ سرد واپس چل رہی تھی... میں کھڑکی سے ٹیک لگائے بیٹھ کر حرکت کھڑکی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور دل لرز رہا تھا... اے خدا! مجھے امن و سکون دے... شانتی... اے شانتی! میرے پاس آ جا!

اے خوبصورت ستارے بنانے والے خدا!... میں تجھے اپنے دل کی آواز کیوں بتاؤں؟... کیا بتاؤں؟... تو خود دلوں کا حال جاننے والا ہے... اور نیت کا پھل دینے والا ہے! میرا حال جان... اور میری آرزو بھی پوری کر دے... اے تو اگر میری آرزو پوری نہیں کر سکتا... تو میں تجھ سے کچھ نہیں کہوں گی میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گی۔ میں خاموش ہو جاؤں گی!

رات ایک خاموشی کے عالم میں بسر کر دی... صبح ہوئی اور میں خاموشی سے اپنے کام میں لگ گئی...

امی تیار ہو کر چلی گئیں... ننھی بھوکو آیا ہے گئی اور میں گھر میں نوکر کے ساتھ اکیلی رہ گئی... اور چپ چاپ کھڑکی سے لگ کر باہر سرک کو تکتے ہوئے اور وہ رکٹا جس میں مانی بیٹھی ہوئی تھیں دُور ہوتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی... لیکن میں وہیں کھڑی رہی... اور یونہی بلا مقصد سرک کو تکتی رہی... اس کے بعد میں اپنے کمر میں آگئی... اور کیل اور ڈھک پٹنگ پر کیٹ گئی ایک گھنٹہ تک یونہی پڑی رہی... گرم سم... نہ سو رہی تھی اور نہ جاگ رہی تھی... کبھی کبھی سوچنے لگتی کہ خالہ نے مجھے نہ پا کر پوچھا ہو گا۔ فرخندہ چل رہی ہو گی کہ باجی کو کیوں نہیں لائے... اور جاوید اس ہو گیا ہو گا... شاید وہ مجھے لینے آ جائے... اور اچانک اس خیال کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا... جیسے کوئی میرے پٹنگ کے پاس ہے اور میں نے اپنا دھم دُور کرنے کے لئے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی... کہ جاوید میرے اوپر جھکا ہوا... مجھے چمکتی ہوئی شوخ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا... میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی...

آپ!... آپ کیسے آ گئے؟...  
تم جو نہ آئیں... کیوں نہیں آئیں تھیں؟...

جب امی مجھے ساتھ لے کر نکلیں تو میں کیسے آتی؟ اتنا کہہ میں نے ہنگامے سے اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو اس نے مجھے اسٹھنے سے منع کر دیا اور خود میرے پاس پٹی پر بیٹھ گیا... میرا دل دھڑکنے لگا... کوئی آنہ جائے؟... میں نے کہا... گھر میں ادب ہے ہی کون... جو آجائے گا... جاوید نے کہا۔ لیکن نوکر تو ہے نا؟... اس نے مجھے اندر آتے دیکھا ہی نہیں!... سچ؟...

ہاں! ہاں! پھر وہ... میں دروازہ بند کر لوں کہیں وہ آہی نہ جائے۔ دروازہ بند نہ کرو... دیکھو... اگر کہیں کوئی اور آگیا... تو پھر کیا ہوگا۔ کیا خبر! آج جان ہی دفتر سے چھٹی کر کے آجائیں یا امی ہی پلٹ آئیں... تو؟...

جیکہ تمہیں تو خواہ مخواہ ہی دہم مہوتے رہتے ہیں... یہاں کوئی نہیں آ... اگر کوئی آیا بھی... تو میں پچھلے دروازے سے باہر باغ میں نکل جاؤں گا۔ تم کوئی فکر نہ کرو... اور یہ کہہ کر اس نے دروازے کو اندر سے چٹختی لگا دی مجھے نہ جانے کیوں ایک دم خوف محسوس ہوا... لیکن پھر میں نے سوچا جاہ ایسا نہیں ہے...

جاوید مجھے گھبراتا دیکھ کر ہنسنے لگا... پگلی رٹکی! گھر کیوں رہی ہو۔ نہیں تو... میں بالکل ٹھیک ہوں...

پھر جاوید میرے پاس آن بیٹھا... میرا ہاتھ پکڑ کر دبانے لگا اور پھر اس نے ٹوڑی سے پکڑ کر میرا چہرہ اُدھرا اٹھایا... اور بڑی پراسرار سرگوشی میں دل گہرائیوں سے پوچھا... جیلہ! میری جیلہ! تم اُداس کیوں ہو؟...

میں نے اپنا چہرہ اُدھرا کر ایک لمحہ کو اس کی آنکھوں کو دیکھا... میرے ہونٹ کپکپاتے، اور میں جاوید کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ جاوید! یہ لوگ میری شادی کر رہے ہیں... کہاں؟...

اسی رُط کے کے ساتھ... جسے میں نے دیکھا تک نہیں... خدا جانے وہ کون ہے؟... لیکن میں تو کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتی۔ مجھ سے بھی نہیں؟ جاوید نے جھک کر پوچھا۔

میں آپ کی نہیں! اوروں کی بات کر رہی ہوں... اور پھر میں نے جاوید کو سب کچھ بتا دیا کہ رات کیا کیا باتیں ہو رہی تھیں۔

جاوید یہ سن کر پریشان سا ہو گیا۔ پھر کہنے لگا۔ امی کبھی تھیں۔ کہ میں ان لوگوں کو ضرور منالوں گی۔ جیلہ! تم فکر نہ کرو، دیکھو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم دن رات نہیں آتی تھیں۔ تو میں بھاگ کر یہاں آگیا ہوں۔ اب فرخندہ تمہیں لینے کو آ رہی ہوگی۔ تم تیار ہو جاؤ۔۔۔

لیکن جب تک امی اجازت نہ دیں گی۔ میں کیسے جا سکتی ہوں؟ امی نے اجازت دی ہے۔ جب ہی تو فرخندہ آ رہی ہے نا... اس کے بعد ہم دس منٹ تک خاموش ایک دوسرے کے ساتھ گئے بیٹھے۔ رہے...

ہمارے دل دھڑک رہے تھے۔ مگر ہم خاموش تھے... محبت کے ان پراسرار لمحوں کی کہانی میں نظروں میں بیان نہیں کر سکتی۔

مجھے جاوید کے پاس بیٹھ کر کسی ان جانی قوت کا احساس ہو رہا تھا۔ اور جیسے اس کی پناہ میں آنے کے بعد اب مجھے کسی کا ڈر نہیں رہا تھا... اور میں اپنے اندر ایک عظیم طاقت محسوس کر رہی تھی...

جاوید نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اور پھر اس نے خدا کے سامنے وعدہ کیا

کہ... وہ صرف میرا ہے۔ ہر حال میں میرا رہے گا... اور اگر ہماری شادی نہ ہوگی... تب بھی ہم ایک دوسرے کو پیار کریں گے۔

لیکن میں نے تڑپ کر کہا...

جاویدا! میں کسی اور سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟ جب دل کسی اور کو چاہے اور شادی کسی اور سے ہو... تو؟...

نہیں جمید! فکر نہ کرو۔ میں تمہیں بہت جلد اپنے پاس لے آؤں گا۔ یہ میرا ڈاکٹری کا آخری سال ہے... تم دعا کیا کرو میں پاس ہو جاؤں۔

اس کے بعد ہم کچھ دیر تک اور بیٹھے... براہٹ پر میرا دل دھڑک اٹھا تھا... لیکن میں بیٹھی رہی...

پھر جاوید چلا گیا... اور میں باورچی خانے میں گئی... تاکہ نوکر کو دیکھوں۔ وہ کھانا بنانے میں مصروف تھا۔ میں نے اس سے چند منٹ تک باتیں کیں۔ اور یہ انداز لگانے کی کوشش کی کہ اسے جاوید کی آمد کا علم ہوا ہے یا نہیں؟... لیکن اس کی کسی بات سے کچھ بھی ظاہر نہ ہوا اور میں مطمئن ہو گئی۔ ابھی میں وہیں کھڑی تھی کہ فرخندہ آگئی... اور میں تیار ہو کر اس کے ساتھ چل دی

جاوید کو لاہور گئے دو ماہ ہو گئے ہیں۔ میں نے اسے تاکید کی تھی کہ مجھے کوئی خط وغیرہ نہ لکھنا۔ ورنہ مجھے اس کی بہت بڑی سزا ملے گی۔ لیکن اگر کوئی خاص بات ہو جائے... تو پھر ملکی بن کر لکھنا... لیکن جاوید نے کہا تھا... تم فکر نہ کرو تمہارے گھر کے تہ پر میں تمہیں کوئی خط نہ بھیجوں گا۔ میرا خط فرخندہ تمہیں دیا کہے گی۔ اور یوں ہر چھ ساتویں فرخندہ ہمارے گھر آتی۔ اور جاوید کا خط دے جاتی....

میں تو پہلے سے ہی خط لکھ رہی تھی... جو فرخندہ کو دیدیتی اور وہ اسے پوسٹ کر دیتی... جاوید کے خطوں کو میں نے اپنی الماری میں کپڑوں کے نیچے بہت دُرجھا کر اور تالوں کے اندر رکھا ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے خدشہ ہی رہتا تھا... کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔

جاوید اپنے خطوں میں لکھتا کہ وہ میرے لئے بہت بے قرار ہے اور وہ میرے بغیر بسر ہونے والی زندگی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ لیکن جاوید اپنے خطوں میں یہ ضرور لکھتا کہ تم اپنی پڑھائی جاری رکھو... اور میں طرح مو آجاؤں سے کہہ کر کالج میں داخل ہو جاؤ... اور لاہور آجاؤ... اور موٹل میں رہو۔ یہاں پھر ہم دونوں ملا کریں گے۔

اور میں نے جاوید کو سکھا کہ میں آبا جان سے کہوں گی، خدا کرے  
کہ ایسا ہو جائے ... !!

میں کل سے سوچ رہی ہوں ... کہ ایسا کون طریقہ اختیار کر دوں کہ کارج میں داخل  
ہو جاؤں ... اور کم از کم بی۔ اے تو کر لوں۔ خدا سے دعا مانگتی ہوں لیکن خدا کی  
توجہ مرضی ہوتی ہے۔ وہی کرتا ہے۔ لیکن نہیں۔ میری توبہ! اے خدا میری توبہ  
... ہم تجھ سے بدگمان ہو کر دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتے ... تو ہی ہم سب کا پالنا  
ہے تو میری دعا ضرور سنے گا۔ تو جانتا ہے کہ مجھے پڑھنے کا کس قدر شوق ہے۔

رات ہم کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے ... کہ اچانک باہر سے بولنے کی آوازیں  
آئیں۔ جیسے کوئی ہمارے ہی گھر آ رہا ہے۔ بہت سے قدموں کی آواز تھی ...  
ہم جلدی سے کمرے سے نکل کر باہر آئے تاکہ دیکھیں ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میری  
امی کی والدہ ... اور اسکی بہنیں، اس کا بھائی، بھابی اور اس کا بھانجا سارے  
ہمارے گھر آ رہے ہیں امی تو بھاگ کر آگے ہوئیں۔ اور سب کے گلے سے چپٹ  
لیں۔ آبا جان بھی جلدی سے ان کے پاس گئے مجھے بھی ان کے پاس جانا پڑا  
... اور پھر ہم سب کمرے کے اندر آ گئے ... یہ لوگ اچانک ہی آ گئے تھے۔ اور  
انہوں نے کہا کہ ہم نے بڑی مشکل سے آپ کا مکان ڈھونڈا ہے ... ہم چاہتے  
تھے کہ آپ کو اچانک جا کر حیران کریں۔

ان سب کے لئے کھانا تیار کرنا تھا۔ میں جلدی سے باورچی خانے میں لگی۔  
اور ایک گھنٹے کے اندر اندر کھانا تیار کیا، اور ان کے لئے لائی۔

انہوں نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد چائے تیار کی ... وہ پی ... اور پھر کمرے  
وغیرہ کھول کر میں نے سب کے سونے کا انتظام کیا۔ اور صبح انہوں نے باتوں اور  
توبہوں کے شعلے سے گھر کو سرسراٹھایا ہوا تھا ... غرضیکہ رات کے دو بج گئے ...  
انہوں نے بتایا کہ وہ یہاں ایک مہینے تک رہیں گے ...  
جب سب سو گئے تو میں بھی سونے لگی۔ امی کی چھوٹی بہن سعیدہ جس کی عمر کوئی





خالہ کو اس بات کا بالکل علم تھا کہ امی کا سیدہ کے لئے جاوید کا رشتہ  
بچے کا خیال ہے۔ انھوں نے سیدہ کو پاس بٹھایا، باتیں کیں اور کہنے لگیں...  
بن سیدہ کو دو سال کے بعد دیکھ رہی ہوں۔ اس وقت اس نے میٹرک کا امتحان  
س کیا تھا... ان دو سال میں سیدہ تو ماشاء اللہ چشم بدور کتنی جوان اور خوبصورت  
دیکھا ہے۔

امی اور ان کی دوسری بہنیں منکر ادیں... اور پھر خالہ کو انھوں نے بڑے فخر  
سے بتایا کہ یہ ایف۔ اے میں پڑھتی ہے، اور اس کا ایم اے تک پڑھنے  
کا خیال ہے...

خالہ نے خوش ہو کر کہا... بہت خوشی کی بات ہے، مجھے لڑکیوں میں پڑھنے کا...  
نورق دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہے۔ میری اپنی فرزندہ کہتی ہے کہ میں ایم اے کو دل  
نہیں لیتی لیکن میں اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں۔ دلوں بہن بھائی ڈاکٹر ہوں گے... اچھا  
دیکھیں... آگے جو خدا کو منظور ہو...

سیدہ کی امی کہنے لگیں... سیدہ کو بھی پڑھنے کا بید شوق ہے۔ بس یہی کہتی ہے  
اگر ساری دنیا کا علم گھوٹ کر پی لوں۔ کیا محال جو اس نے باقی لڑکیوں کی طرح کبھی ناچ  
نود میں حصہ لیا ہو یا فٹبول باتوں میں وقت کھو یا ہو۔ یہ تو سہارے گھر کی روشنی ہے  
سب ہی اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں... محلے والیاں تعریف کرتی ہیں کہ کتنی پیاری  
اور نیک بچہ ہے... مال اپنی بچی کی تعریفیں کر رہی تھی... اپنے مال کی تعریفیں کر رہی  
تھی... گاگہک سامنے بیٹھا تھا۔ دوسری بہنیں مسکرا کر داد دے رہی تھیں  
... خالہ زینت دیکھ بھی رہی تھیں۔ اور مسکرا بھی رہی تھیں اور میں چپ چاپ ایک  
کونے سے گئی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی...

مال کو بیٹیوں پر اور بیٹیوں کو ماؤں پر ناز ہوتا ہے! خوش قیمت ہے سیدہ  
جس کی امی اس کے پاس بیٹھی اس کی ہر بڑائی کو نظر انداز کر کے صرف اس  
کی تعریفیں کر رہی ہے!! ....

ان لوگوں کو آئے آٹھ دس روز ہو گئے ہیں۔ فرزندہ اسکول سے واپسی پر ایک  
روز امی تھی اور جاوید کا خط دے گئی تھی... لیکن مجھے یہ لوگ کہاں فرصت دے  
رہے تھے کہ میں بھی بیٹھ کر اسے خط لکھتی۔ اور مجھے تو یہ بھی ڈرتھا کہ کہیں کسی روز  
تلاشی لیکر یہ لوگ جاوید کے خط ہی نہ نکال لیں... کیونکہ سیدہ نے میرے کمرے  
کی چند ہی چیزیں ہوں گی جنہیں ہاتھ نہ لگایا ہوگا... ورنہ ایک ایک کتاب دیکھ ڈال  
تھی... ایک ایک چیز دیکھتی پھرتی تھی... میں نے چپکے سے سارے خطوط نکال  
کر فرزندہ کو دیدے کہ گھر جا کر کہیں رکھ دو۔ احتیاط سے تانے میں لگا کر... پھر جب یہ لوگ  
چلے جائیں گے تو میں منگالوں گی۔

میں جب فرزندہ کو یہ پیکٹ دے رہی تھی اور الگ کھڑی اس سے آہستہ آہستہ  
باتیں کر رہی تھی تو سیدہ بھی آگئی... سیدہ کو پتہ ہے کہ شاید جاوید سے میری شادی  
ہو جائے... اس لئے فرزندہ کی طرف ہنس ہنس کر دیکھ رہی تھی اور اسے بڑے سنجیدگی  
دکھا رہی تھی۔ فرزندہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے آدھ گھنٹہ بعد خالہ زینت بھی آ  
خالہ زینت کے آنے کی خبر سن کر سیدہ جلدی سے غسل خانے میں چلی گئی  
حمام گرم تھا۔ نہادھو کر باہر نکلی... ایک خوبصورت سا ڈھی بانڈھی... اسے پتہ  
کہ خالہ زینت اور جاوید کے سامنے بھی ہونا پڑے گا... اس لئے وہ کیل کا  
سے لیس ہو کر آئی تھی... نیا کوٹ پہنا، پینٹ کیا اور جھومتی ہوئی خالہ کے پاس

سعیدہ مسکرا رہی ہے اور اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح سُرخ ہے...!

اے خوش قسمت سعیدہ! ... جی بھر کر منہیں! ... اور جی بھر کر خوشیاں من  
تیرے یہ عزیز، یہ چاہنے والے تیرے پاس بیٹھے ہیں اور تیرے روشن اور  
مستقبل کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

تو اپنے دل کی ایک ایک خواہش اور ایک ایک آرزو کے سر پر سہرے باندھ  
ہے... تیرے دل کی ہر تمنا پوری ہو سکتی ہے، تیرے قدم میں پھج جانے کے  
آنکھیں نہ نظر ہیں!!

خالہ زینت پر نہ جانے ان لوگوں نے کیا جادو کر دیا ہے کہ تقریباً روزانہ...  
یہاں آتی ہیں، اور جس دن وہ نہیں آتیں تو یہ جانتی ہیں اور سعیدہ تو چند لمحوں کے لئے  
مالہ کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

میں ہر وقت کام کرتی رہتی ہوں... میں ٹوکر کی مدد سے سارا کھانا تیار کرتی ہوں  
سارا کام کرتی ہوں... اتنے لوگوں کے لئے کھانا تیار کرنا بھی کوئی آسان تو نہیں  
... لیکن کیا مجال جو یہ ذرا سی بھی میری مدد کر جائیں...

خالہ زینت نے دو چار بار میرا حال پوچھا اور جب انھوں نے دیکھا کہ میں پڑھنے  
کی بجائے سارا سارا وقت باورچی خانے میں گزار دیتی ہوں۔ تو وہ خاموش رہیں  
اپنی اور دوسری سہیلیاں ہر وقت یہی کہتی رہتی ہیں... کہ جیکہ کو تو پڑھنے کا  
بھی شوق نہیں ہے... بہتیرا کہتی ہوں کہ اگرچہ یہاں کالج نہیں ہے، لیکن تم پرائیویٹ  
نئے سے پڑھائی شروع کر دو، اور پھر لاہور جا کر امتحان دے دینا۔ مگر اسے  
میں سے زیادہ باورچی خانے کا کام کرنے کا شوق ہے!

جب سے خالہ زینت نے دبی زبان سے میرے رشتہ کا ذکر کیا ہے جہاں  
ہو سکتا ہے، اچھی ہر وقت مناسب موقعہ دیکھ کر میری بُرائیاں کرتی رہتی ہیں  
لیکن میں کیا کر سکتی ہوں؟ خالہ زینت بھی آخر ایک عورت ہیں اور انھیں ایسی ہیو  
یک نہیں لانی جس کی سنگینی وغیرہ چھوٹ چکی ہو اور جس کی ماں اس کی ہزار برائیاں

کرتی ہو تبھی تو خالہ اب پہلے کی طرح چاہ سے نہیں بلاتیں اور جہاں تک میں ہوں، انہی نے ضرور وہ خط جو نامراد سلیم نے سکھے تھے۔ خالہ کو دکھا دیئے ہ... کیونکہ یہی تو موقع تھا کہ وار کر دیا جائے اور پھر یہ بھی بتایا ہو گا کہ چھ سات، چچی کے ہاں رہیں... اور کس طرح شادی سے انکار کر دیا اور ایک فنادبر اور جب میں یہ سب کچھ سوچتی اور اس کے بعد خالہ کی کچھ بدلی ہوا دیکھتی تو خاموشی اور دکھ سے چپ چاپ سر جھکا لیتی۔

خالہ زینت سے مجھے یہ اُمید نہ تھی... لیکن میں بھی لگی ہوں جو ایسا، خالہ زینت بھی آخر ایک عورت ہیں اور پھر امی کی بہن اور سہیلی ہیں... کا بھلائیہ کیونکہ یقین نہ کریں!

اور امی جس طرح مناسب موقع ڈھونڈ کر وقتاً فوقتاً میری برائیاں کرتی اور پھر واقعی میری زندگی میں ایسے واقعات بھی ہو چکے ہیں... تو کون بدگلا سکتا؟... اور خالہ تو پھر ایک عورت ہیں... بھلا خالہ میری کیا سمجھتی تھی جو اتنا مان اور غرور کر بیٹھی تھی؟ لیکن دل یہی کہتا تھا کہ خالہ کو یوں بے رخی چاہیے تھی۔ اگر میرے ماضی میں چند ایک واقعات ایسے ہو گئے تھے آ بھی تو دیکھ لینا چاہئے تھا کہ اس میں میرا کتنا قصور تھا، اور میری نیت کی میں واقعی ایسی بُری فطرت کی لڑکی ہوں؟ اگر میں حقیقت میں! تو پھر تو واقعی خالہ میرے ساتھ بے رخی برت کر ٹھیک کر رہی ہیں... لیکن اگر نہیں ہوں تو پھر خالہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔

فرخندہ ابھی چھوٹی اور بھولی لڑکی۔ بے... زندگی کے ان معاملوں میں کیسے دخل دے سکتی ہے۔!...

اور رانا جاوید! وہ یقیناً ان میں سے نہیں ہے۔ وہ بہت اچھا ہے... وہ مجھے جانتا ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا!... لیکن؟... اچانک دل میں چند ذہم بھوتوں کی طرح سراٹھاتے!

اور بھنگی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہتے... اور اگر جاوید بھی ایسا ہوا تو؟ اگر جاوید نے بھی بے رخی برتی تو؟... تو میں گھبرا جاتی... پریشان ہو جاتی... لیکن میں کیا کر سکتی تھی!... میں خاموش تھی اور خاموشی سے ہونے والے... واقعات کو دیکھ رہی تھی...

سعیدہ دن بدن خالہ کو اپنا زویدہ بنا رہی تھی... اچانک ایک روز مجھے پتہ چلا... کہ جاوید آگیا ہے... مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جاوید آگیا ہو گا... وہ کیسے آ سکتا ہے؟ اُسے ایسا کیا کام پڑ گیا کہ وہ آگیا۔ اور پھر اس نے خط میں بھی نہیں بچا تھا۔ لیکن اسے خط سکھ بھی تو پندرہ روز ہو گئے تھے... لیکن خط سکھنے سے اسے میں نے ہی تو منع کیا تھا کہ کہیں ان لوگوں کو علم نہ ہو جائے...

جاوید کے اچانک آ جانے سے جہاں میں حیران ہو گئی تھی۔ وہاں خوش بھی تھی... لیکن نہ جانے کیوں میرا دل لڑتا تھا اور اچانک مجھے جاوید کا انا بڑا لگا۔ جب تک یہ لوگ یہاں تھے جاوید کو نہیں انا چاہیئے تھا... جاوید کیوں آگیا ہے؟... اور میرے دل نے چیخ کر کہا... جب تک سعیدہ یہاں تھی... جاوید کیوں آیا ہے؟...

اور دل کی اس چیخ کے بعد میں خاموش ہو گئی...

سارا کام چھوڑ کر اپنے کمرے میں چپ چاپ بیٹھ جاؤں... تو ایک دروازے کے بعد ہی میرا کمرہ بدل جائے... میں بدل جاؤں... اور میں کھلی آنکھوں سے دیکھتی رہ جاؤں کہ وہ کسی اور کے گھر کا کمرہ بن جائے جہاں میں دلہن بنی بیٹھی ہوں۔ اور کوئی اجنبی میرا شوہر سامنے بیٹھا ہے...

اور یہ تصور مجھے بہت پریشان کر دیتا... اور میں سوچتی کہ مجھے اپنی دلہن پا کر اپنا شوکار سامنے دیکھ کر اس کا جو جی چاہے گا وہ کر سکے گا... وہ مجھے شادی کے پہلے روز ہی دیکھ سکے گا... اور میں بھی اُسے شادی کے پہلے روز ہی دیکھ سکے گی... مجھے کیا پتہ کہ وہ کیسی عادات کا مالک ہوگا؟... اس کے کیسے... خیالات ہوں گے۔ کیا پتہ وہ بظاہر پڑھا بکھا ہونے کے باوجود کیسا ہو... الزان اندر سے کچھ اور ہوتا ہے اور اوپر سے کچھ اور ہوتا ہے، کیا پتہ وہ اندر سے کیا نکلے ان خیالوں سے گھر کر میں امی کا ہر کام انجام دیا کرتی تھی۔ میں شادی سے گھبراتی تھی... نامراد سلیم کا واقعہ میرے دل پر گہرے گھاؤ چھوڑ گیا تھا... اور میں شادی کے بغیر ساری زندگی بسر کرنا چاہتی تھی لیکن اس طرح سارا دن کام کر کے نہیں... اور جانتی تھی کہ یہاں رہی تو غلام بن کر رہوں گی... اپنی کوئی مرضی نہ ہو اور اپنی کوئی خواہش نہ ہوگی... لیکن اگر انہوں نے شادی کر دی، تو نہ جانے وہ کیا ہو تو بھرنی کی ہی ایک راہ دکھائی دیتی تھی کہ کسی ایسے لڑکے سے شادی ہو جسے میں پسند کر دوں... جس کی عادتوں کا مجھے پسے سے علم ہو... اور جسے مجھ سے محبت بھی ہو... اور یہ خیال جاوید سے منے کے بعد پیدا ہونے لگا تھا۔ جاوید مجھے بہت اچھا لگتا تھا... اور یہ حقیقت بھی کہ وہ اب مجھے تصویر دیکھتے ہی بہت اچھا لگنے لگا تھا... اور پھر قدرت نے حالات بھی ایسے پیدا کر دیئے کہ خالہ مجھ پر مہراں ہو گئیں... جاوید مجھے بے انتہا چاہنے لگا اور اس گھر کے چپے چپے سے میں محبت کرنے لگی... اس گھر سے مانوس ہو گئی... ان لوگوں کو اپنا سمجھ لیا... اور بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ میرے دکھ کے دن ختم ہو رہے ہیں اور جاوید ہمیشہ

جاوید کو اٹے ہوئے آج پانچواں دن ہے، اور اس عرصہ میں وہ صرف دو بار یہاں آیا تھا... لیکن مجھ بات کرنے کا تو سوال ہی الگ رہا۔ میں اُسے دیکھ بھی نہ سکی... میں صبح سے لیکر شام تک کام میں مشغول رہتی ہوں۔ اور اگر میں کام نہ کروں تو کون کرے! امی تو اب بالکل ہی بننے جلنے کے قابل نہیں رہیں۔ ایک تو دیسے ہی وہ آرام پسند، اس پرانے کے ہاں بچہ پیدا دالابے... اور ہر ایک کی یہی دعا ہے کہ لڑکا پیدا ہو... کام کرنے والا صرف ایک انوکھے، وہ بھی کم نجات بدھوسا... جو وغیرہ صاف کر سکتا ہے... مگر کھانا تیار کرنے میں مدد نہیں دے سکتا... بلوکی آیا ہے... مگر وہ باورچی خانے کا کام تو نہیں کر سکتی!... امی کہتی ہیں کہ لڑکیاں بیکار نہیں بیٹھا کرتیں۔ وہ گھر کا کام کرتی ہیں اور رات دن کام کرنا پڑتا تھا اور میں نہ چاہنے کے باوجود سارا سارا دن کام کر رہی تھی...

کہاں میں خاموش انگوڑی کی سیلوں کے سائے سے بیٹھ کر نظریں پڑے لڑکی تھی اور کہاں مجھے باورچی خانے کے اندر دھوئیں میں بیٹھنا پڑتا تھا اور یہ جو میں امی کی اتنی منت و خوشامد کرتی تھی، سارا کام کرتی تھی کہیں جا کر وہ سیدھے منہ بات کرتی تھیں، اور اگر میں اپنی خواہش کے

کے لئے میرا ہے اب جاوید کو آٹے پانچواں روز گزر رہا تھا... سعادہ کو میرے  
دو تین روز سے نہیں دیکھا تھا۔ امی اور اس کی بہنیں باتیں کرتیں تو ظاہر  
کرتیں کہ سعادہ یہیں کسی سیلی کے ہاں گئی ہے... میری گئی ہے، شائینگ کے  
گئی ہے۔ لیکن مجھے پتہ تھا کہ سعادہ کہاں گئی ہے... سعادہ جاوید کے گھر گئی  
سعادہ جاوید کے ساتھ میری کرتی ہے۔ اس کے ساتھ رہتی ہے... خالہ  
پریشان پنچھار کرنے لگی تھیں۔

میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی... اور میرا دل غم کی گہرائیوں میں ڈوبتا جا  
... اور میں دن میں کئی کئی بار روتی...

مجھے یوں لگتا جیسے خالہ نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا۔ جاوید نے مجھے  
بنایا تھا... لیکن کیا پتہ جاوید نہ ہی بدلا ہو... اگر سعادہ اس کے گھر جا کر  
ہے اور سعادہ کی، اس کی بہنیں سب اُسے بنا سجا کر جاوید کے سامنے پڑ  
ہیں تو اس میں جاوید کا کیا قصور؟ کیا پتہ، جاوید مجھے ہی دل میں یاد کر رہا ہو۔  
میں تو خواہ مخواہ بدگمان ہوئی جا رہی ہوں یہ طوفان جو یہاں آیا ہوا ہے چذرہ  
بعد گزر جائے گا۔ ایک نہ ایک روز تو ضرور ہی گزرے گا؟... سعادہ  
سبھی لوگ چلے جائیں گے... تو پھر میرا سوجھ بوجھ ہوگا۔ مجھے صبر اور  
سے سب کچھ دیکھنا چاہیے ان کے ہوتے ہوئے میں کیا کر سکتی ہوں...؟  
کے جانے کے بعد جاوید سے پوچھوں گی... رد و کر پوچھوں گی... بہت کچھ  
گی اور اس کے سینے کے ساتھ لگ کر کہوں گی...

جاوید! تمہیں بھی میرا کوئی خیال نہ آیا... تم تو میرے اپنے تھے... تم تو لیا  
کتے... کیا تمہیں پتہ نہیں تھا کہ میں کتنی اُداس اور غمگین ہوں! میں تو  
دیکھی ہوں... تم تو میرے ساتھ یوں نہ کتے... اور یہ سوچ کر میں  
جاتی کہ جاوید نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ صرف میرا ہے... ہمیشہ  
گا... سعادہ کا کیا سے چذرہ روز کے لئے آئی ہے۔ طوفان کی ہر ہلچل

جھاگ کی طرح بیٹھ جائیگی... لیکن یہ محض میری خام خیالی تھی... اور جان بوجھ کر تھا  
پر پردے ڈال رہی تھی...

جاوید سعادہ کا ہو گیا تھا... وہ اس کے ساتھ اپنا سارا وقت گزارتا...  
کھلم کھلا وقت گزارتا... کسی کا ڈرا در خوف نہیں تھا۔ سعادہ اپنی شوخ لنگاہوں سے  
اس کے دل پر جادو ڈال رہی تھی یہ شوخ چٹل اور خوبصورت لڑکی... جاوید  
کو بڑے سلیقے سے اپنا بنا رہی تھی۔

سعادہ کی ماں اور بہنیں سبھی سعادہ کی کامیابی پر خوش تھیں۔ شکار خود بخود پتھر  
میں آ رہا تھا... جاوید سعادہ کی طرف طرف کھینچتا چلا آ رہا تھا... دن گزرتے  
جاسے تھے... میرا چہرہ اُداس سے اُداس تر ہوتا گیا...

کبھی کبھی جی چاہتا کہ جاوید کو ایک رقعہ کھڑکھڑا ہوا اس سے پوچھوں کہ جاوید  
اتم یہ سب کچھ کیا کر رہے ہو؟... مگر پھر ڈرتی... کیا خبر اگر جاوید یہ رقعہ سب  
کو دکھا دے تو؟... مجھے اب کسی پر اعتماد نہیں رہا تھا... دنیا کی ہر چیز سے میرا  
اعتماد اٹھتا جا رہا تھا...

کیا پتہ جاوید جسے میں اپنا سمجھ رہی ہوں... اپنا محبوب اپنا پیارا سنگی ساتھی سمجھ  
رہی ہوں... وہ میرا دشمن ہی ہوگا...

ایک مہینہ بیت گیا۔ جاوید اٹھ دس روز سے یہاں ہے، اور ابھی نہ جانے  
اور کتنے روز رہے گا...

سعادہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے... اس کے چہرے سارے  
گھر میں گونجتے ہیں۔ اس کو کسی بات پر روکا لٹو کا نہیں جاتا اس کا جو جی چاہتا ہے،  
دہک رہی ہے... نہ اس کے آنے جانے پر پابندی ہے، نہ اس کی حرکات  
پر پابندی ہے...

وہ آزاد برائیوں کی طرح زندگی بسر کر رہی ہے... شاداب پھولوں کی طرح مسکراتی  
ہے...

زندگی نے چند لمحوں کی خوشی مجھے دی تھی۔ وہ بھی قدرت سے دیکھا نہ گئے  
... اور وہ خوشی مجھ سے چھین کر، مجھ سے لوٹ کر سعیدہ کو دی جا رہی تھی ...  
ایک طرف ساری خوشیاں جمع ہو رہی تھیں اور دوسری طرف مارے دکھ لکھے  
ہو رہے تھے ...

ہاں ٹھیک ہے ... ایک ہی جگہ سب کچھ ہونا چاہیئے، دکھی لوگوں کو خدا اور  
دکھ دیتا ہے، اور خوش لوگوں کو خدا اور خوشی دیتا ہے ...  
پتہ نہیں خدا کی یہ کیا حکمت ہے؟! ...

کل سہ پہر کو سب کا سیر کا پروگرام بنا ... مجھے بھی ساتھ لے جانے کے لئے۔  
سب نے اصرار کیا ... لیکن میں نے طبیعت کی خرابی کے باعث جانے سے انکار  
کر دیا ...

میں کیوں جاتی؟ ... میرا ان لوگوں سے کیا واسطہ! ... جاوید سعیدہ سے ہنس  
کر باتیں کرے گا ... تو میں کیسے دیکھ سکوں گی!! ...

میں اپنا اداس اور مڑھایا ہوا چہرہ لئے کر کبھی بھی نہیں جاتا چاہتی تھی ... سب  
نے اصرار کیا سعیدہ نے بھی کہا ... جاوید کے سامنے تو خیر میں ہوتی ہی نہ تھی ...  
سعیدہ جاوید کے سامنے اس لئے ہو جاتی تھی کہ کہا جاتا تھا کہ سعیدہ کے والدین  
نے ال کا پردہ ختم کر دیا ہے اور وہ گھر والوں کی اجازت سے اس کے سامنے ہوتی  
ہے لیکن میرے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ میری امی تو مجھے پردہ اتارنے کی اجازت دیتی  
ہیں مگر اباجان نہیں مانتے ...

اور جب آبا جان کوئی بات نہ مانتے تو وہ بات نہیں ہو سکتی۔ اس لئے میں جاوید  
کے سامنے بہت کم ہو سکتی ہوں ... مثلاً سب لوگوں کے درمیان تو اس کے سامنے  
ہو سکتی ہوں ...

میں بالکل نہیں! فرخندہ بھی آئی ہوئی تھی ... اس نے بہت اصرار کیا اور کہا کہ بھیا کہتے  
تھے۔ جمیلہ باجی آج کل کہاں ہوئی ہے ... کیا باورچی خانے کا کام کرنے کا اسے

فایہ جیلہ کو ہمارا سہاں آنا بڑا لگا ہے... جب سے ہم آئے ہیں اس نے  
 بھی ہنس کر بات تک نہیں کی... اس کی امی بھی کہنے لگیں میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ  
 بلہم سے کس طرح کھینچی کھینچی رہتی ہے... لیکن میں خاموش رہی... میں نے  
 ن کی غلط فہمی دور کرنے کی کوئی کوشش نہ کی... اور مارے لوگ میرے کو حل دیے  
 ... ان کے جانے کے بعد آبا جان آگئے، امی جان نے ان سے شکایت کر دی کہ  
 ایک ایک نے اس بڑی کی ہنسی کی ہیں کہ تم بھی میرے کو چلو مگر یہ نہیں گئی بلکہ یہ کہا کہ تم لوگوں  
 کے ساتھ میرے کو نہ جاؤں گی....

کیا یہ بڑی بات نہیں ہے؟ وہ کی خیال کرتے ہوں گے۔ بلکہ بڑی آپا نے تو  
 بہ بھی دیا تھا کہ جیلہ کو ہمارا آنا بڑا لگا ہے۔ تبھی جب سے ہم آئے ہیں کبھی ہم  
 سے ہنس کر اس نے بات تک نہیں کی!...  
 آبا جان یہ سُن کر چپ ہو گئے... نہ جانے کیوں چپ ہو گئے..

آتنا ہی شوق ہے کہ وہ میرے کو بھی نہیں جانتی؟... اس سے کہنا کہ آج ضرور چلے  
 ہاں... جاویدا! مجھے گھر کا سارا سارا دن کام کرنے کا شوق ہے اور یہ شوق  
 مجھے گھر سے باہر نہیں بھی نہیں جانے دیتا... تم دیکھتے نہیں کہ گھر کے اس شوق کے  
 کارن میری محنت اچھی ہوتی جا رہی ہے؟... اور میں کتنی مسرور ہوتی ہوں...  
 اور میرے نام سے کتنی زور پڑ جاتی ہوں... لیکن تم کی جان سکو گے!...  
 اور میں نے فرخندہ سے کہا... میں نہ جا سکوں گی... گھر کا کام کون کرے  
 گا؟...

میں اب کیوں جاویدا کو اپنا چہرہ دکھاؤں... میں اب اُس کے سامنے کہیں  
 جاؤں؟... اب میں کبھی اس کے سامنے نہیں آؤں گی... اگر جاوید نے مجھے لڑی  
 نظر انداز کر دیا، جیسے کوئی سلیٹ پر بھی ہوئی عہارت مٹا دیتا ہے، تو میں کیوں اُس  
 کے سامنے جاؤں؟... میں رور و کر اس سے کبھی نہ کہوں گی... کہ جاویدا یہ تم کیا کر رہے  
 ہو؟... تم سارا سارا دن سیدہ کے ساتھ گزارتے ہو تم کیا مجھے ایسا کہے لئے...  
 چھٹیاں کر کے آئے ہو... یہ تم کیا کر رہے ہو کیا تمہارے لئے ایسا کرنا مناسب  
 ہے... خدا کے لئے واپس پلٹ آؤ جاویدا!... مجھ اکیلی کو چھوڑ کر نہ جاؤ...  
 سیدہ کو اکیلا چھوڑ دے گے تو وہ پھر بھی اکیلی نہ ہوگی... اس کے بہن بھائی اور  
 والدین ہیں۔ وہ مسرور دل کی مالک ہے... غم اسے چھوڑ بھی نہیں گیا...  
 لیکن مجھے نہ چھوڑوا کیلے، ورنہ میں مر جاؤں گی... لیکن میں جاوید سے یہ  
 بات کیوں کہوں اگر اس کے دل میں اپنے آپ میرا خیال نہیں ہے تو میں کیوں  
 محبت کے واسطے دے دے کر اسے اپنا بناؤں...

جاویدا اگر جاتا ہے تو چلا جائے... ہٹک چلا جائے... میں اسے کبھی  
 نہ روکوں گی... میں اپنی زندگی اپنے اس چھوٹے سے کمرے میں بند رہ کر گزاروں  
 گی... اور میں نے سب سے سختی کے ساتھ کہہ دیا کہ نہیں جاؤں گی۔ امی کی بڑی  
 بہن کہنے لگیں...

لیکن کیا سعیدہ کے ساتھ بھیجا کو جاتے ہوئے کوئی نہیں دیکھتا... تمہارے  
بھیا کو ڈر ہو گا نا کہ کہیں سعیدہ یہ رقعہ نہ دیکھ لے تو بھیجا سے کہہ دینا کہ میں ایسی ذلیل  
نہیں ہوں... اُن کو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے... میں سعیدہ کو کیوں  
بتاؤں؟... اور پھر ایک دم میرا دل بھر آیا... ابریں نے وہیں بیٹھے بیٹھے رونا  
شروع کر دیا... فرخندہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی... اور پھر میں بنے فرخندہ سے  
کہا۔

فرخندہ پہلے تم مجھے پیار کرتی تھیں... تمہاری امی مجھ سے پیار کرتی تھیں۔  
جاوید مجھ سے پیار کرتا تھا... لیکن اب؟... اب تم سب لوگ سعیدہ کو پیار کرتے  
ہو... اب وہ تم سب لوگوں کو اچھی سمجھتی ہے... لیکن مجھے یہ بتاؤ کیا سعیدہ بھی کسی  
ادر کے آنے پر رو کر دی جائے گی یا صرف مجھی کو رد کیا گیا ہے... کیا مجھ سے پہلے  
بھی تم لوگ کسی ادر کو پیار کرتے تھے؟...  
فرخندہ! مجھے بتاؤ... کیا میں اب تم کو اچھی نہیں سمجھتی...؟  
لیکن فرخندہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا... اور وہ چپکے سے اٹھ کر چلی  
گئی...!

آج فرخندہ آئی... تو اس نے ایک رقعہ لا کر دیا... کاغذ کا چھوٹا سا  
پرزہ تھا... سکھاتا تھا...!

کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ مگر کیوں؟  
جواب ضرور دینا...  
تمہارا...!

جاوید نے نہ اور میرا نام سکھاتا اور نیچے اپنا نام سکھاتا اور کھائی بھی کچھ بلی ہوا  
تھی... میں باورچی خانے میں ہی بیٹھی تھی جب فرخندہ یہ رقعہ لیکر آئی، میں نے رقعہ  
پڑھ کر خاموشی سے اسے آگ کی تذر کر دیا۔ فرخندہ حیران ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی  
کہنے لگی...

باجی! جواب دو... میں بھیجا سے جا کر کیا کہوں؟  
میں نے کہا... فرخندہ! یہ رقعہ کسی اور نے سکھایا ہے، اس لئے میں نے  
جلا دیا ہے... جب تمہارے بھیا نکھیں گے تو جواب دے دوں گی۔  
لیکن فرخندہ کہنے لگی: یہ تو بھیجا نے ہی سکھاتا تھا!...  
لیکن نیچے نام تو نہیں سکھا ہوا تھا میں نے کہا۔  
فرخندہ بولی: بھیجا کہتے تھے... کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے...



وہاں خالہ ملیں... فرخندہ ملی... ان کی ایک دوا در بھی ملنے والیاں آئی  
 مہنی تھیں... میں بھی ڈرائنگ روم میں وہاں جا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے  
 بعد خالہ نے مجھے بلایا اور کہنے لگیں کیا ہم سے ناراض ہو جیہ بیٹی؟...

نہیں تو خالہ جان!...  
 پھر تم کھینچی کھینچی اور ادا اس کیوں رہتی ہو؟ تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے۔

جی نہیں خالہ جان... اچھی ہوں...  
 اور کسی نے خالہ کو آواز دی اور وہ ادھر چلی دیں۔ فرخندہ مجھے ساتھ لیکر  
 ابر آگئی....

رات ہو رہی تھی... اور آسمان پر ستارے چمک رہے تھے... رات  
 الی اور سیاہ تھی... میں باہر باغچے میں آکر کوٹھلی کو دیکھنے لگی ساری کوٹھلی روشنی  
 درختوں میں بر رہی تھی... اور اندر سے قہقہوں کی آواز آرہی تھی... جاوید  
 دیں نے ابھی تک نہ دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا تو جاوید فرخندہ کے ساتھ ادھر ہی آ رہا تھا...  
 بادل دھڑکنے لگا... میں نے آہستہ سے پیچھے کی طرف مڑنا شروع کر دیا، اور  
 بل درخت کے نیچے چھپ گئی۔ دونوں نے مجھے ڈھونڈنا شروع کیا... ادھر  
 دھر... اور پھر جاوید نے ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھا...

میں ایک درخت کے ساتھ لگی کھڑی تھی...  
 فرخندہ چلی گئی... جاوید میرے پاس آگیا... اور میرا چہرہ دونوں ہاتھوں  
 سے اُپر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھنے لگا...  
 مجھے جھوٹا دوا... میں نے خشک آواز میں کہا...

کیوں؟...  
 میں نہیں جانتی... تم کون ہو؟...  
 اتنی جلدی بھول گئیں؟...

آج جاوید نے ہم سب لوگوں کو اپنے گھر دعوت پر بلایا۔ امی نے مجھ سے  
 بھی کہا، مگر میں وہاں کیا کرنے جاتی...

سبھی جلے گئے... میں کھڑکی میں کھڑی ان کو جاتے دیکھتی رہی اور پھر وہیں ہاں  
 ہی کر سی پڑھ گئی اور خاموشی سے سوٹ بننے لگی... نین مہینوں سے سوٹ شروع کیا  
 ہوا ہے، مگر وقت ہی نہیں ملتا کہ ختم کروں...

عورتوں کو ہمارے یہاں چھوڑ کر امی کے بھائی وغیرہ جا چکے ہیں اب جب  
 یہ خط لکھیں گی وہ ان کو لینے آئیں گے...

تھوڑی دیر کے بعد خالہ کا نوکر آیا کہ بیگ صاحبہ کبہ رہی ہیں... جیکہ کیوں نہیں  
 آئی؟...

امی کہنے لگیں... میں نے کوئی اسے باندھ کر رکھا ہے؟ اور اگر وہ خود  
 نہ جانا چاہے، تو کیا میں اسے زبردستی بھیج سکتی ہوں؟... وہاں ادھر اپنے  
 کمرے میں بیٹھی ہے جا کر اس سے کہہ دو اگر وہ جانے کو تیار ہو تو لے جاؤ... اور جب  
 نوکر نے بتایا کہ کس طرح انھوں نے اصرار سے کہا تھا تو میں جانے کے لئے تیار  
 ہو گئی... میں نے کاسی رنگ کی ساڑھی باندھی اپنا سرنج کوٹ پہنا اور تیار ہو  
 کر اس کے ساتھ چل دی... اگر میں اچھے کپڑے پہن کر نہ جاتی تو امی کہتیں کہ تم  
 ہمارے بے عزتی کرتی ہو...

میں باتم ...؟

مجھ سے خفا ہو؟

میں کیوں خفا ہونے لگی...

اتنا عرصہ کہاں رہیں؟

میں آپ دونوں کے راستے میں حائل نہ ہونا چاہتی تھی...

ہم دونوں کون؟

اتنے معصوم نہ نہیں!

اور جاوید نے نہیں مجھے سختی سے دونوں ہاتھوں سے گرفت میں لے

... اور کہا ...

تم کو غلط فہمی ہوئی ہے ... میں اب بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔

میں نے سختی سے اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے کہا... بھڑکنا

"تو تم بہت ناراض معلوم ہوتی ہو..."

میں خاموش ہو گئی... اچانک میلرول بھر آیا... اور میں ایک دم بچ

بھڑک کر رونے لگی...

جاوید بھی خاموش ہو گیا...

کچھ دیر کے بعد میں نے آنسو خشک کرتے ہوئے اس سے کہا۔ جاوید

جاؤ مجھے چھوڑ دو... سیدہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی... اگر وہ تمہیں ڈھونڈ

ڈھونڈتے ادھر آگئی... تو میرے لئے یہ بہت بری بات ہوگی!

وہ مجھے نہیں ڈھونڈ سکتی...

ہاں بھٹیک ہے۔ جسے تم ڈھونڈو... وہ تمہیں کیوں ڈھونڈے؟

کیا اب تم مجھ سے نہ بولو گی؟

میرے بولنے اور نہ بولنے کا آپ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ آپ کی

اور رنجش ہے... آپ کو مجھ سے کیا؟

نہیں جلد ایہ بات نہیں ہے۔ تم نہیں سمجھتیں... اگر میں اس کے ساتھ سیر وغیرہ

اجاتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے محبت بھی کرتا ہوں۔

پھر اس کا کیا مطلب ہے؟

مطلب کا تو کوئی بھی واسطہ نہیں ہے...

جادو کہنے لگا... اہل میں وہ خود ہی میرے پیچھے آتی ہے!

بھٹیک ہے جادو! تمہاری ہر بات بھٹیک ہے... لیکن اب تم مجھے جانے

...

یوں نہیں جانے دوں گا...

اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیئے... ایک

دول کی گرفت اور مضبوط ہو گئی اور میرا سانس رکنے لگا... میں نے

ن کو پیچھے ہٹانے کی بہت کوشش کی... مگر میں اسے نہ ہٹا سکی... اس

بعد اس نے انتہائی سرگوشی میں خوابناک بھاری آواز میں کہا...

جلد! میں تم سے محبت کرتا ہوں، اور ہمیشہ کر دوں گا۔

لیکن مجھ میں بولنے کی بہت نہ تھی... میں چپ اس کے ساتھ لگی تھی

...

رات ہمارے سرول پر چھائی ہوئی تھی! اور درختوں میں ہوائیں سنار ہی

اور سردی بڑھتی جا رہی تھی...

میں نے انتہائی مذہم آواز میں اسے کہا۔ چلو اب اندر چلیں۔

لیکن بتاؤ کہ اب مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟

یہ میں نہیں بتاؤں گی...

پھر تم خفا ہو...

نہیں تو... ہے ہی کون جس سے خفا ہونا ہے...

اچھا... آج رات تم یہاں رہو گی؟

نہیں... میں نہیں سیدہ رہے گی...

تم چلی جاؤ گی؟...

ہاں... ہاں

پھر کب ملو گی؟...

مل کر کی کرنا ہے؟...

تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں!...

اب سیدہ سے باتیں کرو...

جید! اس نے سختی سے کہا... سیدہ کا ذکر نہ کرو... یہ بتا

تم کل ملو گی؟... تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔

لیکن کہاں ملو گی؟...

کسی نہ کسی طرح ملنے آجانا!...

گھر سے کسی طرح بھی نہیں آ سکتی...

تو آج یہاں رہ لو!

امی اور ابا خفا ہوں گے...

تم بزدل لڑکی ہو... ہر وقت امی اور ابا کا ذکر کرتی رہتی ہو...

سیدہ مجھے پسند ہے کہ وہ سیارہ لڑکی ہے...

میں چپ ہو گئی...

بتاؤ... آج رات رہو گی؟

ہاں رہوں گی...

سیدہ آج چلی جائے گی... پھر رات میں تم سے باتیں کر دوں گا

جانے لگا۔ اور کہا۔ میں اب چلتا ہوں لیکن وعدہ کرو جبکہ تم ضرور

میں خاموش رہی... اور جاوید چل دیا۔

جاوید کے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر تک وہیں کھڑی رہی

رات کی پراسرار اور سرد ہوائیں چل رہی تھیں اور آسمان پر ستارے جھلک رہے تھے...

اور میں اپنی زندگی کے متعلق سوچ رہی تھی کہ اس زندگی کا کیا بنے گا...

پھر پھل قدم اٹھاتی کوٹھی کے اندر داخل ہوئی... میزبانوں کے لئے کھانا چاچا چکا

تھا... ہم سب کھانے کے لئے بیٹھ گئے کھانے کے درمیان بہت سی باتیں

ہوتی رہیں... ہنسی... مذاق... قہقہے... سیدہ سب سے زیادہ چہک رہی

تھی اور جاوید بڑھ چڑھ کر اس کی باتوں میں حصہ لے رہا تھا... میں میز کے کونے

کی طرف بیٹھی تھی اور یہ دونوں بیچ میں آئے سانسے بیٹھے تھے... کھانے کے بعد

ہم سب جانے لگے۔ اب میں نے سوچا کہ یہاں رہنے کے متعلق میں کیسے کہوں

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک سیدہ کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا

... سب لوگ گھر گئے... اس نے توجہ خیزوں سے آسمان سر پر اٹھایا۔ خالہ بھی

بہت پریشان ہوئیں...

جاوید نے دوائی پلائی، بستر پر لیا اور نبض دیکھی اور پھر اس بیٹھ گیا گرم

پانی کی بوتل سے سینک کی لگئی... ہر کدھ آدھ گھنٹے کے بعد دوائی پلائی...

دوا لکھن لگائے...

اتنا کچھ ہوا، تب کہیں جا کر اس کا درد کم ہوا... اب سیدہ کیسے جا سکتی تھی!

نہیں نے کہا... خالہ! میں سیدہ کی تیمارداری کے لئے یہاں رہوں گی...

لیکن سیدہ کی آبا اور امی کتنے یگیں... بیٹی جیکہ! ہم دونوں یہاں رہیں گے تم چلی

جاؤ تمہاری ماں اکیلی ہو گی اور وہ راہ دیکھ رہی ہو گی تم جا کر سارا حال بتا دینا...

اور کہہ دینا کہ اب سیدہ کو آرام ہے، فکر کی کوئی بات نہیں...

بہت اچھا، کہہ کر میں نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جاوید نے میری

طرف دیکھا...

لیکن میں کیسے رہ سکتی تھی؟... اور پھر کیوں رہتی؟... جاوید دونوں

کشتیوں میں سوار ہونا چاہتا تھا... یا شاید وہ محض رسمی طور پر مجھ سے معذرت چاہ رہا تھا... ورنہ اگر اسے مجھ سے محبت ہوتی تو وہ ہرگز گوارا نہ کرتا... کہ مجھے بدگمانی ہو جائے... اور سیدہ سے بول تعلقات نہ بڑھاتا... میں نوکر کے ساتھ اپنے گھر آگئی... گھر آن کر میں نے امی کو بتایا لیکن تب بھی دے دی کہ وہ اب ٹھیک ہے اور پھر سونے کے لئے اپنے کمرے میں آ... اور سونے کی ناگ کو شش کرتے ہوئے بستر میں پڑی رہی۔ لیکن نیند آ... کا نام نہ لے رہی تھی... پھر اٹھ کر بیٹھ گئی اور Best for life ناول نکال پڑھنے لگی... اور پھر نہ جانے کب سو گئی!

سیدہ دودن کے بعد گھر واپس آگئی ہے۔ ان کو یہاں آنے ڈیڑھ ماہ ہو گیا ہے...

کل خالہ زینت آئی تھیں... اور سب سر جوڑ کر بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں... نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی رہیں؟!... میں باہر باغچے میں دھوپ میں کتنی ہی دیر لیٹی نیلے آسمان کو دیکھتی رہی۔

رات اباجان سے باتیں ہوئیں... گھر خط ڈالا گیا اور خالہ کو دوسرے دن امی نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی...

دوسرے دن بھی تیاری کرنے لگی... سیدہ نے سرج بناری ساڑھی باندھی امی کی والدہ اور بہنوں نے مل کر بہت سے کھانے تیار کئے... اور... شام کو جاوید خالہ فرخندہ فرخندہ کی سہیلی... خالہ جان اور فرخندہ کی نانی اماں اکن پہنچیں...

سیدہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنائی گئی... اور خالہ نے اسے مبارکباد دی... ان لوگوں نے مجھ سے آخری وقت تک سیدہ کی منگنی کا حال چھپایا... اور جاوید... اس نے میری رتی بھر پردا کئے بغیر میرے سامنے سیدہ سے منگنی کر لی...

اس منگنی میں امی نے مجھے بھی نئے کپڑے پہنے کو کہا...

جی بھر کر خوشی مناؤ... اور تم بھی جاوید خوب ہنس رہے ہو گے... خوش ہو سہو  
ہو گئے!!...

اے میرے آسودہ اتم تو قہم جاؤ... رک جاؤ...  
اے تاریک رات!... اے آسمان پر چکنے والے ستارو! بتاؤ میری  
صبح کب ہوگی؟... روشنی کب اپنا چہرہ دکھائے گی؟...  
اے میری بد نصیب محبت!... سو جا، اپنی آنکھیں بند کر لے ابھی تو زندگی کی بہت  
سی راتیں یونہی بسر کرنی ہیں... ابھی تو ہزاروں دیرالزل کو طے کرنا ہے...  
ابھی سو جا... سو جا... میری بد نصیب محبت، سو جا!!...

لیکن میں نے کہا... اُمی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں، مجھے ہانول  
کو کھانا کھانا ہے... میں کیسے کپڑے پہن لوں؟... اور میں سب کے دریاں  
سہنی پھرتی تھی کہ کہیں یہ لوگ مجھ پر کوئی الزام نہ لگا دیں ان لوگوں نے بھی جاوید کو...  
انچوٹھی سینائی... رد مال دیا... جب یہ جانے لگے اور جاوید ڈیوڑھی میں آیا تو  
اس وقت کوئی نہ تھا۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا سہو رہا تھا... میں ساتھ کے کمرے میں  
سے نکل کر آئی تو اسے دیکھ کر... ٹھٹھک گئی... جاوید نے میری طرف دیکھا...  
میں پاس سے گزرنے لگی... تو جاوید دروازے میں کھڑا ہو گیا...  
میرا چہرہ ایک دم اتر گیا... میرا دل ویران ہو گیا...  
منگی مبارک ہو جاوید صاحب!...

جاوید کھیانی سہنی سننے لگا... یہ کہہ کر میں تیزی سے باہر نکل آئی اور جاوید  
کی آواز دور تک میرا تائب کرتی رہی... جمیل! ایک لمحہ کے لئے بھڑو... میری  
بات تو سن لو!!...

تمہاری بات سن لوں... ہاں ہاں ضرور سنوں گی... اب کہنے کے لئے تیار  
پاس کیا ہے جاوید؟... اب تم اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے ہو؟...  
اور میں سیدھی اپنے کمرے میں آئی... زور سے دروازہ بند کیا اور بستر پر  
کرچھوٹ بھوٹ کر رونے لگی... دو گھنٹے تک مسلسل روتی رہی... جی چاہتا تھا  
کشی کر لوں... یوں لگتا تھا... جیسے جاوید نے میرا مذاق اڑایا ہے... ہر شخص  
میرا مذاق اڑایا ہے... ساتھ کے کمروں سے سہنی اور قہقہوں کی آوازیں آرہی  
تھیں... اور مجھ یوں لگتا تھا جیسے یہ لوگ میری شکست پر دل کھول کر ہنس رہے  
ہیں....

اے ظالم لوگو! ہنسو... اور جی بھر کر سہنو... میری محبت کی لاش کو گدھوں  
طرح تو چوراہہ پر منڈل کا عرق چھڑکنے کی بجائے اسے بے شک جوتیوں کا مار سہنا  
تمہارے شہروں میں محبت کا یہی حال ہوتا ہے... خوب خوشی مناؤ... آج کا

مجھ سے صرف سختی سے ہی بولنا چاہیے۔ اگر وہ اسی طرح پیار سے بولتے رہے  
تو میں رد و کر پاگل ہو جاؤں گی۔ زندگی میں چند لمحوں کے لئے سہارا کی کتنی مگر اپنے  
پچھے خزاں کو چھوڑ کر چلی گئی... ایسی خزاں جو زندگی بھر میرا ساتھ نہ چھوڑے گی...  
جاوید! تم نے میرا ذرا سا بھی خیال نہ کیا... یقین نہیں آتا کہ تم ایسے بے وفا  
ہو گئے ہو...

کاش! جاوید تمہیں خیال آجاتا... ذرا سا ہی خیال آجاتا، کہ تم نے مجھ سے  
خدا کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ تم ہمیشہ کے لئے میرے ہو!!

سعیدہ کی امی وغیرہ سب کو چلے جانا تھا... یہ لوگ میرا امن اور چین لوٹنے  
آئے تھے... لوٹ کر چلے ہی جاتے، مگر امی کی وجہ سے نہ جاسکے۔ رات ان کی  
کے بال لڑکا پیدا ہوا ہے، یعنی میرا بھائی پیدا ہوا ہے... اگر یہ واقعہ نہ ہوا ہوتا  
... تو نہ جانے میں کتنی خوش ہوتی... مگر زندگی کی ہر خوشی مر جھا چکی ہے... جاوید  
بھی رات آیا تھا۔ جب تک وہ ادھر رہا... میں باورچی خانے سے باہر نہ نکلی...  
خاموش سارا کام کرتی رہی... سعیدہ اس کے سامنے بیٹھی اسے ناز و ادا سے  
دیکھتی رہی... مسکراتی رہی... اور جب تک وہ یہاں رہا، سعیدہ چند لمحوں کے  
لئے بھی اٹھ کر ادھر سے ادھر نہ گئی... اسے دروازے تک چھوڑنے لگی...  
اور مجھے دُور سے اُن کے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی رہی... اس کے بعد  
سعیدہ بھاگتی ہوئی منرے سے اندرائی اور چل کر ناز سے امی کے پاس بیٹھ گئی  
نخنہ کو گود میں لے کر اسے یاد کرنے لگی...

اباجان آئے... وہ بیٹے کے پیدا ہونے پر اس قدر خوش ہیں کہ جس  
کی کوئی انتہا نہیں... مجھ سے بھی بہت پیار سے باتیں کرتے رہے...  
نہ جانتے کیوں... جب اباجان پیار سے بات کرتے ہیں تو مجھے رونا آجاتا  
ہے اور میرا دل اداس ہو جاتا ہے، یقین نہیں آتا کہ ابابھی مجھ سے پیار سے بول  
سکتے ہیں... نہیں، ابابھی مجھ سے پیار سے نہیں بولنا چاہیے... ابابھی تو لعس لہ

آہا کرتی رہیں... سعیدہ آج بھی جاوید کے ہاں رہی... شام کو جاوید اسے...  
پھونسنے آیا۔ میرے بنجار کا پتہ چلا۔ آبا کہنے لگے... بیٹا! تم ڈاکٹر ہو... ذرا  
دیکھو تو میری بیٹی کو بنجار ہو گیا ہے۔

یا اللہ! یہ ابا آج اس قدر آزاد خیال کیسے ہو گئے؟... کہ جاوید سے خود کہہ  
رہے ہیں کہ جیلر بیٹی کو دیکھو... یا اللہ! یہ آبا کے دل میں میرے لئے محبت  
کہاں سے پیدا ہو گئی؟...

یہ میرا کتنا خوش قسمت بھائی دنیا میں آیا ہے کہ اس کے آنے پر ہر ایک کا دل  
پیار سے بھر گیا ہے۔ جاوید مجھے دیکھنے کے لئے آبا کے ساتھ میرے کمرے میں آیا  
میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا...

”بیٹی! جاوید بھیا آئے ہیں... لو ان کو اپنا حال بتاؤ کہ بنجار کیسے ہو گیا؟...  
جاوید! وہ میرا حال پوچھنے کے لئے آئے... نہیں نہیں ابا! آپ سے  
زبردستی بے آئے ہیں... میں اسے اپنا حال کبھی نہ بتاؤں گی چلے جاؤ جاوید۔  
چلے جاؤ... میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو...“

میں نے ان لوگوں کو دیکھ کر جلدی سے لحاف منہ پر کر لیا... اور آبا جان  
سے بولی...

میں بالکل ٹھیک ہوں... میں ان کو نہیں دکھاؤں گی!...  
ارے کیوں؟  
میں نہیں دکھاؤں گی!

آبا ہنس کر کہنے لگے... لگی بیٹی! بھلا بھیا سے کیوں شرماتی ہے؟ اچھا  
جہرے پر سے لحاف مت ہٹاؤ... ہاتھ باہر نکال کر نبض دکھا دو ابا کا حکم مانتا  
نرود کی تھا...

میں نے لحاف سے اپنا ہاتھ باہر نکال دیا... جاوید نے پھر ذکر نبض دیکھی...  
میرا ہاتھ سرد تھا... اور لرز رہا تھا... اور جب جاوید نے ہاتھ پھڑپھڑا تو میری عیب

رات سے سخت بنجار ہے... صبح بستر سے ہلانگ نہیں جا رہا تھا۔ آبا  
پتہ چلا، وہ دیکھنے آئے، پیار سے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگے۔  
بیٹی! کوئی فکر نہ کرو... بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔

اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے...  
واہ لگی! اتنی سی بات پر رو رہی ہے... لگی بیٹی اتنی بڑی ہو گئی اور  
دیکھ بچوں کی طرح رو رہی ہے۔ مت رو میری بیٹی! آج سارا دن آرام کرنا۔  
شام تک بالکل ٹھیک ہو جائے گی!...

میرے ابا! تمہیں کیا پتہ کہ تمہاری بیٹی کے دل پر کیسے کیسے زخم لگے ہیں، جواب  
کبھی مندل نہیں ہونگے... آبا! تمہیں کیا پتہ کہ تمہاری بیٹی کی دنیا اپنے سے پہلے اجڑ  
گئی ہے! اس کے چمن میں اب کبھی بہار نہ آئے گی... کوئی پھول نہ کھلے گا۔  
اس آسمان پر اب کوئی سورج... کوئی چاند طلوع نہ ہو گا...

پیارے ابا! اپنی بیٹی کی بد قسمتی پر جی بھر کر آنسو بھراؤ... یقین کرو آبا تمہاری بیٹی  
کی قسمت میں اب کوئی خوشی نہیں ہے...

لیکن میں آبا سے کچھ بھی نہ کہہ سکی اور پھیک سی ہنسی پنس کر کر وٹ بدل لی... اور  
چلے گئے... رات تک بنجار نہ اترتا... امی بیٹے کے پیدا ہونے پر بہت  
خوش ہیں... سارے گھر والے خوش ہیں... آج باورچی خانے کا کام امی کی

کیفیت ہو گئی!

اس کے بعد جاوید ابا کو اپنے ساتھ ہی لے گیا کہ نسخہ وغیرہ کچھ کچھ جا کر دوائی بھی  
دونگا... بے وفا جاوید! جسے اب میرے سامنے آتے ہوئے بھی شرم نہ  
آتی... مرد کس قدر ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ اسے دوسرا بھی خیال نہیں آیا... کہ میں  
اس کے سامنے کیسے جاؤں!؟...

مجھے بخار چڑھے آج بارہواں دن ہے... اتنے زور کا بخار چڑھتا ہے  
رجیم کا انگ انگ دکھنے لگتا ہے۔ سعیدہ، اس کی امی اور بہنیں چلی گئی ہیں، کیونکہ  
ن کے والد صاحب لینے آئے تھے...

امی نے کام کے لئے ایک نوکرانی رکھ لی ہے... میرا بخار کبھی وقت بھی نہیں  
رہتا... بہت کمزور ہو گئی ہوں۔ تیمار داری کے لئے کوئی بھی نہیں ہے...  
طوفان آن کر گزر چکا ہے... مجھے نڈھال کر کے چھوڑ گیا ہے جاوید اس بار امتحان  
نہیں دے گا۔ اس لئے کالج چھوڑ کر آ گیا ہے کہتا ہے اب پڑھنے میں جی نہیں لگتا  
۔ دونوں وقت اکیلا انجکشن لگانے آتا ہے... کہتا ہے۔ جمیلہ! یہ تم نے اپنی  
یہ حالت بنا رکھی ہے؟... سوکھ کر کاٹا ہو رہی ہو! بخار کو دور کر دو اور خوش رہا کرو  
... یقین کرو میں تم سے اب بھی پیار کرتا ہوں، میری منگنی اگر سعیدہ سے ہوئی ہے تو  
وہ صرف امی کی دہر سے!!

خدا کے لئے جاوید صاحب! یہاں آن کر آپ ایسی باتیں نہ کریں! آپ  
ڈاکٹر کی حیثیت سے آتے ہیں... آپ ایک غیر مرد ہیں۔ آپ کو کیا حق حاصل ہے  
کہ آپ مجھ سے اس طرح باتیں کریں! میں نے کب آپ سے پوچھا ہے۔  
کہ آپ کی سعیدہ سے کیسے منگنی ہو گئی ہے؟

جب میں یہ کہتی ہوں تو جاوید مجھے تینے لگتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے اور انجکشن



لگا کر چلا جاتا ہے... اور جب وہ چلا جاتا ہے تو میں بستر میں منہ چھپا کر بہت ہوں... خالہ بھی دو تین بار میری عیادت کو آچکی ہیں... صبح پھر جاوید انجکشن لگانے آیا تو کہنے لگا - جمیلہ! تم جو مجھ سے اس طرح پیش آتی ہو تو اس میں آخر میرا کیا ہے؟... جاوید صاحب! آپ بہت معصوم اور سبھوے بن رہے ہیں گناہ کرنا نہیں، میرا ہے...

جمیلہ ایک بات تم سے پوچھوں... تم بڑا تو نہ مانو گی؟... نہیں... میں کیوں بڑا مانتے سگی... اب بڑا ماننا نہ کورہا ہوا ہے؟... تو سنو... یہ سلیم صاحب کون ہیں؟... اور تمہارے ان سے کیسے تعلق رہ چکے ہیں؟...

جاوید کے منہ سے سلیم کا نام سن کر میں تڑپ سی گئی... اور میں نے کہہ دیا... یہ سلیم... یہ سلیم وہی ہے نا... جس سے میری منگنی سوجھ چکی تھی... لیکن بات کیا ہے؟ بھلا میرے اس سے تعلقات کیوں گئے؟... آپ کو جاوید صاحب یوں نہیں کہنا چاہیے تھا... معاف کرنا جمیلہ! میں آج پوچھنے پر مجبور ہو رہی ہوں... تو یہ منگنی وجہ سے ٹوٹی؟...

سلیم بہت آوارہ لڑکا تھا... اتنے جاتے تنگ کرتا تھا اور مجھے یہ پسند نہ آتی... اس لئے میں نے ابا سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہاں نہ کروں گی۔ بس یہی بات تھی!...

تم ان کے یہاں کتنے سال تک رہیں؟... میں سات سال تک چچی کے پاس رہی لیکن جاوید آپ کو کس سب کچھ بتایا؟...

مجھے امی نے بتایا تھا اور انھیں تمہاری امی نے بتایا تھا... اور جمیلہ! مجھے تو یقین نہیں آتا لیکن تمہاری امی نے بتایا تھا کہ تمہارے اور اس کے درمیان شادی شدہ رشتہ ہے تعلقات بھی رہ چکے ہیں!!

یہ سب کچھ جھوٹ ہے جاوید صاحب!... کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں ایسی لڑکی ہو سکتی ہوں؟... اس نے کئی بار ایسی کوشش کی تھی... مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا...

جمیلہ! آج میں تمہیں یہ حقیقت بتاتا ہوں اور یہی وہ باتیں تھیں جو میں تمہیں اس ات بھی بتانا چاہتا تھا جب تم ہمارے گھر نہ رہ سکی تھیں پہلے امی کا خیال صرف ہمارے ساتھ میری شادی کرنے کا تھا... وہ تم کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں اور جب انھوں نے تمہاری امی سے اس رشتے کے متعلق کہا تو انھوں نے وہ وہ انہیں امی کو بتائیں کہ امی حیران پریشان ہو کر گھر آگئیں... اور انھوں نے مجھ سے کچھ بتایا۔ لیکن میں نے امی سے کہا... امی یہ کبھی نہیں سو سکتا... جمیلہ یہی لڑکی نہیں ہے وہ چونکا اس کی سوتیلی والدہ ہے اس لئے ایسا کہتی ہے اب امی کے دل میں کانٹا کھٹک گیا تھا... اس کے بعد سعیدہ آگئی... اس مال اور نہیں بھی!... انھوں نے بڑھ چڑھ کر تمہارے خلاف امی کو کر دیا اور تم نے میری ایک نہ سنی اور سعیدہ سے منگنی کر دی۔

جاوید کی باتیں سن کر میرا چہرہ لیمو کی طرح زرد پڑ گیا اور مجھ میں بات تک کرنے کی طاقت نہ رہی۔ میں کچھ دیر تک خاموش رہی اور پھر جاوید کو تکنے لگی۔ جاوید بھی میری طرف بھٹک رہا... اس کے بعد میں نے کہا۔

جاوید! ایک بات پوچھوں؟

ہاں پوچھا...

جاوید! کیا محبت اتنی ہی کمزور ہوتی ہے اور کیا اتنی جلدی بدل جانے والی ہوتی ہے کہ ذرا کسی نے بھڑکا دیا اور وہ بدل گئی... تو بس تمہاری محبت اتنی

ہی تھی کہ میرے خلاف محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے تم نے میری زندگی توڑ لیا؟ ... جاوید! اگر مجھے تمہاری کوئی ہزار ہا برائیاں بھی سنا تا۔ ہزار عجیب ظاہر کرنا تو محبت کبھی نہ بدلتی ... لیکن جمیل! مروان باتوں کو کبھی برداشت نہیں کرتا اور پھر میں تو امی! مجبور ہو گئی تھا ...

لیکن جاوید صاحب! صرف بزدل مرد ہی مجبور ہوا کرتے ہیں ... اب مجھ سے اور باتیں نہ ہو سکتی تھیں۔ میری طبیعت خراب ہونے میں نے اتنا کہہ کر خاموشی سے کر وٹ بدل لی ... اور دیوار کو تھکنے لگی ... کر! ... اور چند لمحوں کے بعد جاوید اٹھ کر چلا گیا ...

خدا کیس دن کے بعد ٹوٹا اور اب تین روز سے بالکل نہیں ہوا لیکن کمزوری ن قدر زیادہ ہے کہ بیان نہیں کر سکتی ... آبا جان بہت خیال رکھتے ہیں ... میرے پاس بیٹھے تھے، کہنے لگے ... جمیل! میں سوچتا ہوں۔ میں نے تمہاری کوئی خدمت نہیں کی، نہ جانے تمہاری لگی دینا میں مجھے کیا کہتی ہوں گی ... اتنا کہہ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ... انہیں نے اپنی زندگی کے بیس سال گزارنے کے بعد پہلی بار آبا کے منہ سے اپنی یاد کرنا تھا ... مجھے بھی نہ جانے کیا ہوا کہ رونے لگی ... مت رو بیٹی! جب تک تیرا باپ زندہ ہے، وہ تجھے رونے نہ دلیگا۔ اور آبا جان بہت دیر تک مجھے پیار کرتے رہے ... آبا جان زیادہ دیر تک میرے پاس بیٹھ جائیں تو امی کو غصہ آتا ہے اور وہ مجھ کو دینے لگتی ہیں ... بوں لگتا ہے جیسے آبا امی سے تنگ آتے جا رہے ہیں لیکن مجبور ہیں اور کچھ کر نہیں سکتے! ...

ای خدا! یہ ہم باپ بیٹی کس مشکل میں پھنس گئے ہیں! ... خدا یا! ایک بچہ جاتا، اگر تو تمہاری امی کو زندہ رہنے دیتا ... پھر سے گھر کے یہ حالت نہ ہوتی ... پھر ہمارے دلوں کی یہ حالت ہوتی!!

پھر ہمارے لئے بھی بہت خوشیاں ہوتیں ! ...  
کاش ! آباہی دوسری شادی نہ کرتے ! کاش ! ...

چھ مہینے یہاں گزارنے کے بعد اب آبا جان کا تبادلہ پھر لاہور ہی ہو رہا ہے  
.. کل تک یہیں سارا سامان باندھ لیا ہے ، اور اس شہر سے رخصت ہو جانا ہے  
سب خوبصورت پہاڑی علاقے سے ، جس کے چپے چپے سے مجھے پیارا و محبت  
ہے ... اگرچہ یہاں کا عرصہ میں نے اس کو کھٹی میں ہی رہ کر گزارا ہے اور تین چار  
رہبر کے علاوہ پھر کبھی سیر کو نہیں گئی لیکن پھر بھی یہاں کے چپے چپے سے مجھے محبت ہو  
تا ہے ۔ میرا جی چاہتا ہے ، میں آبا جان کے ساتھ یہاں سے واپس نہ جاؤں ؎  
یہیں چھپ جاؤں اور جب یہ سب لوگ چلے جائیں تو نکل آؤں اور اکیلے اس کو کھٹی میں  
رہوں ... ان پہاڑوں پر آزاد پرندوں کی طرح اڑوں ۔

پہاڑوں کو چھوڑ کر گندے شہر میں جانے کو میرا ذرا جی نہ چاہتا تھا زندگی بھلی یا  
بری ، جیسی بھی ہے ، یہاں اچھی گزر رہی ہے ... شہروں میں گندے اور ذلیل  
لوگ بستے ہیں ... مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہے !

اے جاوید کے سانسوں کی مہک میں بسے ہوئے پہاڑو ! داد لیو ! اور ٹیلو  
کل یا رہوں ہم تمہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے اور شاید پھر یہاں کبھی نہ آئیں ...  
جاوید ! ہم تیرا شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں ... اس حسین وادی کو چھوڑ کر جا رہے ہیں  
جسے میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گی ۔ وہ وادی ... جہاں برف پوش پہاڑ ہیں ،  
انہما تیرا اور آلوچوں کے درخت ہیں ، پھولوں سے لدی نیوئی ڈالیاں ہیں خوشبو

آلود ہوا میں ہیں، مترنم آہن ریں ہیں، خوبصورت سپاڑوں اور صحت مند چرواہوں ہیں... جو جلد کو دھوکہ دے کر سعیدہ سے منگنی نہیں کر لیتے...  
 وادیلوں کے خوبصورت نشیب و فرازا! اور اونچی نیچی چگڑا ٹڈیوں میں تہیں چھو جابار ہی مہل...!

موسم خزاں میں جب زرد پتوں کے ڈھیر سپاں لگ جاتیں گے اور ہماری کوا میں داخل ہونے والے سارے راستے زرد پڑ جائیں گے تو اسے پتوں کو تہہ پہاڑ بھی یاد کر لینا...!

خام ہو رہی ہے۔ چمکیلی دھوپ ماند پڑ گئی ہے۔ مغربی سپاڑوں پر سفید بادل فتن کی لالی میں ڈوب چکے ہیں... شام کے سائے وادیلوں میں پھیل گئے ہیں اور ہوائیں تیز ہو رہی ہیں۔ میں کھڑکی میں کھڑی باہر کا منظر دیکھ رہی ہوں... دوران سپاڑوں کے پیچھے جاوید کا مکان ہے... وہ اس وقت منرے سے بیٹھا ہوگا قہقہے لگا رہا ہوگا۔ ہائے! جاوید کس قدر ظالم ہے۔ اسے میرا بالکل خیال ہی نہیں آیا...! کاش! جس طرح وہ مجھے بھلا بیٹھا ہے۔ میں بھی اسے بھلا سکتی۔ لیکن میں جاوید کو کبھی نہ بھلا سکوں گی... کبھی نہ بھلا سکوں گی۔ یہاں سے جانے کے بعد بھی میں راتوں کو سپہروں اٹھ اٹھ کر رو دیا کروں گی... پتہ نہیں آئندہ بسر کرنے والی زندگی کیسی ہے؟ امی اندر ہی اندر میری شادی کا پلکا پر وگرام بنا رہی ہیں۔ اور امی اس قدر سخت اور ظالم عورت ہیں کہ جس سے، میری ٹوکیا مجال، آبا بھی ڈرتے ہیں اور ان کو ان کی ہاں میں ہاں ملانا ہی پڑتی ہے...

سعیدہ وغیرہ کے آنے کی وجہ سے پھر ہمارے ہاں بھائی کے پیدا ہونے کے سبب ان وجوہات سے میری شادی کا معاملہ دبا ہوا تھا... پھر میرے بیمار ہونے کے باعث امی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ یہ ذکر پھیریں اور اب تو ہر وجہ ہی ختم ہو چکی تھی... اور ہم واپس اسی لاہور میں جا رہے تھے... بس لاہور جانے کی اگر مجھے کوئی

خوشی تھی تو یہی کہ وہاں جا کر اپنی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھ سکوں گی... اگرچہ یہ بھی بات نہیں تھی... کیونکہ امی اور ابا تو کسی طرح مانتے ہی نہ تھے لیکن پھر بھی امید تھی میری صحت اب پیسے سے بہت اچھی ہو گئی ہے درجنہار نے تو مجھے بالکل کمزور کر دیا تھا... بھیا کے پیدا ہونے سے امی بہت معذور ہو گئی تھیں اور اب وہ اپنی بلو کو بھی اکثر جھڑک لیتی ہیں... اور وہ بلو جو سارا سارا وقت ماں کے پاس تھی اب میرے پاس بیٹھی رہتی ہے اور اپنی پیاری پیاری زبان میں باتیں کرتی رہتی ہے...!...

دو تین روز تک ہم یہاں سے چلے جائیں گے... امی کہہ رہی تھیں کہ لڑکھیزیت سے ملنے جائیں گے... لیکن میں نہیں جاؤں گی جب خالہ کو امی نے ایک ایک بات بتا دی ہے اور جاوید بھی جانتا ہے... تو میں ان لوگوں کے درمیان کیوں جاؤں؟...

ان لوگوں نے ان باتوں کو بڑا سمجھا جب ہی تو سعیدہ کو مجھ پر ترجیح دیدی نا۔ لیکن میرا دل ایک دم اُداس ہو گیا... بھلا مجھے کیا حق حاصل ہے جو میں ان سے میل ملاپ رکھوں اور مکے شکوے زبان پر لاؤں...

رات گہری ہو گئی ہے اور سردی بہت تیز چلنے لگی ہے۔ میں نے کھڑکی بند کر دی ہے... اور کرسی پر آن کر بیٹھ گئی ہوں... آج دل بہت اُداس اور دیران ہے زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو اب شاید کبھی پُر نہ ہو سکے گا!...

آج ہم خالہ زینت سے ملنے کے لئے اُن کی کوٹھی پر گئے۔ میں جانا نہیں... چاہتی تھی۔ لیکن امی اصرار کر کے ساتھ لے گئیں... میں اُداس تھی خالہ کہنے لگیں...

جیدہ بیٹی بہت اُداس ہے... کیوں اُداس ہو؟ یہاں سے جانے کا صدمہ ہو گا... انسان جہاں رہے اس جگہ سے مانوس ہو ہی جاتا ہے نا آخر! ہم لوگ بھی تو آپ کے جانے سے بے حد اُداس ہو جائیں گے... آپ کے آنے سے بہت دل بہل گیا تھا اور کتنی رونق ہو گئی تھی...

خالہ یونہی امی سے باتیں کرتی رہیں اور میں چپ چاپ سنتی رہی جاوید اُگیا اور پھر سیر کا پروگرام بن گیا... فرخندہ، بلو، میں اور جاوید... میں کبھی سیر کو نہ جانا چاہتی تھی لیکن میں خالہ پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ مجھے یہاں سے جانے کا بہت صدمہ ہے اور یہ کہ میں جاوید سے ناراض ہوں۔ اس لئے تم سب سیر کو چلے۔ مئے اور میں بالکل انکار نہ کر سکی۔ آخر وٹوں، خد بانوں اور چغوزوں سے ہم نے اپنے کوٹ کی جیبیں بھر لیں اور کھاتے ہوئے چل پڑے...

ایک میل کے فاصلے پر نیچے نشیب میں چہرہ تھا۔ وہاں کی سیر کا پروگرام بنایا۔ جاوید نے بلو کو گود میں اٹھالیا اور میں نے فرخندہ کا ہاتھ تھام لیا اور ہم نشیب کی طرف اُترنے لگے... راستہ بے شمار درختوں اور رکاوٹوں سے اُٹا ہوا تھا لیکن

ہم کسی طرح وہاں تک پہنچ ہی گئے ...  
 وہاں پہنچ کر بتوا اور فرخندہ تکیوں کے پیچھے ادھر ادھر بھاگنے لگیں اور ہم  
 دونوں چشمے کے کنارے ایک اونچے سے پتھر پر بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھ کر جاوید  
 نے میرا ہاتھ پھریں لیکن میں نے سختی سے جھڑپا ...  
 اس خوبصورت وقت کو یوں بے دردی سے ضائع نہ کرو  
 میں خاموش رہی ...

’ہو لو نا جیلہ! شاید زندگی میں یہ وقت پھر آئے یا نہ آئے! کیوں نہ ہم اس سے  
 جی بھر کر لطف اندوز ہوں!‘ ...  
 اور پیرادل رواں تھا ... تو آپ بس وقت کو حین بنا کر گزارنا چاہتے ہیں۔ چاہے  
 اس میں کسی کی زندگی برباد ہو جائے، آپ کے نزدیک تو پھر سارا کچھ کھیل ہی  
 ہونا؟ ...

جاوید کہنے لگا ... میں تو اس چیز کے حق میں ہوں کہ زندگی کا جو لمحہ بھی خوبصورت  
 طریقے سے بسر ہو جائے وہی اچھا ہے ... کی تہ آئندہ لمحے ہم مری جائیں تو  
 پھر؟! ...

اور میری نگاہوں پر سے جیسے پردہ سائزگی ...  
 تو جاوید صاحب! آپ محبت کو بھی ایک خوش وقتی سمجھتے ہیں؟  
 چاہے وقت میرے ساتھ بسر کریا جائے، چاہے سعید کے ساتھ آپ  
 کی نگاہ میں کوئی فرق نہیں ....

ہاں بالکل نہیں ... پیاری لڑکیوں کے نزدیک جتنا بھی وقت گزر جائے وہی  
 اچھا ہوتا ہے ....

میں حیران ہو کر جاوید کو دیکھنے لگی ...  
 تو اس کا مطلب یہ تھا جاوید صاحب کہ اگر ہم دونوں کے علاوہ آپ کو اور بھی  
 لڑکیاں مل جائیں تو آپ ان کے ساتھ خوبصورت وقت گزارنے سے کبھی پرہیز

نہ کریں گے ...  
 ہرگز نہیں ... جب زندگی اس قدر بے ثبات ہو ... تو پھر انسان کو سہتے دریا  
 میں ضرور ہاتھ دھو لینے چاہئیں ...  
 میں آپ کو ایسا نہ سمجھتی تھی جاوید صاحب! ...

تم خود غلطی پر ہو چکے! اور نہ جانتی ہو دوسری صورت میں کیا ہوتا ہے انسان جلتا اور  
 کڑھتا رہتا ہے جس سے محبت کرتا ہے جب اُسے نہیں پاسکتا تو تمہاری طرح اپنا بڑا  
 حال کر لیتا ہے ... اور پھر اس کے لئے زندگی میں کچھ رہتا ہے اور نہ موت اس کے  
 پاس آتی ہے ... تو آپ کے نزدیک محبت محض بیکار شے ہے۔

بیکار شے نہیں۔ محبت سب سے زیادہ پیاری شے ہے۔ لیکن میں اس محبت  
 کا قائل ہوں جو زندگی کے لمحے دلچسپ بنائے جس کی قربت میں بیٹھ کر زندگی زیادہ  
 خوبصورت اور پیاری ہو جائے ... لیکن اگر وہ محبت جدا ہو جائے تو میں اسے صرف  
 طاقت سمجھتا ہوں کہ اس کی یاد میں رو رو کر زندگی کو روگ لگایا جائے ... یہی  
 وجہ ہے کہ ہمارے ملک کی لڑکیاں اس قدر باگل اور بوجھ بھرتی ہیں کہ کسی  
 کی ایک محبت بھری نظر کے بدلے میں ساری زندگی خراب کر لیتی ہیں۔ اور ایسی ہی  
 ہزاروں لڑکیاں دنیا کا شکار ہو کر ہسپتال میں پڑی ہیں ... اور میں تم سے بھی یہی  
 کہوں گا کہ جیلہ! زندگی کو روگ میں تبدیل نہ کرو۔ ہم نے یہاں جتنا اچھا وقت گزارا تھا  
 بس اسے غنیمت سمجھو اور ایسی ہی محبت اور جہاں کہیں بھی نہیں ملے۔ اسے اپنا لو  
 اور زندگی گزارتی جاؤ ... جاوید کی باتیں میرے ذہن کو پریشان کر رہی تھیں اسے متزلزل  
 کر رہی تھیں ... محبت کی طاقت اور وقت کو میری نظر دلوں سے گرا رہی تھیں، ہر چیز  
 اکھڑ رہی تھیں۔ اگر انسان یوں غیو بھی ملے اس سے محبت کرنے لگے ... تو کیا انسان  
 اپنا جین اور سکون نہیں کھودیتا؟ ... کیا وہ محبت میں لاندہب نہیں ہو جاتا پھر وہ  
 کسی ایک مرکز پر قائم نہیں رہ سکتا۔ آگ کو اگر گریچ میدان میں روشن کیا جائے اور  
 ہر کوئی تاپتا ہوا گزر جائے تو وہ بہت جلد اپنی حرارت کھودیتی ہے ... لیکن ایک

بند کمرہ کی انکھیٹی میں سردیوں میں جلی ہوئی آگ جو فائدہ دیتی ہے اور جس طرح گرمی پہنچاتی ہے وہ میدان کی آگ تو نہیں پہنچاتی ... اور میں نے پوچھا ...

تو جاوید صاحب! کیا آپ سعیدہ کو یاد نہیں کرتے؟ سعیدہ سے آپ کی منگنی ہو چکی ہے تو اب آپ کا فرض ہے کہ صرف اسی کے لئے وقف ہو کر رہیں۔ اور وہ صرف آپ کی ہو کر رہے۔ آپ کو تو سعیدہ کے ساتھ منگنی کر لینے کے بعد یہاں میرے پاس بیٹھ کر یوں باتیں کرنے کا بھی حق نہیں ہے! ...

یہ سراسر حیاالت ہے جلیلہ! اور تم لڑکیاں اس معاملے میں بہت جاہل ہو سعیدہ سے میری منگنی انجی نے کی ہے اور ہر ماں کو بھولا نے کا ارمان ہوتا ہے۔ سو منگنی ہو گئی جب تک وہ یہاں رہی ہیں اس کی Company سے لطف اندوز ہوتا رہا ... اب وہ چلی گئی ہے تو صرف اُسی کے تصور میں کھوجانا ... اور کسی اور سے کوئی بات نہ کرنا، یہ بے وقوفی ہے ...

تو کیا آپ سعیدہ کو خط نہیں لکھتے؟ ...

لکھتا ہوں ...

ہاں ... خط تو آپ ہر ایک کو لکھ لیتے ہیں ...

تو تم پھر مالو کس موہری ہو جلیلہ! ...

جاوید صاحب! آپ کی باتوں سے تو میں پریشان ہو گئی ہوں۔

تم پاگل لڑکی ہو ... زندگی سے لطف اندوز ہونا نہیں جانتیں۔ جب کبھی ہم

گئے۔ ہم یونہی ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر باتیں کیا کریں گے ... تو پھر زنجیدہ

ہونے کی کیا بات ہے؟ محبت میں رونا ٹھنڈی آہیں بھرنا اور جی کو جلانا ... یہاں

باتیں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں ... یہی وجہ تھی کہ میں سعیدہ کی طرف زیادہ مائل ہو

سعیدہ مہار، بے فکر اور شوخ لڑکی ہے۔ وہ زندگی سے پیار کرنا جانتی ہے۔

لیکن پیار میں رونا نہیں جانتی۔

میں خاموش بیٹھی سن رہی تھی۔ لیکن میرا دل اندر سے بیٹھا جا رہا تھا اور یوں لگتا تھا۔ جیسے ابھی گڑوں کی ... اس شخص کو میں سمجھ ہی نہ سکی کہ یہ کہنے ...

جاوید یہ باتیں کر کے اٹھا اور سامنے گھاس کا ایک چھڑا سا قطعہ تھا وہاں دھوپ آئی ہوئی تھی۔ جا کر لیٹ گیا۔ وہاں لیٹا ہوا جاوید کس قدر خوبصورت اور حسین لگ رہا تھا؟ ... میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے سینے سے چمٹ جاؤں اور جس سے کہوں ...

جاوید! صرف میرے ہو جاؤ ... صرف میرے ... اپنے ان خیالات کو ذہن سے نکال دو ... یہ ان کو خراب کرتے ہیں۔ جوانی اگر ان خیالوں کو کاٹ بھی دے تو بھلے ہیں ان کیلپن محسوس کرتا ہے ... دیکھو میری طرف ... میری آنکھوں میں آؤ اور دنیا میں اگر کسی کو دیکھو تو صرف مجھی کو ... کسی کو پیار کر دو تو صرف مجھی کو ... ساری دنیا چھوڑ دو ... ہم جنگلوں میں نکل جائیں گے ... اور وہاں۔

ایک خوبصورت گلیاں بنا کر رہیں گے جس پر بیلوں اور خوبصورت پھولوں کا سایہ ہوگا اور صرف ہم دونوں وہاں رہیں گے ... تم مجھ سے بے انتہا پیار کرنا

میں تم سے ایسا پیار کروں گی۔ جو کبھی کسی عورت نے کسی مرد سے نہ کیا ہوگا۔ ہم

وہاں چشموں کا پانی پیئیں گے اور درختوں کے پھل کھایا کریں گے۔۔۔ اور ساری زندگی

ویش گزار دیں گے ...

جاوید میرے ہو جاؤ ... زندگی میں جو نظریہ تم نے قائم کیا ہے، وہ بالکل

کھوکھلا ہے ... اس کی کوئی بھی بنیاد نہیں ہے۔ ایک روز یہ نظریہ تمہیں۔

آوارہ بنا دیں گے ... پھر تمہارا دل ہر لڑکی سے پھر جائیگا ہر لڑکی وقت گزاری کر کے تم

سے الگ ہو جائے گی اور اگر تم کبھی ہمارے ہو جاؤ گے تو کوئی تمہاری تیمارداری

نہ کرے گی ... اپنے ان خیالات کو بدل دو جاوید! زندگی ایک خوبصورت اور سہانا

خواب بن جاتی ہے جب دو دل ایک دوسرے سے سچا پیار کرتے ہیں ... اسی

کا نام زندگی ہوتا ہے لیکن ...

جاوید سامنے دھوپ میں لیٹا مسکراتا رہا ... اور وہ بالکل ہی نہ جان سکا کہ میں دل ہی دل میں اسی سے کیا کہہ رہی ہوں ...

فرخندہ اور بلونہ جانے کدھر نکل گئی تھیں ... میں نے کہا ...

پتہ نہیں فرخندہ اور بلوکہاں ہیں ...

جاوید نے کہا - یہیں کہیں کہیں رہی ہوں گی ...

اور میں اٹھ کر ان کو ڈھونڈنے لگی ... دونوں در در سانسے درخت کے

نیچے مزے سے بیٹھی بھولوں کا ڈھیر لگائے انھیں پرور ہی تھیں۔

میں پھر کسی پتھر پر بیٹھ گئی ...

جاوید کہنے لگا ... یہاں آ جاؤ ...

نہ میں یہاں ہی اچھی ہوں اور میں دُور خلاؤں میں کھو گئی۔

آخر جاوید کے بار بار اصرار کے بعد میں اس کے پاس چلی گئی۔

اس جاوید کے پاس جسے میں کبھی سمجھ نہ سکی جو میرے لئے بالکل معتد بنا ہوا

تھا ... اگر میں اس کے متعلق ایک نظریہ قائم کرتی تھی۔ اس کی باتوں سے ایک نتیجہ

اخذ کرتی تھی اور اس نتیجے کو سامنے رکھ کر زندگی کے متعلق سوچتی تھی تو دوسرے وقت

وہ کچھ اور باتیں کرنے لگتا۔ اپنے آپ کو کچھ اور ظاہر کرنے لگ جاتا ... پھر میں بھلا

اسے کیسے سمجھ سکتی تھی اب میں جاوید سے بھی خوف کھانے لگی ... پہلے ایک

ذلیل شخص سلیم میری زندگی میں داخل ہوا تو میں اس کے جسم سے نفرت کرتی رہی ...

اس کے جسم سے خوف کھاتی رہی ... اب یہ دوسرا شخص میری زندگی میں خواہ مخواہ

ہی داخل ہو گیا ... جس کے جسم سے تو میں نے کبھی خوف نہ کھایا۔ جس کے لئے

نے دل میں بے انتہا پیار محسوس کیا۔ لیکن جس کے خیالات نے مجھے پریشان کر دیا

ڈرا دیا ... خوف زدہ کر دیا کہ اگر اس شخص سے جس سے کہ میں محبت کرتی ہوں،

وابستہ بھی ہو گئی تو اسے کسی قید میں نہ لاسکوں گی۔ اسے اپنے پاس رکھ کر بھی اپنے

زنا سکوں گی۔ پھر ایسے شخص کا ہونا نہ مہونا بالکل برابر ہے ... یہ سوچتی ہوئی

اٹھ کر جاوید کے پاس جا بیٹھی ...

جیل! اب تو تم لاہور جا رہی ہو ... جب میں لاہور میں تھا تو تم یہاں تھا

اب تم لاہور جا رہی ہو تو میں یہاں ہوں ... بے ناچیل! ...

اور یہ کہہ کر اس نے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔ میں پرے ہٹنے لگی ...

یوں ظلم نہ کر دجید! کیا تیرے لئے پھر آئیں بانہ آئیں! ...

آپ کے لئے یہ لمحے آئے ہوں گے۔ لیکن میرے لئے تو یہ لمحے اب بھی نہیں

آئے ... اب آپ اٹھیں اور گھر چلیں۔ دیر ہو رہی ہے ... امی خفا ہوں گی

پھر وہی امی خفا ہوں گی ...

ہاں امی خفا ہوں گی ... جاوید صاحب! میرے اور آپ کے خیالات میں زمین

آسمان کا فرق ہے ...

سمٹ کر ایک شخص میں سما جانا اور اُسی کے لئے فنا ہو جانا ... میرے نزدیک

محبت کا مقصد اور محبت یہی ہے ... لیکن آپ بہک کر ہر ایک کی گود میں گرنے والے

ہیں ... ہمارے راستے الگ الگ ہیں! ...

میں کیوں کسی ایسے شخص کے ساتھ زندگی کے ایسے لمحے گزار دوں جو بالکل وقتی

ہوں! ... اور میں اٹھ کر فرخندہ اور بلوکو بلانے چل دی ... جاوید بھی اٹھ کر کپڑے

جھاڑنے لگا اور پھر ہم گھر کی طرف روانہ ہو پڑے !!

راستہ میں سوائے بلوا در فرخندہ سے باتوں کے اور کوئی خاص بات نہ ہوئی۔



باتو اباجان امی کو کیسے مجبور کر سکتے ہیں۔ امی کی اپنی میرمنی ہی ہوگی تو جائیں گی...  
 اس دفعہ ہم شاید اس مکان کو چھوڑ دیں کیونکہ امی کو بھی اب کوٹھی میں رہنے  
 عادت ہو گئی ہے اور اب ان سے یہاں نہیں رہا جاتا... کہتی ہیں کہ اوپر  
 بچے چھتوں پر جانا پڑتا ہے... اور کوٹھی میں تو سیڑھیاں نہیں ہوتی نا...  
 اور پھر جب سے میرا بھائی پیدا ہوا ہے۔ امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے  
 ان کے جوڑوں میں درد ہوتا ہے۔ کتنا اچھا ہو جو ہم کوٹھی میں چلے جائیں اور پھر  
 ہاں سے تو مجھے اپنا کالج بالکل نزدیک ہی پڑے گا نا... یا خدا! میری اس آرزو  
 ن لے...۔

ہم واپس لاہور اپنے اسی گھر میں آ گئے... اس شہر اور اس گھر میں داخل  
 ہوتے وقت میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں... ہمایوں سے گھرے ہوئے  
 مکان میں داخل ہوئی تو کئی کھڑکیاں کھل گئیں اور پھر باتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا  
 کئی ٹکڑیوں کی ان چھ ماہ کے اندر شادی ہو گئی۔ رشتہ کی شادی ہو گئی تھی لیکن اس  
 کی امی نے بتایا کہ خاوند اچھا نہیں لا... شادی کے تیسرے ہی روز اسے اپنے  
 لگا... اس کی امی کہنے لگیں لیکن میں نے بھی دو دن راز روپیہ حق مہر کھوایا ہے...  
 پھر اس نے امی کوٹھکے کی پیدائش کی بہت بہت مبارکباد دی اور پھر پوچھا...  
 تباد جیدہ کی بھی کہیں بات کی ہے یا نہیں؟... اب تو ماشاء اللہ جوان ہو گئی ہے  
 اس کی شادی کر دو...۔

امی کہنے لگیں... ہاں بس اچھے رشتے کی تلاش میں ہیں... دو چار رشتے  
 آئے ہوئے ہیں۔ اب شادی کر دیں گے... غرضیکہ ہمایوں نے چاروں طرف  
 گھیر لیا... گھر میں سامان رکھا اور تین چار روز اسی میں لگ گئے... اباجان کو یہاں  
 میوگا روٹن میں سرکاری کوٹھی ملی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ جب میرا اپنا مکان یہاں  
 تو پھر میں کوٹھی میں کیوں رہوں...۔

کاش! اباجان ہمیں ان گندے ہمایوں سے تو نکال کر بیاتے ہیں نہ  
 بار ابا سے کہا بھی مگر ابائیں مانتے... اور پھر یہاں امی کے بکے والے ہم

اچھا تو پھر خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے موت دے دے اور اس کے بعد  
بہنہ راجی چاہے تم کرو ...  
میں خاموش ہو گئی ...

بیٹا! میں کوئی تمہارا دشمن تو نہیں ہوں ... کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہہ رہا ہوں نا۔  
میں چاہے چاہے پر تو ہمارے رشتہ دار ہیں۔ وہ باتیں کرتے ہیں۔ پہلے ہی تم جانتی  
ہو کہ تمہاری چچی نے کیا کیا کچھ باتیں ہمارے خلاف نہیں پھیلا دیں۔ وہ کیا کم بدنامی  
دیتی تھی۔ اب میں تمہیں کاغذ کیسے بھیج دوں اب تو خدا وہ دن جلد لائے ...  
اب میں تمہاری شادی کر کے فارغ ہو جاؤں اور میرے سر سے یہ فکروں دور ہو  
جائے ...

نا امید ہو کر میں نے رونا شروع کر دیا اور اٹھ کر آگئی ... اور اپنے کمرے  
میں آکر پھوٹ پھوٹ کر روتی ... اور خدا سے دعا مانگی ...

اے بلند معبود! یا تو آبا جان کے دل میں یہ خواہش پیدا کر کہ وہ مجھے کاغذ  
میں داخل کرادیں یا میرے دل سے اس شوق کو مٹا دے، اور اگر تویہ دونوں  
میں نہیں کر سکتا تو اسے پاک پروردگار! مجھے اس دنیا سے واپس بلا لے مجھے  
مٹنے کا کس قدر شوق تھا؟ مگر اس شوق کو بری طرح کچلا جا رہا ہے میں گھٹوں  
پٹی ہو جیتی رہتی کہ یا خدا! وہ کیسے ماں باپ ہیں جو اپنی لڑکیوں کو زبردستی  
مٹاتے ہیں اور وہ نہیں پڑھتیں ... خدا یا! مجھے بھی کسی ایسے ہی گھر لانے  
لا پیدا کیا ہوتا ...

بھلا میری زندگی ہی کیا ہے؟ ... اٹھنے کا کوشش میں ٹوٹ ٹوٹ کر کرنا ...  
میں اس ماحول سے، جہاں ان کو ان میں نہیں سمجھا جاتا ... اور اس پر  
لم ہوتا ہے، نکل کر خوشگوار فضاؤں میں پہنچنا چاہتی ہوں۔ ایسی فضا میں ... ایسا  
بائیں سانس لینا چاہتی ہوں ... جہاں ہر شخص کو جینے کا حق حاصل ہو اور کوئی  
کا پر ظلم نہ کرتا ہو ... میں مجبور سی کی زندگی نہیں بسر کرنا چاہتی لیکن یہاں کوئی میری

ہم کوٹھی میں نہیں گئے ... اتنی سے سہیر کہا مگر وہ نہیں مانتیں کتنی  
گرمیوں میں وہاں چلے جائیں گے۔ آج کل تو سردیاں ہیں۔ ستمبر کا مہینہ ختم ہو  
اور کاغذ میں داخلے شروع ہو گئے ہیں ... آبا جان سے رات بات کر  
مگا انھوں نے کہا کہ بیٹی! اگر تم پڑھ کچھ بھی جاؤ گی تو کیا ہو گا؟ ... ہمیں تم  
کوئی نوکری وغیرہ تو نہیں کرانی! ... پہلے ہی تمہاری صحت اچھی نہیں ہے اور  
باتیں بھی بناتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں اب اچھی سی جگہ دیکھ کر تیر  
شادی کر دوں تم جانتی ہو زمانہ کس قدر نازک ہے۔ آئے دن ہزار  
کے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور پھر لوگ بھی باتیں بناتے ہیں کہ  
ہو گئی ہے، شادی نہیں کرتے پہلے تو لڑکیوں کو بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہی  
دیا جاتا تھا۔

”لیکن آبا جان مجھے پڑھنے کا شوق ہے۔ آپ مجھے کاغذ میں داخل  
... مجھے ابھی شادی نہیں کرنی!“ ...

دیکھو بیٹا! مجھے یوں تنگ نہ کر دو کسی ایسی بات کے لئے مجبور نہ  
نہیں کر سکتا ... ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو تو اسکول تک بھیجنا منع نہ  
جائیکہ اسے کاغذ میں داخل کر دیا جائے ...

میں نے بھرتی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن آبا جان مجھے ضرور داخل  
میری یہ انتہائی خواہش ہے اور اگر یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو میں مر جاؤں

بات نہیں سنتا...  
بھلا میں کیوں شادی کر سکتی ہوں؟ اُف خدا!... شادی کے نام ہی  
دم گھٹنے لگتا ہے... مجھے مردوں سے نفرت ہی یہ ذلیل مرد نہ جائے  
فطرت کیسی ہوئی ہے؟!!

..... اور شادی کے نام ہی سے مجھے ان تمام لڑکیوں کی زندگیوں کا غما  
... ہمارے ماحول کی لڑکیوں کا، ہمارے طبقے کی لڑکیوں کا... جو خاوند  
ہاتھوں ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی ہیں!! ....

اور پھر مجھے بڑا ڈر لگتا... میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ میں پڑھ سکوں... کہ  
بن جاؤں اور ساری عمر شادی نہ کروں اور اگر کروں تو اپنی مرضی سے اور  
شادی کروں... جس سے میرا ذہن خیالات اور دل متا ہو... لیکن جا  
ملنے اور اسے کھو دینے کے بعد اب تو یہ سوال بھی ختم ہو جاتا تھا اور کئی  
نظر اٹھا کر بھی دیکھنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا...

آبا جان کا انکار نہیں کہ میرا دل اتنا دیران ہو گیا کہ جس کی کوئی حد نہیں  
میرے لئے اب رہا ہی کیا تھا... آئندہ بسر سونے والی زندگی پر کوئی بھ  
تھا... زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا، اور عام لڑکیوں کی طرح میں زندگی بسر  
تھی... تو پھر کیا ہو؟! کاش! میں جاوید سے وابستہ ہو جاتی! ...

بہت ممکن ہے کہ میں اپنی محبت سے اس کی زندگی کے رخ کو مو  
اسے بدل ڈالتی... اگر میں ذرا سی کوشش کرتی تو جاوید سعیدہ سے  
نہیں ہو سکتا تھا... میں بھی سعیدہ کی طرح چالاک بنتی بن سونکر جاوید  
جاتی، اسے ناز وادکھاتی... خالہ سے رو رو کر کہتی کہ امی جھوٹ کہتی  
امی میری سوتیلی ماں ہے، وہ نہیں چاہتی کہ میری جاوید سے شاد  
ضرور کچھ نہ کچھ مان جائیں... میں جاوید کو منالیتی... اور جب جاو  
طرف ہو گیا۔ تو میں رو رو کر اس سے کہتی کہ مجھے نہ چھوڑو جاوید...

ہمیشہ کے لئے تمہاری ہو چکی ہوں... اور جاوید ضرور مان جاتا۔ میں گھر  
پارہ کئے بغیر جاوید سے پیار کرتی اور سعیدہ سے ملنے کا اسے کبھی موقع نہ  
، مگر میں نے کچھ بھی نہ کیا اور خود ہی خاموش ہو کر رہ گئی اور دیکھتے دیکھتے  
ساری زندگی تباہ کر لی...

تو اب زندہ رہنے کا فائدہ؟... میں تو محض بوجھ ہوں۔ آبا جان بھی کہتے  
اکرم میرے کندھوں پر بوجھ ہو، تو پھر اس بوجھ کو ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانا چاہیے  
ہے مرنے کا کسی کو بھی رنج نہ ہو گا۔ میرے زندہ رہنے سے کسی کو بھی فائدہ  
... پھر میں کیوں بل بل کر زندہ رہوں... میں کیوں ساری زندگی ظالم خاوند  
ابداری اور باورچی خانے کے اندر بسر کروں... ہر سال ایک بچہ پیدا کروں  
دل کے طعنوں سے دل چھلنی کروں۔ ظالم خاوند کے ظلم کا شکار ہوں تو بہتر یہی  
کہ مر جاؤں... میرا مر جانا ہی بہتر ہے۔ اور پھر جب میں اپنے مرنے  
بارے میں سوچتی تو پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ اپنے مرنے پر بھی تو مجھے خود  
رد نہ تھا... میرے مرنے پر بھلا اور کون روتا؟ رونے والا ہے ہی کون  
لون ہے؟... اس بھری دنیا میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو میرا اپنا ہو  
، جسے میں اپنا کہہ سکوں... جس کے سینے سے لگ کر میں رو  
ں، جس سے اپنا دکھ سکھ کہہ سکوں... کوئی بھی نہیں تو پھر مر جانا چاہیے۔  
لیکن ....

مرنے سے ڈر بھی لگتا ہے... خود کٹی کر لوں!... نہ جانے کتنی تکلیف ہوا  
یا خدا! تو دنیا میں لاکھوں آدمی روزانہ مارتا ہے اپنی طرف سے مجھے بھی۔  
تین بج دے! اور اپنی خیالوں میں میں نے ساری رات کاٹ دی...  
رہی ہو گئی... پھر دوپہر ہوئی۔ پھر رات ہوئی لیکن میں نہ تو کمرے سے نکلی اور  
مانے کھانا کھایا، نہ منہ ہاتھ دھویا، اور روتی رہی اور مرنے کے متعلق سوچتی  
ہا! ...

اجی نے یہ سب کچھ دیکھا، اُن کے ماتھے پر بل پڑ گئے... غصہ سے اچھڑلاں ہو گئی مگر غصہ کو اندر ہی اندر کسی اور شکل میں نکالنے کے لئے پی لیں۔  
دو دن گزر گئے کسی نے اُن کو نہ کہا کہ تم کہاں ہو...؟ کھانا کیوں نہیں کھایا؟  
کیوں ہو؟... دو دن فاقہ کرنے سے میرا دل رہ رہ کر گھٹ رہا تھا مگر تم  
کیسے کھاتی ہو....

تیسرے روز آبا جان آئے... کمرہ کے اندر داخل ہوئے۔ اور کہا:  
پاس کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میں پنگ پر بیٹھی تھی، اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
میرا رنگ زرد ہو رہا تھا اور میں سوکھ گئی تھی...  
آبا کہنے لگے... یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے کھانا کیوں نہیں کھایا؟  
مک بھوکی رہو گی؟... یہ سب کرنے سے تمہارا مطلب کیا ہے؟...  
آبا کی آواز ذرا تیز ہو گئی... یقیناً امی نے میرے خلاف سکھا کر بھیجا  
میرا دل زور زور سے، دھڑکنے لگا اور میں نے کہا۔ میری طبیعت خراب  
اس لئے میں نے کھانا نہیں کھایا...  
لیکن اس دن سے طبیعت کیوں خراب ہوئی، جس دن سے میں نے تباہ  
میں داخلہ لینے سے منع کیا...

دیکھو جیلہ! مجھے یوں تنگ نہ کرو... اس بڑھاپے میں میری زندگی خراب  
اگر مناسب سمجھتا تو میں تمہیں خود ہی کالج میں داخل کرا دیتا... لیکن اب تو  
مرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے میں نے تمہیں کر لیا ہے کہ اب تمہاری شادی کرو  
اپنے گھر جا کر جو تمہارا جی چاہے کرنا کم از کم میرے سر سے تو یہ فرض آتا۔  
اچھی بیٹیاں والدین کو یوں تنگ نہیں کیا کرتیں... دیکھو۔ میں تمہارے آ  
جوڑتا ہوں (اور یہ کہہ کر آبا جان نے ہاتھ جوڑ دئے) کہ خدا کیلئے مجھے تنگ نہ  
میرا بڑھا خراب نہ کرو...  
میں نے جلدی سے کہا آپ ہاتھ نہ جوڑیں، آبا جان! میں آپ کی

ان لوں گی۔  
اور آبا جان نے رونا شروع کر دیا۔ میں حیران رہ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے  
میں بہت ظالم لڑکی ہوں اور کوئی ایسا سنگین جرم کر چکی ہوں، کہ خدا اب مجھے کبھی معاف  
نہ کرے گا... میں نے بھی رونا شروع کر دیا اور پھر آبا جان سے وعدہ کیا کہ آپ  
چکیں گے وہی ہوگا...  
تو پھر اٹھو۔ دیکھو تو اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے، منہ ہاتھ دھوؤ، اور کھانا...  
کھاؤ...  
آپ جاییں، میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔ میں نے انتہائی نحیف  
اور کمزور آواز میں کہا...

ناباش، میری بیٹی!... اور آبا جان نے مجھے گلے سے لگایا میں نے بڑی شکل  
سے آنسوؤں کو روکا... اور جب وہ باہر چلے گئے تو میں نے آہستہ سے اٹھ کر  
دروازہ بند کیا اور اس قدر سسکیاں بھر بھر کر روئی کہ کبھی نہ روئی تھی... پھر  
خدا سے دعا کی۔ اے خدا! مجھے حوصلہ اور صبر دے کہ میں اس رات پر تاباں رہ سکوں  
رہ سکوں!!... ایک طرف آبا جان اور ان کے احکام تھے... دوسری طرف  
دل تھا، دل کے تقاضے تھے... اپنی خواہشیں تھیں!!...

اور پھر میں نے روتے ہوئے اپنی ہر خواہش کو زندہ جلا دینے کا فیصلہ کر لیا  
اور سوچا کہ آج کی رات اس کے لئے ٹھیک رہے گی۔ پھر اٹھ کر باہر چلی گئی  
کہ کہیں پھر آبا جان نہ آجائیں... خاموشی سے باہر نکلی غسل خانے کی طرف چپ  
چاپ سر جھکائے چل دی... وہاں امی بیٹھی ہوئی تھیں... مجھے دیکھ کر طنز پر  
ہنسی منبیں، اور میں بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔ چپ چاپ کھانا کھایا... آہ  
آبانے مجھے کس قدر بے بس اور ذلیل کر دیا ہے... آنکھوں میں آنسو آتے  
رہتے مگر میں چپ چاپ کھاتی رہی... پتہ نہیں کب روٹی کا لقمہ توڑتی تھی اور  
کب منہ میں ڈال لیتی تھی... کھاتی رہی۔ چانک اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے

کمرہ میں آگئی ... دروازہ بند کیا اور پھر پھوٹ کر رونے لگی ...

یہ رات کتنی دیر ان تھی میرے لئے ...

اور جب رات کے گیارہ بج گئے تو میں نے اپنی ایک ایک آرزو کو فراموش کرنا شروع کر دیا ...

الوداع! اے میری اداس آرزو! الوداع! ... مجھ سے رخصت ہو جاؤ ... آج تک میں اپنے لئے تھی - میں نے اپنے لئے رہنے کی پوری کوشش کی ... مگر آج باپ نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے ہیں ... آج میں مجبوراً دبے بس ہو گئی ہوں ... آج سے میں دوسروں کے رحم و کرم پر ہو گئی ہوں ... آج تک دوسروں کے پاس رہنے کے باوجود میں اپنے لئے زندہ تھی لیکن آج سے میں اپنے لئے اپنی زندگی ختم کر رہی ہوں ...

الوداع! اے میری زندگی الوداع! ...

... اور پھر اتنی ہچکیاں اور سسکیاں شروع ہو گئیں کہ میں سوچ بھی نہ سکی ... میں نیم پاگل سی ہو رہی تھی اپنی ہر آرزو سے ہاتھ اٹھا رہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں! ... جب ہر آرزو ختم ہو جائے اور تمنا خاموش ہو جائے، تو پھر کیونکر زندہ رہا جاسکتا ہے؟ ... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور پھر میں نہ جاننے کب روتے روتے سو گئی! ...

نہ پوری طرح سو رہی تھی اور نہ میں پوری طرح جاگ رہی تھی! ... اور سیاہ رات نے یہ سب کچھ ہوتے دیکھا، لیکن خاموش رہی آسمان! چمکنے والے ستاروں نے مجھے روتے دیکھا ... مگر وہ اسی طرح چمکتے رہے! ... اور کوئی رات بیت گئی۔

زندہ لاش کی طرح زندگی کے دن گزار رہی ہوں۔ نہ روتی ہوں نہ ہنستی ہوں۔ ہر کام کرتی ہوں۔ چپ چاپ سر جھکا لئے رات گئے تک کام کرتی رہتی ہوں ...

رشتہ کی بات ہو رہی ہے ... غریب منگنی ہو جائے گی۔ اور پھر شادی! ... ایک ماہ کے اندر اندر شادی! ... لیکن پتہ نہیں کس کی شادی ہوگی؟ ... لیکن میں کیوں سوچوں کہ میری شادی ہوگی؟ ...

اور ایک بار پھر مجھے جنون ہو گیا کہ خود کشی کر لوں ... اور یہ جنون اتنا بڑھا کہ ایک رات میں نے نیلا تھو تھا پیس کر پانی میں گھول کر پی لیا! ...

زہر پینے سے پہلے میں نے کمرنگی ایک ایک چیز کو الوداع کہا اپنی امی کو یاد اور کہا ... امی مجھے راستے کا علم نہیں ہے، مجھے لینے کے لئے دروازے تک آجاؤ ... موت کا راستہ پتہ نہیں کیا ہوتا ہوگا ...

موت کے اس پار کیا ہے؟ یہ میں اب جان سیکوں گی! دنیا پر حسرت بھری نظر ڈالی! ...

جاوید کو بادی رورور کر بادی - کاش! ... موت کا یہ پیالہ پینے کی بجائے میں اگر جاوید تمہارے پاس بیٹھی سن رہی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا! ... یہ بھی تو ہو سکتا تھا؟ یہ کوئی مشکل بات نہ تھی! اور پھر میں نے نیلا تھو تھا پانی کے ساتھ پی لیا ... دل تیزی سے دھڑکنے لگا آنکھوں سے ہنر اندھیرا چھا گیا اور ریٹ

آہ! میں اپنے آبا کے لئے بدنامی کا باعث بنی... کاش! میں اس سے پہلے مر جاتی!...

اور میں ایک ماہ تک کمرے سے باہر نہ نکلی... ہمایوں کو اور بھی پکالین تھا کہ مجھے بچہ ضائع کرانے کے لئے مہتال داخل کیا گیا تھا... اور میری وہی چینی تھیں جو بچہ پیدا ہونے کے وقت عورت کے منہ سے نکلتی ہیں... اور یہ سب کچھ امی کا کیا دھڑا تھا... امی نے مجھے جی بھر کر بدنام کیا اور کہیں کانہ رکھا اور جہاں میرا رشتہ ہونا تھا ان لوگوں سے وہ باتیں کہی گئیں کہ انہوں نے زندگی بھر ادھر نہ آنے کی قسم کھالی!... یہ میں نے کیا کر دیا؟... کاش! میں مر جاتی مجھے تو موت بھی نہیں آئی!... کاش! میری کوئی سہیلی ہی ہوتی، جو مجھے سمجھاتی ہیں زندگی گزارنا نہیں جانتی۔ مجھے زندگی گزارنا نہیں آتا!

خدا یا! میری مدد کر!!...

آبا جان میرا منہ تک نہیں دیکھتے.....

.... اور انہوں نے روٹی تک کھانی چھوڑ دی ہے... سارا وقت کمرہ کے اندر بند رہتے ہیں، دفتر تک نہیں جاتے... یا خدا! یہ کیا ہو گیا؟!...

اس واقعہ کو چار مہینے گزر گئے ہیں... اب ابابھر میری شادی کی کوشش میں مصروف ہیں...

یا خدا! آبا کی یہ آرزو پوری کر دے... اب میں کچھ نہ کر سکی... اب میں مردوں کی بھی نہیں... آبا کی اس خواہش کو جلد سے جلد پوری کر دو... اچھے خدا!... میری اس خواہش کو پورا کر کہ آبا کی خواہش پوری ہو!

میں بلا کا درد اٹھا... کچھ دیر تک میں نے درد کو دبائے رکھا مگر جب ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے اور درد کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ تو میں نے چیخ چیخ کر سارا گھر کیا بلکہ سارا محلہ سر پر اٹھایا... تھے پر تے شروع ہو گئی۔ میں نے رات کے وقت یہی کہتا تھا کہ آبا جان! کے سامنے مردوں...

آبا جان گھبرا گئے... میرا رنگ نیلا پڑنے لگا... اسی وقت ڈاکٹر کو بلا یا گیا اور اس نے کہا کہ اس نے کوئی چیز کھالی ہے... آپ اسے فوراً ہسپتال لے جائیں... آبا جان کے منہ سے چیخ نکلی۔ اور وہ وہیں سر پڑ کر بیٹھ گئے... لیکن ڈاکٹر نے تسلی دی کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ آپ دیر نہ کریں اسے فوراً ہسپتال لے جائیں اور پھر ڈاکٹر کی مدد سے مجھے ہسپتال پہنچایا گیا... زندگی تھی۔ میں بچ گئی۔ ایک ماہ تک ہسپتال رہی۔ خود کشی کا کیس چلا لیکن جب اس کے ثبوت جہیا کئے گئے کہ غلطی سے کھالیا تھا تو خلاصی ہوئی... امی کو سب سے زیادہ فخر تھی کیونکہ ان کا خیال تھا، کہ کہیں مجھے سو سہیلی والدہ سمجھ کر نہ دھریا جائے...

اور جب ڈاکٹر نے پوچھا تھا کہ تمہیں کس نے یہ زہر پلایا؟... تو میں نے امی کی طرف دیکھا... انکار رنگ فنی ہو گیا اور میں نے کہا میں نے تو غلطی سے پی لیا، مجھے تو پتہ بھی نہ چلا!...

ہسپتال سے تندرست ہو کر گھر آئی تو رہی سہی عزت اور وقت بھی ختم ہو گئی... اب گھر کا ذرہ ذرہ میرا دشمن ہو رہا تھا۔

جہاں میری شادی ہونے والی تھی۔ ان لوگوں تک طرح طرح کی خبریں امی کے میٹھے والوں نے پہنچائیں اور کہا کہ بڑی تو ناجائز بچہ ضائع کرانے ہسپتال گئی تھی... اُف خدا!... یہ میں نے کیا کر دیا؟... اتنا بڑا الزام مول لے لیا... آبا جان کو لوگوں کے ذریعے ان باتوں کا پتہ چلا اور وہ رونے لگے!...

جید! یہ تمہیں کیا ہو گیا۔ تم کس قدر کمزور ہو گئی ہو! تمہارا چہرہ کتنا کملا گیا۔  
... اور پھر ہنس ہنس کر کہتی۔ ابھی تو رات کو پتہ چلے گا... لا...  
... اور میرا سارا جسم سر سے لے کر پاؤں تک لرز اٹھتا... اور مجھے اچانک  
سلیم کا خیال آجاتا... اس رات کا خیال آجاتا... لیکن میں رونہ سکتی تھی...  
جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ عورتیں جمع ہوتی جا رہی تھیں۔ آج انھیں ایک  
لاش کی شادی کرنی تھی... ایک لاش کو کفن پہنانے کی بجائے سڑخ جوڑا سپنا کر  
رضت کرنا تھا...

زندگی پہلے ہی بہت کچھ بدل گئی تھی... اب رہی سہی بھی بدل جائے گی  
کچھ دیر کے بعد انہی کی بڑی بہن میرا سڑخ جوڑا لیکر آگئی اور مجھے بہانے کے  
لئے کہا... میں نے غسل خانے میں جا کر غسل کیا اور دہاں جی بھر کر روئی...  
اس کے بعد سڑخ کڑے پہنے...

آہ! اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا... اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔  
اگر میری انہی زندہ ہوئیں... تو اپنی بیٹی کو دلہن بننا دیکھ کر کس قدر خوش  
ہوئیں... پھر میری آنکھوں میں آنسو نہ ہوتے بلکہ خوشی کے ستارے چمک رہے  
ہوتے... پھر باجے بجتے... اور... انہی زندہ ہوئیں تو شادی میری مرضی  
سے ہوتی...

... جاوید میرا ہوتا... لا...!

پھر آج کے روز ایک سورج نہیں... دودو سورج طلوع ہوتے!  
پھر میری "سہاگ رات" کس قدر روشن اور خوبصورت رات ہوتی...!  
... اور عورتیں بھی لا دھڑا رہی تھیں... سب نے کہنا شروع کر دیا کہ ماں یاد آرہی  
ہو گی... چند ایک نے اُمید یہ ہو کر پیار سے سر پر ہاتھ رکھا اور میری جینیں لکل  
کیں... پھر مجھے تلی دی گئی مگر میرے آنسو کہاں رکتے تھے؟...!  
خام کو برات آنے والی تھی... بغیر باجوں کے، خاموشی سے، پھر مجھے ایک

کوئی رشتہ نہیں ملتا... جہاں اچھی جگہ بات بننے سکتی ہے۔ انہی کا کوئی ٹکڑا  
جاسوس پہنچ جاتا ہے... لا! انہی اب میری دشمن ہو گئی ہیں... ہمارا آپس  
میں اب کوئی تعلق نہیں... ہم اب ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے  
یا خدا! میرے بوڑھے باپ پر رحم کر... لا!

میری شادی کا روز آن پہنچا ہے... خاموشی سے ہر چیز کی تیاری ہو رہی  
ہے... یوں لگتا ہے جیسے شادی ٹہی نہیں، مگر جیسے جلوس کی تیاری ہو رہی ہے  
... انہی کے تمام میکے داڑھے آئے ہوئے ہیں سیدھے بھی آئی ہوئی ہے...  
وہ مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے... انہی کی والدہ مجھے  
گھور کر دیکھ رہی ہیں... انہی کے اور رشتہ دار بھی آئے ہوئے ہیں۔ میں اپنے  
کمرے میں ایک طرف کونے میں بیٹھی ہوں... کسی کے سامنے نہیں روتی، لیکن  
راتوں کو چھپ چھپ کر روتی ہوں کہ اگر ان گھر والوں نے میری سسکی بھی سن لی تو  
قیامت آجائے گی... اب تو مجھے رونے کی اجازت بھی نہیں ہے... اباجاں  
نے تھوڑا سا سامان تیار کیا ہے... میری ایک سہیلی رضینہ ہے... وہ میرے  
پاس بیٹھی ہے، بیچاری سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے  
ہیں... گود میں ایک سوکھا ڈبلا لڑکا لٹے ہے۔ رضینہ کس قدر بدل گئی ہے!۔  
رضینہ! تیری یہ حالت کیسے ہو گئی؟... تو تو بڑے دل والی لڑکی تھی... یاد  
ہے اس دن تو نے کس بہادر رہی اور ہوشیاری سے سلیم کو دھوکا دے کر وہاں  
سے نکالا تھا؟ لیکن تو نے یہ کیسی مظلوم شکل بنالی؟... مگر رضینہ ادھر ادھر کی بات  
باتیں کئے جا رہی تھی اور میں دل ہی دل میں اس کے متعلق سوچ رہی تھی  
لیکن وہ مجھ سے کہہ رہی تھی...

طرف گھٹھری بنا کر بٹھا دیا گیا... مجھے بخار ہو رہا تھا... لمف اور ڈھکھا دیا گیا...  
 خام کو برات آئی... میں نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ بخار اتنا تیز ہو  
 تھا کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہ تھا... پھر نہ جانے کب نکاح کے لئے یہ لوگ  
 کمرے میں آئے... انہوں نے کیا کچھ کہا... کب میں رخصت ہوئی... کب  
 جان نے گلے لگا کر رونا شروع کر دیا یہ سارا کچھ خواب کی طرح یاد ہے...  
 یوں لگا تھا جیسے کہیں بہت دور یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور مجھ تک پہنچ  
 آہستہ آوازیں آرہی ہیں...

رات ہوئی! ...  
 میری سہاگ رات آئی... مجھے ایک اکیلے کمرے میں بٹھا دیا گیا... ایک  
 سے ہوئے پنگ پر... آہستہ آہستہ کر کے تمام عورتیں رخصت ہونی شروع ہو گئیں  
 میں اکیلی رہ گئی! ...

اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے...  
 اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی اندر داخل ہوا ہے... اور اس نے  
 دروازہ بند کر لیا ہے... اور پھر وہ میرے پنگ کے پاس آیا ہے اور اس  
 پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ہے... میں سر سے لیکر پاؤں تک کا  
 گئی اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں...

... اور جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میرا خاوند سامنے بیٹھا ہے  
 ہماری شادی کو ایک ماہ گزر چکا ہے اور میں اپنے والدین کے گھر سے  
 دور ایک اجنبی شہر میں ایک اکیلے مکان میں اپنے خاوند کے ساتھ رہتی ہوں  
 جس نے ایک ہی ماہ کے عرصہ میں سو ہزار طعنے مجھے دے ڈالے ہوں  
 اسے زندگی! اور زندگی کی خوشیو! یہاں تو میرا ساتھ نہ چھوڑا اور

وطن میں تو تم بیوفائی نہ کرو... تم کبھی نہ سن سکو گی!! ...

شہر اور گلیاں



اس وقت میں چپ ہوں۔ خاموش ہوں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی نے  
 ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے قوت گویائی چھین لی ہے۔ جیسے یہ ہونٹ تنگ  
 لودقلے کے دروازے کی مانند بند ہو چکے ہیں۔ اور اب کبھی نہ کھلیں گے میری  
 لکھوں میں آنسو ہیں۔ اور میرے دل کا سردرد جاگ اٹھا ہے ہر زخم بس رہا  
 ہے اور ٹیس اٹھ رہی ہیں۔ اور میں پاگلوں کی طرح کھوئے کھوئے قدم اٹھائے  
 ل دیران اور خاموش پگڈنڈی پر چلی جا رہی ہوں۔ یہ پگڈنڈی دونوں طرف سے  
 رخنوں سے گھری ہوئی ہے۔ اور ٹہنیاں سر جھکائے چپ چاپ سوچ رہی ہیں  
 ہر جانی پہچانی چیز اجنبی نظر آرہی ہے۔ یہ وہی راستے ہیں جہاں سے میں بڑا  
 رزاکرتی آئی تھی۔ یہ وہی پہاڑ ہیں۔ جو مہربان مخافتوں کی طرح سینہ تانے کھڑے  
 عزائم راستے میں مجھے ملا کرتے تھے۔ مگر آج میں ان کو قطعاً نہیں پہچان رہی۔ یہ  
 بشارت جو کل تک میٹھے میٹھے راگوں سے بھر پور تھا۔ آج اپنا سر پتھروں سے کیوں  
 ٹک رہا ہے۔ وہ شفقتی..... زمرودی..... نارنجی..... فیروزہ  
 اسی اور سرمئی رنگ کے بادل یہاں سے چلے گئے..... لیکن دادیوں میں

زرد چاند میں رہنے والی اداس لڑکی

میں تمہاری ڈائری کے یہ پریشان اوراق

تمہارے ہی نام معنون کرتا ہوں

اُتر گئے! وہ رنگ یہاں اڑ گئے۔ وہ سورج یہاں ڈوب گیا ہے۔  
جو کل تک آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یہ ایک ہی دن میں کیا ہوا  
ہے۔ وہ دل کشی، وہ رعنائی کہاں کھو گئی۔ . . . زندگی کی چمک . . .  
روشنی . . . اور سیلاب کیوں مٹ گیا! وہ سارا حسن کہاں مر گیا!  
کیسی موت مر گیا!!

سارے گھر داغے مزے سے اپنے اپنے کاموں میں  
مغویں۔ بھیتا اپنے کمرہ میں بیٹھے ستار پر کوئی دھن  
چھیڑ رہے ہیں۔

باجی اپنی قوس قزح کے رنگ کی قمیض پر استری کر  
رہی ہے وہ ساتھ ساتھ اپنے آپ مسکراتی بھی جاتی  
ہے۔ اور استری بھی کرتی جاتی ہے۔

باجی بڑی خوش ہے۔ آج باجی اپنے منگیتز ظفر بھیتا کے ساتھ سینا  
جارہی ہے۔ دونوں روزانہ جلتے ہیں۔ کبھی سیر کو۔ کبھی سینا۔ کبھی شاپنگ  
کسی پارٹی پر، کبھی کمنک پر۔ . . . دونوں ایک دوسرے سے بے حد  
پسندیدہ ہیں۔ . . . دولت نے دولت کو لگے لگایا ہوا ہے۔ ورنہ یہ کبھی پیار نہ  
اگر ظفر بھیتا کی . . . روپے تنخواہ ہوتی۔ اور کار اور کوٹھی اور بنک بلیش نہ  
یہ سنگی کبھی نہ ہو سکتی۔ یہ سینما دیکھنے کبھی نہ جاسکتے۔ . . . یہ ایک دوسرے  
سے کبھی نہ مل سکتے۔ پھر ایک دوسرے سے ملنے کے لیے انہیں آگ اور  
سمندر تیرنا پڑتا۔ اور ان کے چہرے زرد ہوتے۔ لیکن مائے سچا جلیل!  
پر کس قدر مرتا تھا۔ . . . لیکن وہ باجی کو کبھی نہ پاسکے گا۔ وہ باجی کی طرف  
بھی نہیں سکتا۔ . . . اس لیے کہ وہ عزیز ہے۔

اور عزیزی دنیا میں انتہائی خوفناک اور بڑی چیز ہے۔  
دادی اماں کی ایرانی بچی مزے سے صوفے پر سو رہی ہے اور ہاتھ

رائی دروازے کے پاس فرش پر اوندھ رہی ہے۔ غزالہ اور نیلو فر کے کمرے سے  
پوسیلوں کی آواز آرہی ہے۔ ننھا نعمان اور بے بی سلمیٰ بھیتا کے کمرہ سے  
اُٹے ہوئے رسالوں میں سے موٹے موٹے بچوں۔ بلیوں اور رطوبتوں کی تصویریں  
نہا رہے ہیں۔ ہر ایک ہنس رہا ہے۔ ہر ایک خوش ہے۔

لیکن مجھے چین اور سکون نہیں ہے۔ میرا دل ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے  
سامنے کونہیں چاہ رہا۔ اور میں گھبرا کر باہر نکلی آتی ہوں۔

جب ابکھ میں آنسو ہوں۔ اور دل درد سے بھرا ہوا ہو۔ تو ساری دنیا اداس اور  
یک نظر آتی ہے۔ اس وقت صرف تنہائی ہوتی ہے اور اچھی لگتی ہے۔ اور تسلی  
پا ہے۔ اور ہر درد کو سستی ہے۔

میں چلتے چلتے بڑی مشکل سے چپڑ کے ان گھٹے درختوں تلے آ پہنچی ہوں اور  
پ چاپ پاگلوں کی طرح سامنے والی پگڈنڈی کو دیکھ رہی ہوں۔ ساری وادی  
یک نظر آرہی ہے۔

میری پیاری سہیلی! میری بد نصیب زاہدہ! آج تیری حالت نے مجھے  
ٹٹے کی طرح مضطرب کر دیا ہے۔

اُف لا پرواہ پاگل لڑکی! تو نے کتنی بے دردی سے اپنی زندگی کو جلا ڈالا  
ہے۔ اور آج تو اکہلی سیننی ٹویم کی سرد تاریک اور ویران تنہائی میں دم توڑ رہی  
ہے۔ مر رہی ہے۔ . . .

تو یونہی مر جائے گی۔ یونہی ایک خون ہو جائے گا۔ ایک جان چلی جائے  
گی۔ ایک قیمتی اور پیاری زندگی برباد ہو جائے گی۔ اور کسی کو علم نہ ہو گا۔ کوئی جان  
سکے گا۔ کچھ نہ ہو گا۔

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سورج یونہی طلوع و غروب ہوتا رہے گا پھول یونہی  
خبا کر تازہ ہوتے رہیں گے۔ ہزاروں لڑکیاں محبت کریں گی۔ مگر زاہدہ دوبارہ  
بک نہ آئے گی۔ کچل ہوئی محبت میں کبھی زندگی پیدا نہ ہوگی۔ شاخ سے ٹوٹا ہوا پھول

اچھی زاہدہ! کیا آج سچ مح میں نے تمہیں ہی دیکھا تھا! لیکن سچ مح تم ہی  
اندہ ہونا۔ جس کی گہری اور شفاف خوبصورت آنکھوں میں زندگی سورج بن کر  
جانکا کرتی تھی۔ اور جس کے معصوم بھولے بھالے چہرے پر فرشتوں کی سی  
یزگی تھی۔

لیکن نہیں۔ وہ زاہدہ آج کہیں نظر نہیں آرہی۔ آج تو زندگی کی راہ پر کوئی  
بٹکی ہوئی دکھی روح نظر آتی ہے۔ جس کے ارد گرد دور دور تک روشنی کا کہیں  
م نشان نہیں۔ صرف اندھیرے کے صحرا پھیلے ہوئے ہیں۔

آؤ اچھی زاہدہ! آؤ ہم اس پیاری لڑکی زاہدہ کو دوبارہ کہیں ڈھونڈیں۔ چسے  
کبھی نہ بھلا سکوں گی۔ اس معصوم اور پیاری زاہدہ کو ڈھونڈیں۔

تب تم ہمارے اسکول میں نئی نئی داخل ہوئی تھیں۔ اور تم سارا دن چپ چاپ  
راہ اس چہرہ لیے آخری سیٹ پر بیٹھی رہتی تھیں۔ تمہاری کوئی سہیلی نہیں  
تھی۔ اور تم اپنا بھولا بھالا غمگین چہرہ اوپر اٹھائے سب کو دکھتی رہتی تھیں یہی  
تین مہینے گزرتے۔ اور جب امتحان ہوا تم فرسٹ آگئیں۔ تو ہر لڑکی نے تمہیں  
لک کر دیکھا۔ تو پھر بہت سی لڑکیاں تمہارے قریب آگئیں۔ اور تم میں دلچسپی لینے  
لا۔ انہی میں ایک میں بھی تھی۔ استانیات تمہاری بہت تعریف کیا کرتی تھیں۔

اور پھر آہستہ آہستہ اسی طرح میں تمہارے بہت قریب آئی گئی۔ مجھے  
پتا چلا کہ تمہارا اس سا چہرہ کھل اٹھتا تھا۔ جیسے مویٹے کے پھول کو چاندنی میں ہنلا  
گیا ہو۔

ایک روز کلاس میں ٹٹ تھا۔ اور تمہارے پاس نہ پنل تھی اور نہ پن۔ اور تم  
یٹان کی ہو گئی تھیں۔ کسی سے ملنے کی تم میں جرات نہیں تھی۔ اور تم نے سب کو  
ساتر سے دیکھا۔ اور میری طرف دیکھ کر تمہیں نہ جانے کیوں جیسے کچھ سہارا ہو  
اور میں نے ڈھک سے دوسرا پن نکال کر اسی وقت تمہیں دے دیا۔ پہلے تمہیں  
پن کا کیا میں اور مجھے انتہائی احسان مند نظروں سے دیکھا۔ لیکن پھر تم نے جلدی سے

اور کمان سے نکلا ہوا تیر کبھی واپس نہیں جائے گا۔

لیکن زاہدہ! آج تیرے چہرے پر کس قدر سکون ہے۔ ایسا سکون تو پہلے  
مجھے کبھی تمہارے چہرہ پر نہیں تھا۔ تو اب کیسے اتنی مطمئن ہو گئی ہے! تیرے  
اور منجربوں پر آج زندگی کی کوئی تلخی اور شکایت نہیں ہے۔ تجھے کسی سے کوئی  
نہیں ہے۔ تیرے ہونٹوں پر دکھ درد کی کوئی سسکی نہیں ہے۔ زندگی کو  
سینے کی قبر میں دفن ہو چکی ہے۔

اور تو سینی ٹوریم کی آندھی تنہائی میں اطمینان سے لیٹی دینا کو اس راہبہ  
سے دیکھ رہی ہے۔ جو ہر چیز کی حقیقت کو پہنچ چکی ہو۔ تیری پہلی موت  
کہ اب تک تجھے سکون حاصل نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب تو ایسی آخری موت  
ہے۔ جس کے بعد تجھے کوئی دکھ نہیں ملے گا۔ خوف و سکون ملے گا۔ زندہ  
ملے گی۔ صرف موت ملے گی۔ سرد اور سیاہ موت!

اور پھر تم نے زندگی کو کرنا بھی کیا ہے؟ زندگی نے تمہیں دیا ہی کیا  
کے چھین جانے کا تمہیں افسوس ہوگا، تیرے لیے تو موت زندگی کا پیام۔  
ات زاہدہ! موت کا استقبال یوں سکون اور اطمینان سے کرنا  
جلنے کن لوگوں کا حصہ ہے۔ یہ تم جیسے لوگوں کا حصہ ہے۔ یہ بد نصیب  
روحوں کا حصہ ہے۔ سچائی کی پرستار روح کا حصہ ہے۔ جن لوگوں کو  
کے سوا کچھ نہیں دیتی۔ ان کے لیے موت خوشی کا پیغام لاتی ہے جیسے ایک  
بچہ اہوا کچھ اچانک اپنی ماں سے جا ملے۔

میری بد نصیب زاہدہ! میری غریب سہیلی! میں تمہارے  
سکی۔۔۔ میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں گی۔۔۔۔۔ اور تمہیں یونہی  
چاپ مرتے ہوئے دیکھوں گی۔

دیکھ! میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میرا دل گچھل کر  
میں آ رہا ہے۔

پین لے کر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔  
حالانکہ مجھے تم سے ہمیشہ گلہ رہا۔ مگر تم نے اس مہربانی کو کبھی فراموش کیا۔

تم ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے ظالم دادا۔ بوڑھی والدہ اور ایک بھائی اور ایک چھوٹی بہن کے ساتھ شہر کے تنگ و تاریک محلے میں رہا کرتا تھا۔ تم سے اپنی بوڑھی ماں کو محنت و مشقت کرتے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جو ۲۵ سال میں ہی سفید بالوں والا سریسے ۶۰ سال کی بوڑھی عورت معلوم ہوتی تھی۔ تمہارا دلواوا شخص تھا۔ جو تمہاری پڑھائی کے سراسر خلاف تھا۔ مگر تم کسی نہ کسی طرح پڑھا تم بہت جلد پڑھ کر استانی بن جانا چاہتی تھیں۔ اور پھر تمہارا خیال تھا کہ تم چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کو بہت اعلیٰ تعلیم دلاؤ گی۔ اور یوں تم لوگوں کے آجائیں گے۔ اور تم لوگ آسودہ اور خوشحال زندگی گزار سکو گی۔ اور تمہاری بڑی خواہش تھی کہ اس کے بعد تم ساری دنیا کے سفر کو جاؤ گی۔ تم مجھے بتایا کرتی تھیں دنیا کو دیکھنے کا بے حد ارمان ہے۔ اور تم اس وقت تک کبھی نہیں مردی تم کہ تم ساری دنیا کو نہ دیکھ لو گی۔ تم نے اپنے پاس کچھ خوب صورت سینریاں تھیں۔ جو تمہارا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ اس میں ایک تصویر دریائے نیل کی تھیں مصر جا کر دریائے نیل دیکھنے کی کس قدر آرزو تھی!۔۔۔۔۔ یہ کوئی تم۔ اور میں تمہیں ہمیشہ یقین دلایا کرتی تھی۔ کہ ہم دونوں اکٹھی جائیں گی۔

مگر تم ہمیشہ یہ سارا کچھ کہہ کر اداس ہو جایا کرتیں۔ تمہیں پتہ تھا کہ یہ صرف ہی ہے۔ کہاں بمشکل تمام دو وقت کی روٹی اور کہاں دریائے نیل کی سیر۔ اس خواہش کا ہمیشہ احترام کیا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی۔ کہ میں تمہیں ساتھ لے کر میرے ڈیڑی نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ مجھے سمندر پار کے تمام شہر لے گا۔ اور تم چپ ہو جایا کرتیں۔

اچھی زاہدہ! تم نے تو ابھی ساری دنیا کی سیر کرنی تھی۔ اور سارے خا

تعلیم دلائی تھی۔ مگر یہ چار سالوں میں ہی کیا کیسے پلٹ گئی۔  
آج نہ تمہاری والدہ زندہ ہے۔ نہ دادا۔ اور تمہارا چھوٹا بھائی اور تمہاری پیاری بہن جسے تم نے لیڈی ڈاکٹر بنانا تھا۔ وہ رشتے کی ایک خالہ کے ہاں رہتے ہیں۔ جہاں سارا دن گھر کا کام کرتے رہتے ہیں۔ تب کہیں جا کر ان کو روٹی ملتی ہے۔  
زاہدہ! کیا تمہیں ان کا بھی کوئی خیال نہیں!!

تمہاری زندگی میں ایسا کون ظالم اور بے رحم شخص داخل ہوا جس نے ان واحد بنی فطرت کو برباد کر دیا۔ ایسی کوئی آندھی چلی۔ جس نے سارے چین کو اجاڑ کر رکھ دیا۔

تمہاری زندگی کا سوز و دقت سے بہت پہلے کیوں ڈوب گیا؟ صبح سویرے کیسی کالی رات ہے۔ جو تمہارے چاروں طرف پھیل گئی ہے۔ پھیل رہی ہے۔۔۔ اور تمہیں نکل رہی ہے۔

ان سالوں میں تمہاری دنیا بسی بھی اور اجر بڑی بھی۔  
اور زاہدہ! میں نے تمہیں اپنی دوست کہا۔ اپنی بہن کہا۔ اپنی سہیلی کہا۔ اور پھر تمہاری کوئی خبر نہ لی۔ کوئی حال نہ پوچھا۔ میں ان بہ سالوں میں تم سے بہت دور ہو گئی تھی۔

کاش! میں دور نہ جاتی۔۔۔۔۔ تو تمہاری دنیا کو اجر بڑے سے ضرور بچا لیتی۔ کچھ تو کرتی۔

ان میں اپنا پشیمان چہرہ لیے یہاں بیٹھی ہوں۔۔۔۔۔  
وقت گزر رہا ہے۔۔۔۔۔ اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے میرا دل ایران سے ویران تر ہوتا جا رہا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں مگر دل مجھے ڈھونڈ رہا ہے ہوں گے۔ اور میں یہاں اتنی دورانی اپنی چوٹی پر یکب سے تنہا بیٹھی ہوں۔

یہاں کتنی بلندی اور رفعت ہے۔ اگر یہاں سے کوئی گرے تو اس کی ہڈی پسلی

سُرمہ ہو جائے . . . . تو بھی پتہ نہیں کس بندی سے گری ہے! کہاں سے گری ہے۔

تجھے گراتے والے کون ہے؟ کہاں ہے؟ . . . .

اس نے تجھ سے کیسا بدلہ لیا ہے؟ . . . .

تو نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ . . . .

وہ مجھے بل جائے . . . . پھر دیکھنا کہ میں اس کا کیا حال نہیں کرتی۔

تمہارے کسی کام نہیں آسکی۔

زاہدہ! اگر اتنا وعدہ کرتی ہوں کہ اگر وہ مجھے اس زندگی میں کہیں مل گیا۔ تو تیرے۔

سارے بدلے چکا دوں گی۔ ضرور چکاؤں گی۔ مجھے اب کوئی داپس چلنا چاہیے۔

آج بہت دنوں کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ سلسل پندرہ روز تک بخارا آتا رہا۔ کمزوری کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ بڑی مشکل سے بیٹھی ہوں۔ جس دن سے زاہدہ کی موت کی خبر سنی ہے اور اس کا خط پڑھا ہے جو معہ ایک ہینڈل کے ملا تھا اس دن کے بعد سے پھر ہوش نہیں رہی۔ آج دل کچھ آرام اور سکون سے ہے اور بخار بھی نہیں ہے۔

سارے گھر والے پریشان تھے۔ ڈیڈی کو باہر دورے پر جانا تھا۔ مگر میری وجہ سے وہ بھی نہیں گئے۔ وہ انتہائی طور پر فکر مند تھے۔

امی سارا وقت میرے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ باجی اور نطفہ بھیا دونوں چپ چپ سے ہونگے تھے۔ ان کے پردہ گرام بنے کے بنے رہ گئے تھے۔

ان سب گھر والوں کو میرے اپنے گھر والوں کو میرا کس قدر خیال ہے اپنی بیٹی سے کتنا پیار ہے۔

مگر زاہدہ تیرا خیال کرنے والا! اس بھری دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا تو ایسا مرگیا۔ مرے وقت بھی تیرے پاس کوئی نہیں تھا۔ پتہ نہیں تو ایسے لمحوں میں

کیا سوچتی ہوگی! تیری سوچیں دکھتا ہوا انگارہ ہوں گی۔ جنہوں نے تمہیں جلا کر رکھا ڈال۔

زاہدہ! تیرا خط اور خط کے ساتھ یہ چھوٹا سا بندل میرے سامنے پڑا ہے۔ تیرا خط پڑھتی ہوں تو بندل کو کھولنے کی جرات نہیں کر سکتی۔

نے مکھا ہے۔  
پیاری بچہ! پرسوں تمہیں دیکھا۔ ایک طویل مدت کے بعد تمہیں اچھا دیکھا۔ تم میری اس آخری خوشی کا کبھی اندازہ نہ لگا سکو گی۔ جو تمہارے ہر اور پیارے چہرے کو دیکھ کر مجھے حاصل ہوئی۔ زندگی تمہارے لیے کتنا خوبصورت اور آسودہ خواب ہے۔ خدا کرے۔ تم ساری زندگی اسی خواب کی چھاؤں تلے سے بسر کر سکو۔

میں مر رہی ہوں۔ اور میری زندگی کے چند سالس باقی رہ گئے ہیں۔ اس دنیا میں کبھی واپس نہ آؤں گی۔ نہ تمہارا پیارا چہرہ دیکھ سکوں گی۔ نہ نیلا آسمان۔ نہ درخت۔ نہ اپنے چھوٹے بہن بھائی جو یہاں سے بہت دور رشتے کی خاطر پاس بیٹھے اس وقت نہ جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ خدا جانے ان کا کیا حال۔ . . . خالہ جب میرے سامنے ان کو مارتے سے فرق نہ کرتی تھیں۔ تو اب کا کیا نہ حال ہوتا ہوگا۔ بچہ! یہ خیال، یہ سوچ۔ یہ تصور، مجھے شاید قبرستان چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔

کاش! وہ دونوں بھی میرے سامنے مر جاتے تو اچھا تھا۔ کتنا اچھا تھا ہم لوگوں کے لیے زندگی سے زیادہ اچھی ہوتی۔  
مجھ سے زیادہ باتیں نہ ہو سکیں گی بچہ! کھانسی رکنے کا نام نہیں ہے۔ میں نہیں کھتی جا رہی ہوں رات ہو رہے ہوے میت رہی ہے، یوں لگتا ہے آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔  
اے دکھوں سے بھری ہوئی بسی۔ کالی اور پریشان رات! تیرا دل

سے آزاد ہو کر دھڑک رہا ہے۔ ٹھٹھڑ رہا ہے۔ تو کیوں نہیں خوشی بھاگ کر گزر جاتی! تیرا ایک ایک قدم غم سے بوجھل اور نڈھال کیوں رہا ہے۔ کیا تیری بھی کوئی بہن اور بھائی تجھ سے کہیں بہت دور بیٹھے کسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج تو مجھے آخری بار اس بستر پر دیکھ رہی ہے تو مجھے قبر میں دیکھے گی۔

رات کی سرد ہواؤ! میرا پیار میری بہن نسیم اور میرے بھائی انجم کے لیے لے جا دو میری آتی کی قبر پر جا کر بوسہ دو۔

اے آسمان کی پشانی پر چکنے والے ستارو! میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔ مگر تم اسے کبھی نہ بتانا۔ کہ وہ زاہدہ آج مر گئی۔ جسے تو نے اپنا کہا تھا۔ اور زندگی بھر ساتھ بھاہنے کا وعدہ کیا تھا۔

میری سہیلی بچہ! خط کے ساتھ یہ چھوٹا سا بندل بھی تمہیں بھیج رہی ہوں۔ اس میں میرے کچھ خط۔ اس کے خط۔ میری ڈائریاں۔ کچھ یادیں اور کچھ ادبیاں بھری ہوئی ہیں۔ تم ان سب کو رکھ لو۔ اور اگر کبھی تمہیں اس دنیا میں ”وہ“ کہیں مل جائے۔ تو اسے کبھی نہ بتانا کہ زاہدہ مر چکی ہے۔ اسے کبھی نہ بتانا کہ زاہدہ تو اسی روز مر گئی تھی۔ جس دن اس نے اسے چھوڑ کر اپنی پھوپھی کی لڑکی ٹینے سے شادی کر لی تھی۔ تم وعدہ کر دو کہ تم کبھی اسے نہیں بتاؤ گی۔ میری ان سب یادوں کو پڑھنے کے بعد جلا دینا، رکھ کر دینا۔ میں جیتے جہاں ان کو رکھ میں تبدیل نہ کر سکی۔ خود رکھ ہو گئی۔ مگر

لیکن اس میری ہنسی میں وہ جھنکار اور موسیقی کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اکثر ہنسی کی اس آواز سے ڈر ہی لگتا ہے۔ لیکن اور لڑکیاں تو بڑی پیاری آواز سے ہنستی ہیں مجھے تو اپنی ہنسی پر ہمیشہ یہی گمان ہوا ہے کہ جیسے ظالم اور بے رحم ماکہ کے چینی کے برتن اٹھا کر بے جا رہی تھی۔ کہ چھن سے ٹوٹ گئے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا ہے؟ اور دل خون سے دھڑکنے لگتا ہے۔

آج بھی سارا دن ہنستی رہی۔ تین بجے چھٹی ہوئی اور میں گھر آئی ابھی بیڑھیوں ہی میں تھی کہ ادھر سے دادا جان کے گرجے کی آواز سنائی دی۔ میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے اور میں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں طے کر بنے لگیں۔

میرا دل غم کی گہری دادیوں میں ڈوب گیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں کیوں ہنسی۔

میں آدھی سیڑھیاں طے کر کے سانس روک کر کھڑی ہو گئی۔ اور سننے لگی کہ دادا جان کیا کہہ رہے ہیں۔ دادا جان کہہ رہے تھے۔

میں کہتا ہوں۔ جب وہ اچھا بھلا کاؤ مرد ہے۔ اپنی دکان کرتا ہے۔ چار پیسے روز کم کر لے آتا ہے۔ کیا ہوا جو اسے بھنگ اور افیون کا شہ کرنے کی عادت ہے۔ تو زاہدہ کی بات دہاں پکی کیوں نہیں کرتی۔ . . . میں قبر میں پاؤں لگاٹے بیٹھا ہوں۔ کب تک انتظار کروں! تو بیٹی کو اسکول بھیج کر ہماری عزت و اعزاز کر رہی ہے۔ حرامزادی! دیکھ میں تجھے کیسے ٹھیک نہیں کرتا۔ ابھی گھر سے نکال باہر کروں گا۔

آج زاہدہ کو آئینے دو۔ جو اس گھر سے اس نے پھر باہر قدم رکھا۔ بار سے ملنے جاتی ہے۔ اسکول کیا جاتی ہوگی۔ بھلا کبھی شریفوں کی بہو بیٹیاں بھی گھر سے نکلی ہیں۔ ہم نے کونسی نوکری کرانی ہے!! اور اتنی کہہ رہی تھیں:

تم میرے مرنے کے بعد ان کو راکھ میں بدل دینا۔ تاکہ ہم ایک ہو جائیں۔

اور تجھ! میری سہیلی! وعدہ کرو۔ تم نسیم اور انجم کی زندگی کا میرے بعد ضرور خیال رکھو گی۔ اب الوداع میری دوست! الوداع.... الوداع.... الوداع۔

۲۵۔ نومبر ۱۔

آج اسکول میں ہم سب لڑکیاں بہت ہنستی رہیں۔ بہت دلوں۔ بعد ہنسی میرے لبوں تک آتی تھی۔ مجھے سنتے ہوئے بڑا ڈر لگا کرتا۔ ہنسی اور خوشی ہماری قسمت میں کہاں ہے۔ لیکن پھر بھی جب منور عشرت اور زریں نے لطیفے سنائے، نقیلیں اُٹا دیں اور خوب خوب لگایا کی تو ہنسی کے مارے بڑا حال ہو گیا۔ اور سننے سے کچھ دیر پہلے جو مجھے لگ رہی تھی وہ دور ہو گئی۔ یہ تو فائدہ مند ہنسی ثابت ہوئی سردی کتنی زبا بڑھ رہی ہے۔ مگر میرے پاس کوئی گرم کپڑا نہیں ہے۔ صرف ایک سو بڑا کیوں کے پاس کتنے خوبصورت سویٹر اور کوٹ ہیں۔ مگر ہمارے پاس ہے۔ آج صبح عشرت مجھے کہہ رہی تھی۔ زاہدہ! تم گرم چادر لے کر کیوں آئیں۔ کیا تمہیں سردی نہیں لگتی۔ اور میں نے ہنستے ہوئے اسے کہا کہ

نہیں ہے کوٹ کی حاجت نہیں ہے

کہ میں حلوے سے گرمائی گئی ہوں

اور وہ ہنس دی تھی۔ میں بھی ہنس دی تھی۔ میں تو اب بھی ہنس رہی

تو نے جو ظلم مجھ پر کیے ہیں۔ میں نے صبر کے ساتھ سارے برداشت کئے ہیں۔ میں نے اُف تک نہیں کی۔ یونہی ساری جوانی تیرے ظلموں تلے کاٹ دی، مگر اب بیٹی کے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس نامراد فیوٹی کے ساتھ اپنی چاند سی بیٹی کبھی بیاسنے نہ دوں گی۔ جا، آج میں بھی تجھے صاف کہے دیتی ہوں۔ آج تیرا لحاظ بھی ختم ہو گیا ہے اب تو میری بیٹی کے ساتھ ظلم نہیں کر سکتا۔

دادا جان منیر سنتے ہی چوہلے سے آدھ جلی مکڑی نکالی اور مارنے لگے۔ ننھے کہ میں اوپر چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ مکڑی والدہ کو مارنے کی بجائے میری طنز لے کر آئے۔ اور زور سے میری پیٹھ پر ماری۔ ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ مگر مجھ سے کھڑا نہ ہوا جاسکامیں مگر پڑی۔ . . . ہمالیوں کی باتیں۔ انی کے رونے کی آوازیں۔ یہ سبھی کچھ دور کنوئیں سے آتا ہوا محسوس ہوا۔ رات گئے تک غنودگی سی طاری رہی۔ اور پھر ہوش میں آگئی، میں روتی رہی۔

یا خدا تو نے مجھے کس گھر میں پیدا کر دیا ہے! اگر اس گھر میں پیدا کرنا تھا تو پھر ایسا دل کیوں دیا! دل کے اندر ایسی آرزوئیں کیوں پیدا کر دیں؟ علم سے اتنی محبت کیوں دے دی؟ یہ کتنا ظالم دادا ہے! بوڑھا ہو گیا ہے، مگر مرتا بھی نہیں۔ کتنے عرصے سے ظلم کر رہا ہے! اوروں کے گھر میں یہ ظلم کیوں نہیں ہوتا۔ ہمارے گھر میں کیوں ہوتا ہے؟ ہم نے کونسا گناہ کیا ہے؟ ہم کو کیوں سزا مل رہی ہے؟ یہ ظلم کیوں ہوا؟ اسے نہیں ہونا چاہیے۔ میں ظلم کرنے والے کو خود مٹا دوں گی۔ ہمیں بھی دنیا میں خوش رہنے کا حق حاصل ہے۔ میں کل ہی اتنی سے کہوں گی۔ ہم اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اور چل دیتے ہیں جہاں یہ دادا نہ ہو۔ اور لڑکیاں کتنی خوش رہتی ہیں۔ ان کے والدین ان کو بڑھ

سے کبھی منع نہیں کرتے۔

کل میں آسیہ کے گھر اس کی کتاب پڑھنے کے لیے لینے گئی تھی ان کا گھر کتنا بڑا ہے! کتنا خوبصورت سما ہوا ہے۔

کاش! ہمارا بھی ایسا گھر ہوتا! اس کی اتنی نے کتنے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ نوکر کام کر رہے تھے۔ اور پھر نچلے کمرہ میں جب میں آسیہ کا کمرہ سمجھ کر اندر چلی گئی۔ اور صوفہ پر ڈرتے ڈرتے بیٹھ گئی تھی۔ اور پھر میں کتاب کی تصویریں دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئی کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ کب اس کا بھائی آن کر سامنے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے اور مجھے گہری نظروں سے تنگ رہا ہے اور جب میں نے اس کو دیکھا تو چیخ میرے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اور میں گھرا گئی اور میرا حلق خشک ہو گیا۔ اور میں اٹھ کر بھاگنے لگی تھی۔ کہ اس نے ہاتھ سے پکڑ کر بٹھالیا۔

آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئیں۔ واقعی یہ میری زیادتی تھی۔ آپ مت جائیں۔ خود چلا جاتا ہوں۔ صرف اس سگریٹ کو ختم کرنے تک یہاں بیٹھوں گا۔ آپ شوق سے تصویریں دیکھیں اور اگر آپ کو تصویروں کا شوق ہے۔ تو میں اور لائے دیتا ہوں۔ ادھر الماری میں بہت سی پڑی ہیں۔

آپ خود ہی اٹھ کر نکال لیں۔ یہ آپ کے پچھلی طرف جو الماری ہے نا۔ نکال لیں وہاں سے۔

ارے! آپ تو خواہ مخواہ اتنا زیادہ شر مار رہی ہیں۔ اس میں بھلا شرم لینا کیا بات ہے! اور پھر آپ کا ہاتھ بھی کس قدر ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

اچھا! آپ تو بول ہی نہیں رہیں۔ میں خود ہی نکال دیتا ہوں۔ یہ دیکھتے اور یہ . . . یہ سویٹر ز لینڈ کی تصویر ہے . . .



ہائے! اگر دادا جان کو پتہ چل جائے کہ میں نے ایک مرد کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی ہے۔ تو وہ ابھی بمبہ والدہ اور بہن بھائی کے نہیں کُند چھڑی سے ذبح کر دے۔ اور خود پاگل ہو جائے۔ اس کے خیال میں دنیا میں قیامت آجائے۔ کیونکہ دادا جان قیامت کی نشانیاں یہی بتاتے ہیں۔ اور دوزخی ہونے کی بھی۔ جب کوئی لڑکی کسی غیر لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے گی۔ چاہے وہ باتیں قرآن مجید اور نماز کی کیوں نہ ہوں؟ تب قیامت آجائے گی۔

لیکن قیامت تو کوئی نہیں آئی۔ نہ آئے گی۔ دادا جان کا تو دماغ خراب ہے۔ ہائے بیٹھ پر کتنا درد ہو رہا ہے۔ اتنی سینک کرتی رہی تھیں۔ دو تین روز تک اسکول نہ جاسکوں گی۔ اچھا میں گھر میں بیٹھ کر کام کروں گی۔ دیکھیں دادا جان کیا قیامت کھڑی کرتے ہیں۔ اب تو امی بھی کہتی ہیں کہ اسکول جانا چھوڑ دے۔ کیا فائدہ! تجھے یہ بنام کر دے گا۔

ملنے اتنی ایوں نہ کہو۔ . . . . میں پڑھنا کبھی نہ چھوڑوں گی۔ خدا کے لیے اپنی بیٹی کا دل نہ توڑو۔ یہ دادا تو پاگل ہے۔

۲۹ نومبر :-

آج کئی روز کے بعد اسکول گئی۔ اس انگلیں ہو کر دل پریشان سا رہا ہے۔ دادا جان جانے نہیں دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے ان کی خوشامدیں اور منتیں کر کے گئی تھی کہ اس جماعت کو پاس کر لوں۔ یہ آخری جماعت ہے۔ پھر دسویں پاس کر لوں گی۔ پھر آگے نہیں بیٹھوں گی۔ . . . . تب کہیں جا کر وہ ملنے۔ آسید اسکول نہیں آئی تھی۔ میں نے کتاب واپس کر لی تھی۔ چھٹی کے بعد اس کے گھر گئی تو پتہ چلا کہ وہ شاپنگ کے لیے بازار گئی ہوئی ہے بس اب آنے ہی والی ہوگی۔ مجھے بیٹھ کر اس کا انتظار کر لینا چاہیے۔ لوگ نے نچلے کرہ کا دروازہ

کیا آپ کو پسند ہیں! آپ لینا چاہیں تو لے سکتی ہیں۔ آسید نے بتایا تھا۔ آپ کو ایسی تصویروں کا بہت شوق ہے۔ اور خوش قسمتی کیسے یا بد قسمتی کچھ مجھے بھی بہت شوق ہے۔ لیکن آسید کو ذرا سا بھی لگاؤ نہیں۔ لیکن آپ کتنی چپ بیٹھی ہیں۔ کوئی تو بات کریں۔ میں اس وقت سے خود ہی بول رہا ہوں۔

لیکن میں تو گونگی ہو گئی تھی . . . . . ایک لفظ تک نہیں بولا۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ جابڑا تھا۔ پھر وہی دیر کے بعد آسید آگئی۔ اور ساتھ لو کر چائے لے کر آیا۔

اور اس کا بھائی بھی زبردستی چائے میں شریک ہو گیا۔ کتنی باتیں کرتا تھا اس کا بھائی! کتنا ہنس مکھ اور کتنا خوبصورت ہے۔ اس کی آنکھیں کس قدر چمک دار تھیں۔ اور جسم کتنا اچھا تھا۔ . . . .

لیکن وہ اتنی دلچسپی سے کیوں باتیں کر رہا تھا۔ آج آسید نے بھی کہا اور پھر دوبارہ آنے کا کتنا اصرار کر رہا تھا۔ آج آسید نے بھی کہا کہ تمہارے جانے کے بعد میرے بھائی نے تمہاری بہت تعریف تھی۔ کتنا تھا بڑی بھولی اور معصوم اور پیاری سی لڑکی ہے۔ اور میں خواہ شرماتی تھی۔

کھول دیا اور میں بیٹھ گئی۔ بھڑکی دیر گزری تو مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر اسکا بھائی آگیا تو اسکو میرا دل دھڑکنے شروع ہو گیا میں نے سوچا کل اسکول میں کتاب واپس کر دوں گی۔ مجھے چلے ہی جانا چاہیے اور میں اٹھ کر آئے گی۔ سڑکیاں طے کر رہی تھی کہ آسید بعد اپنے بھائی کے بازار سے اہل آگئی۔

ہوا زائدہ! تم کب آتیں؟

ابھی ابھی آئی تھی۔۔۔۔۔ بس اب جانے لگی تھی۔ میں نے رک رک کر کہا۔  
تو تم کچھ دیر بھی انتظار نہ کر سکیں۔ بس یہی ہمارا قدر ہے! آسید نے متہنا کر کہا۔  
نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ کل آ جاؤں گی۔  
اس کے بعد ہم تینوں اندر کمرہ میں جا بیٹھے۔ اور پھر جو باتیں شروع ہوئیں تو گھنٹہ ہو گیا۔ سڑکیوں کے دن بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو شام پھیل رہی تھی۔ میرا دل بڑا ڈرا کہ دادا جان تو جان ہی نکال دیں گے۔

میں بڑی مشکل سے آسید سے رخصت لے کر آئی اور تیز قدم اٹھاتی کھڑکی طرف چلنے لگی۔  
جان گھر پر نہیں تھے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

رات کو مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ آسید کا بھائی یاد آتا اس کو سترخ ٹائی کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اور فاختائی رنگ کا گرم سوٹ اسے کتنا سج رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر کس قدر دکھ ہے!

اور یہی سوچتی ہوئی سو گئی۔

۱۵۔ دسمبر :-

امتحان کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ نو ماہی امتحان ہو رہے ہیں۔ آسید نے بار بار لایا ہے مگر میں جا ہی نہیں سکی۔ کل تو آسید خفا ہی ہو گئی۔ کہ تم کیوں نہیں آتیں۔ سب دو بیٹے سے اسکول نہیں آ رہی۔ نجمہ میری بہت پیاری دوست ہے۔ کتنی مہربان اور

رہکی ہے۔ دسویں کلاس کے بعد مجھ سے جدا ہو جائے گی۔ اس کے آبا جہان کی تبدیلی کو لمبو ہو گئی ہے۔ یہ دہاں چلی جائے گی پھر نہ جانے کب آئے گی۔

آسید اور قسم کی لڑکی ہے۔ اس سے میری طبیعت نہیں ملتی۔ مگر نجمہ تو بڑی اچھی لڑکی ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ مجھے برابر خط لکھے گی۔ ننھے انجم کو بھی نجمہ کس قدر پیار کرتی ہے!۔۔۔۔۔ میرا ننھا بیٹھا انجم اس ہو جائے گا۔ اور نسیم بھی۔

کاش! میں بھی نجمہ کے ساتھ کو لمبو جا سکتی۔ سیلون کس قدر خوبصورت شہر ہو گا؟ وہاں ناریل کے درخت ہیں۔ تیز بارشیں ہیں۔ کنول کے پھول ہیں۔ جھیلیں ہیں۔ مندریں ہیں۔۔۔۔۔ آسید کے بھائی نے بتایا تھا کہ سیلون میں سڑک پر گندگی کے ڈھیر کی جگہ بھی پھولوں کے ڈھیر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ہائے! وہ شہر کس قدر خوبصورت ہو گا۔

۲۶۔ دسمبر :-

آسید دسمبر کی چھٹیوں میں کراچی سیر کے لیے گئی ہوئی ہے۔ مجھے اس نے بتایا ہی نہیں۔ میں اس کے ٹال گئی۔ تو پتہ چلا کہ سارے چلے گئے ہیں۔ اس کا بھائی گھر پر موجود تھا۔ میں نے واپس آنا چاہا تو اس نے پھڑپھڑایا۔۔۔۔۔ میں گھبرا گئی۔ میں پھڑپھڑانا نہیں چاہتی تھی۔ اکیلے گھر میں ساگر چلو کو بھی تھے۔ مگر پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ آسید کیا کہے گی؟

لیکن اس نے زبردستی بٹھالیا۔ نوکر کو چلنے لانے کو کہہ دیا۔ میں بہتر منع کرتی رہی۔ مگر وہ نہ مانا۔۔۔۔۔ پھر اس نے مجھے کشمیر کی تصویریں دکھائیں۔ کشمیر اور گلگو چرا گائیں۔ وہاں کے نفا سے اور بتایا کہ ساری تصویریں میں نے خود کشمیر سے لے کر رنگ بھرے ہیں۔۔۔۔۔ اور میں کشمیر کا کو نہ کو نہ دیکھا ہوا ہے۔ وہاں اتنے خوبصورت پہاڑ ہیں۔ پھول ہیں۔ درخت

ہیں۔ چوٹیاں ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں ہیں۔ کتم دیکھو، تو پاگل ہو جاؤ۔  
مجھے سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے۔ اور میں ساری دنیا کا چکر لگانا چاہتا ہوں۔ کچھ سال  
میں انگلینڈ چھ ماہ رہ کر آیا ہوں۔

تہیں وہاں کی باتیں کیا بتاؤں!..... کس قدر آزاد اور خوشحال اور خوبصورت ملک  
ہیں ہم لوگ تو ان کے مقابلے میں صفر کے برابر بھی نہیں ہیں۔ وہاں عورتیں آزاد پھرتی ہیں۔ ان  
کی صحبتیں اس قدر اچھی ہیں کہ گلاب کے پھول معلوم ہوتی ہیں..... مگر..... اور پھر جھجک  
کر وہ کہنے لگا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے تم سے زیادہ بھولی اور شیریں نہیں ہیں۔

اچھا دیکھو زائدہ! ایک بات کہوں۔ براتو نہ مانو گی۔ لیکن اگر تم بڑا بھی مٹاؤ گی تو بھی کہے  
بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں تم کو بہت پیار کرنے لگا ہوں۔ اور زائدہ! تم مجھے بہت یاد آئے گی۔  
جس دن سے تمہیں دیکھا ہے بہت اداس رہنے لگا ہوں۔

کیا تم اس گھر میں رہنا پسند کر دو گی.....

کیا تم آسیہ کی بھابی بنو گی!!

کیا تم میری بنو گی!!!

میں ایسی محبت نہیں چاہتا۔ جو صرف محبت ہو۔ بلکہ میں تو تم سے شادی کر کے اپنی بوی  
بنا کر گھر لانا چاہتا ہوں۔ اور ساری عمر اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔

بولو! کیا تم میری بوی بنو گی!

ہائے! میں اس کی باتوں کا بھلا کیا جواب دیتی۔ میں شرم سے دوسری ہوئی جا رہی تھی  
مجھ سے تو کچھ تک نہیں اٹھائی جاتی تھی۔ بولنا تو انگ رہا۔

آسیہ کا خوبصورت۔ نوجوان اور دلکش چہرے والا بھائی۔ اختر میرے سامنے بیٹھا  
تھا۔ اور مجھے تنکے جا رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تودہ پر منوں نظر  
مجھ پر گڑھی ہوئی تھیں۔ میں سر سے لے کر پاؤں تک لرز گئی..... میرا دل تیزی سے  
دھڑکنے لگا۔

دہ بولا..... بتاؤ زائدہ! کچھ تو بولو..... کیا تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔

لیکن میں خاموش رہی۔ میں اسے کیا بتاتی! میں اسے کیا جواب دیتی!  
بھلا دھرتی کے باسی پھول اور آسمان کے چمکتے ہوئے تارے کا بھی کبھی ساتھ  
ہو ہے! بھلا مغل اور مل کا بھی کبھی میل ہوا ہے! کہاں عکسوں میں رہنے والا اختر.....

اور کہاں جھونپڑی میں رہنے والی زائدہ! کشادہ باخوں اور تنگ گلیوں کا کیا میل! میرا دل حکیم  
اس کی محبت سے بھر آیا! اپنی غریبی پر بھر آیا۔ اس آغاز کے انجام پر روتے لگا..... اور  
آپنیں دادا جان کا چہرہ یاد آتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ادوہ! وہاں اس وقت اور  
تیز ہو گیا جب مجھے کیم ایفونی اور بھنگی کا خیال آیا۔ جس کے ساتھ میرا دادا مجھے باندھنا چاہتا تھا  
اختر میرے رونے پر حیران رہ گیا۔ اس نے سمجھا کہ شاید اس کی باتیں مجھے بُری لگی ہیں۔ بے چارہ  
گھبرا گیا۔ کہنے لگا۔

زائدہ! خدا کے لیے مت روؤ! مجھے بتاؤ روئے کی وجہ کیا ہے؟ کیا میری کسی بات  
پر نہیں رونا آیا ہے! میری باتیں تمہیں بُری لگی ہیں!..... کیا تم اس رشتہ کو پسند نہیں کرتیں  
اگر تم نہ چاہو گی تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔ مگر خدا کے لیے روئیں۔ دیکھو ابھی لو کر چائے لے  
کر آجائے گا۔ تودہ دیکھے گا تو کیا کہے گا..... چپ ہو جاؤ..... یہ کہہ کر اس نے میرا  
ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے چوم لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں نے جلدی سے ہاتھ  
چھڑا دیا اور پھر بغیر بات کیے چائے پیئے گھر آ گئی۔ اس نے کتنا زیادہ اصرار کیا۔ مگر میں نہ بھڑکی۔  
ہائے! میں کتنی پاگل ہو گئی تھی..... میں نے اس کی بات کا کوئی جواب ہی نہ دیا! کیا پتہ  
میری قسمت کتنی اچھی ہی ہو۔ اگر میری شادی وہاں ہو جائے تو..... سب ہسائیوں کی آنکھیں  
لکڑی لکڑی رہ جائیں۔ میری سہیلیاں حیران رہ جائیں۔ میری والدہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی کتنی ہی  
گھبراہٹ ہو جائیں۔ ہائے! اللہ! ہمارے کتنے دن نہ پھر جائیں! میرا چھوٹا بھائی اور بہن  
ایسا بھائی پا کر کس قدر خوش نہ ہوں۔ لیکن ہمارا گھر تو کس قدر چھوٹا سا ہے۔ کیا وہ یہاں آجایا کرے  
گا! کیا اس کے گھر والے مان جائیں گے۔

نہیں وہ نہیں مانیں گے۔ وہ کیسے مانیں گے! انکا اکھوتا بیٹا اور بھائی ایک غریب لڑکی  
سے شادی کرے!..... کبھی نہیں مانیں گے۔

میں بھی بھلا کتنی پاگل ہوں۔ جو ایک دم سوچنے پر اتر آئی ہوں کیا معلوم اس نے وہاں  
ہی کیا ہو۔۔۔۔۔

میں تو سچ بچ بچ ہوں۔

اب میں ایسا کبھی نہ سوچوں گی۔ میں اس کے گھر ہی نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی۔ کیسے  
جان کو پتہ چل گیا تو وہ گلا ہی دبا دیں گے۔

یا خدا! میری مدد کرنا۔ مجھے دھان جانے سے روکنا! آمین ثم آمین! اے میری نیند اتوار  
جلدی سے میرے پاس آجا۔ میں اب سونے جا رہی ہوں۔ اتنی کہہ رہی ہیں کہ اتنی رات گئے  
مٹی کے دیئے تلے بیٹھ کر اسکول کا کام مت کرنا انھیں خراب ہو جائی گی ان کو کیا پتہ کہ انکھوں  
ساتھ یہاں دل بھی خراب ہو رہا ہے۔

یا خدا! میری مدد کرنا۔ مجھے بُری راہ سے بچانا۔ میری سہیلیاں کہتی ہیں۔ کہ مر دے  
ہوتے ہیں۔ لڑکی کو خراب کر کے چھوڑ جاتے ہیں۔ بدنام کر دیتے ہیں۔ یا خدا! مجھے ان  
بچانا۔ ضرور بچانا آمین۔

۲۔ جنوری

آج سے اسکول کھل گیا ہے۔ صبح سویرے اسکول گئی۔ دعا ہوئی۔ دعا کے بعد کلاس  
میں آگئی۔ آسبہ ملی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میرا دل ایک دم دھڑکنے لگا۔ میں نے  
انکھیں نیچی کر لیں جیسے چوری کرتے پکڑے گئی ہوں۔ وہ سننے لگی۔ اور پھر مجھے ایک طرف لے  
جا کر ایک رقعہ دیا۔ کہ یہ لو، اسے آدھی چھٹی کے وقت پڑھ لینا! ابھی ڈسک میں بند کر کے رکھ  
لو۔ میں نے بغیر جواب دیئے جلدی سے لے لیا۔ اور ڈسک میں بند کر لیا۔ کیسے لڑکیاں نہ دیکھ  
لیں۔۔۔۔۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے ہی اس چیز کی منتظر تھی۔ آدھی چھٹی کے وقت پڑھنے  
کی ہمت نہ ہوئی لیکن سارا وقت بے چین سی رہی۔ بار بار تائے کو دیکھتی رہی کبھی سوچتی نہ جاتے  
کیا لکھا ہے! کیا لکھا ہوگا؟ پتہ نہیں کیا ہوگا؟ کہاں جا کر دیکھوں؟  
اچھا لیٹرین میں جا کر دیکھتی ہوں اور پھر میں اُدھر چلی آئی۔ اور لیٹرین میں جا کر خط کھولا۔ اور  
پڑھا! لکھا تھا:-

پہلی دفعہ کچھ سمجھ نہ آئی۔ دوسری بار پھر پڑھا۔

پیارے زاہدہ!

تمہیں بہت بہت پیار!

تم اس دن سے برابر یاد آ رہی ہو۔ میں روزانہ گھر پر تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔ مگر تم آئیں اگر تمہیں میری اس دن کی باتوں کا برا لگا ہو۔ تو مجھے معاف کر دو۔ لیکن میں کیا کر دوں! دل کے ماتھوں مجبور ہوں۔ اور اب بھی تمہیں وہی باتیں دہرا کر تم سے جواب مانگتا ہوں۔ یہاں ہے تم ضرور جواب دو گی۔۔۔۔۔

کیا تم آج اسکول کے بعد آؤ گی!

میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔ فقط

صرف تمہارا

اختر

خط پڑھ کر میں نے جلدی سے پھاڑ دیا۔ اور ٹکڑے وہیں پھینک کر آگئی۔ باہر نکلی تو یوں لگا اندر داخل ہوتے وقت جو مال گاڑی سر پر کھڑی تھی۔ وہ اب گزر چکی ہے اور میں بھی ہو کر نیچے آگئی ہوں۔

میں خاموشی سے سیڑھیاں طے کر کے نیچے آگئی۔ مجھے ایک دم یوں محسوس ہوا تھا جیسے اختر اور آسیہ مل کر مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ بھلا اختر کو مجھ سے ایسی کونسی محبت ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن میں بے وقوف نہیں بنوں گی۔۔۔ میں کبھی نہیں جاؤں گی ساری چھٹی کے وقت آسیہ نے مجھ سے پوچھا۔ زاہدہ آج ہمارے گھر آؤ گی۔

نہیں میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ میں نہ آسکوں گی!

اور وہ چلی گئی۔ میں اپنے گھر آئی اور اس اور خاموشی سی ہو کر اپنی کھڑکی میں بیٹھ گئی۔ سامنے کے مکان میں ایک لڑکا ناظر رہتا ہے اس کی نئی شادی ہوئی ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ادم دھوپ میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور بیوی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی ہے اور وہ محبت اور پیار سے بھری ہوئی نظروں سے اسے تک رہا ہے۔۔۔۔۔ اور وہ مسکرا رہی ہے۔

مجھے ایک دم یوں لگا جیسے اظہر کی جگہ اختر ہے اور اس کی بیوی کی جگہ میں ہوں۔ اور دنیا

بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ جہاں قدم قدم پر ایسا پیار کرنے والے خاوند کی مسکراہٹ اور پرمیت نظر میں میسر ہیں۔ مگر دادا جان کی آواز نے میری تصویر کو دھندلا کر دیا اور میں ان کے پاس جا پہنچی۔

کیا بات ہے دادا جان!

بیٹی! ذرا میرے حقے میں دو کوٹکے تو چوہلے سے لا ڈال! اور دیکھ! ادھر طاق پر تباکو کی پڑیا پڑی ہے اسے بھی لیتی آ، اور دیکھ! آسیہ اور انجم باہر گلی میں نکلے تھے۔ آدھ گھنٹہ ہو گیا ہے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔ ان کو ذرا آواز دے۔

میں نے خاموشی سے سارے کام کر دیئے۔ اور پھر کھڑکی کے پاس آ بیٹھی۔ مگر اب وہ دونوں نیچے چلے گئے تھے! اور مجھے یوں لگا جیسے وہ نیچے نہیں گئے بلکہ آسیہ کے گھر گئے ہیں۔۔۔

۲۶۔ جنوری :-

کئی روز سے اداس اور خاموش ہوں۔ آسیہ سے کتراتی ہوں۔ حالانکہ اس نے گھر آنے کے لئے کئی بار کہا ہے۔ مگر میں نہیں جاؤں گی۔ میں کیوں جاؤں!!۔۔۔۔۔ میری زندگی ایک ایسا اداس گیت ہے۔ جیسے امتحانوں میں ایک ماہ رہ گیا ہے۔ اب مجھے پورے دھیان سے پڑھنا چاہیے۔ پہلی مارش کو امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ خدا کرے۔۔۔۔۔ میں میٹرک میں وظیفے لوں۔ اس کے بعد میں ایف اے کروں گی۔ پھر بی۔ اے۔ اور پھر ایم۔ اے اور پھر انگریز چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔

ماتے! کتنا اچھا ہو جو ایسا ہو جائے!

کاش ایسا ہو جائے! آمین۔

کی کیوں؟ ..... مجھے برا سا لگا۔ مجھے ڈر سا لگا۔ میں پریشان سی ہو گئی۔ میرا دل گھرنے

لگا۔ .....  
اور میں ہاتھ پھڑک کر دیوار کے ساتھ لگ کر خاموش کھڑی ہو گئی۔ میرے سر کے اوپر  
لگا لگ ٹپک ٹپک کر رہا تھا اور کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ اور آسید بے خبر  
بنی الماری میں سے پرے ڈھونڈ رہی تھی۔ اختر نے کہا۔  
پرے تو ادھر والے کمرہ میں پنگ کے ساتھ والی میز پر پڑے ہیں اور وہ لینے کو دھڑ  
چلا گئی۔

اختر نے مجھے پکڑ کر پلنگ پر بٹھالینا چاہا۔ مگر میں نے سختی سے کہا آپ نے جو بات  
کرنا ہو۔ منہ سے کریں۔ مجھے ہاتھ مت لگائیں۔  
کیوں! کیا میرے ہاتھ ایسے ہی گندے اور بُرے ہیں! اگر یہ برے ہیں تو لو میں انہیں  
کاٹ لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ دانتوں تلے زور سے دبایا۔ اور پھر مجھے دکھایا  
دانت اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ پھر کہنے لگا:

اچھی زاہرہ! دیکھو! یہاں کرسی پر آن کر بیٹھ جاؤ۔ یہاں کھڑا ہونا کس قدر بُرا لگ رہا  
ہے تم بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جانے میں بھلا کیا ہرج ہے! تم نے آج تک کبھی میری بات نہیں مانی۔  
لو بیٹھو یہاں اور میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا اور مجھے  
تکٹے لگا۔ اس کی آنکھوں میں وہی سحر اور التجا تیرنے لگی۔

اس نے پھر وہی کہا۔ زاہرہ! کیا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔

کیا تم مجھ سے شادی نہیں کر دو گی؟

میں نے اداس آواز میں کہا۔

”نہیں“

کیوں!

یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ آپ خواہ مخواہ میرا مذاق زبانیں۔

خدا کی قسم۔ میں تمہارا مذاق نہیں بنانا بلکہ یقین کر دو۔ میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔

۴۔ فروری :-

آج آسید نے بتایا کہ اس نے ایسے گیس پیپر ز منگائے ہیں جس میں سے پورے سال  
پورے سوال آجائیں گے۔ اور وہ کہنے لگی کہ وہ مجھے بھی ضرور دے گی۔

آسید کتنی اچھی لڑکی ہے۔ اس نے کلاس میں کسی اور لڑکی کو نہیں بتایا۔ صرف مجھے  
بتایا ہے۔ میں خواہ مخواہ اس سے کھینچی کھینچی رہتی تھی۔

اس کے بھائی نے بڑی مشکل سے یونیورسٹی کے کسی شخص سے حاصل کئے ہیں۔  
اور اب وہ مجھے ضرور دے گی۔ وہ سکول نہیں لاسکتی ناکہ یونیکم اگر یہ بات QUT ہوگی  
تو پھر اس شخص کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ اور پھر پرچے نئے سرے  
سے بنوانے پڑیں گے۔

میں کل لینے کے لیے اس کے گھر جاؤں گی۔ آج میرے کپڑے کچھ اچھے نہیں  
ہیں۔ کل جاؤں گی۔

۵۔ فروری :-

آج میں آسید کے ہاں گئی۔ اس کا بھائی کبیل اوڑھے پلنگ پر سویا ہوا تھا۔ ہم  
دوسرے کمرہ میں چلی گئیں۔ آسید کہنے لگی۔ پرچے بھیا کی الماری میں ہیں۔ ابھی اٹھیں گے تو دیں  
گے۔

اس کے بعد ہم اور باتیں کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اختر اٹھا۔ آنکھیں بند سے  
بھاری ہو رہی تھیں۔ چہرے پر عجیب طرح کا سحر تھا۔ مجھے دیکھا تو بے حد خوش ہوا۔ اور جلد  
سے میرا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ اور پھر زور سے ہاتھ دبایا۔ میں شرم سے پاگل سی ہو گئی۔  
کتنا پاگل ہے اس کا بھائی۔ آسید کے سامنے ایسی حرکت کر دی۔ اور پھر ایسی حرکت کیوں

اور میں واقعی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

پھر آپ اگر میرے ساتھ مذاق نہیں کر رہے۔ تو اپنے ساتھ کر رہے ہیں۔

میں اپنے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اپنے ساتھ خوشی کی بات کر رہا ہوں۔

زاہدہ! مجھے تمہاری قسم۔ جو میں جھوٹ بولوں۔ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اور

تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

کیوں نہیں ہو سکتا زاہدہ!

ہم غریب لوگ اور آپ امیر لوگ۔ ہمارا اور آپ کا کیا رشتہ!

تم امیری غریبی کی بات نہ کرو۔ میں ایسی ہر بات سے آزاد ہوں۔ میں جس سے شادی

کرنا چاہوں۔ اس سے شادی کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔

تمہارے گھر والے کبھی نہ مانیں گے۔

اگر وہ میری بات نہ مانیں گے تو کس کی مانیں گے۔

وہ اپنے وقار اور عزت کی بات مانیں گے۔

میرا نام ہی ان کا وقار اور عزت ہے۔ زاہدہ! تمہیں اس سے کیا۔ تم ایک دفعہ مال

کر دو۔ اپنے دل کی بات بتا دو۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔ تمہیں اس سے کیا؟

اور میں خاموش ہو گئی۔ میں اور کیا کہتی! بھلا جسے اختر جیسا اچھا اور چاہنے والا خاندان

مل جائے۔ اسے کیا چاہیے!

میری خاموشی پر وہ کہنے لگا

تو کیا میں تمہاری خاموشی کو مال سمجھ لوں۔

اور میں نے سر جھکا دیا۔

بس جی! اس کی تو باچھیں کھل گئیں۔ اور اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وعدہ

کہ وہ زندگی بھر میرا ساتھ دے گا۔ ہر حال میں ساتھ دے گا۔ سارے گھر والوں کو خاندان

کو چھوڑ دے گا مگر مجھے نہ چھوڑے گا۔ اور یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ کو کئی بار چوم لیا۔

پھر میں آہستہ سے بڑے بغیر گھر آ گئی۔

میرا دل خوشی کے مارے اچھل رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا گھر میں داخل ہوتے ہی

بھاگ کر والدہ کے سینے سے چپٹ جاؤں۔ اور اسے بتاؤں۔ سارا کچھ بتا دوں۔ سیر پھیاں

ٹے کرتے ہی ننھی نسیم ملی میں نے اسے گود میں اٹھالیا اور بہت پیار کیا۔ میں بے حد خوش تھی۔

میرا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا تو سرخ ہو رہا تھا۔

آج والدہ کہہ رہی تھیں کہ تو اتنی خوش کیوں ہے؟ آج میں والدہ کو بہت دیر تک دیا

رہی۔ ان کے مطلب کی باتیں کیں۔ ان کی ہال میں ہال ملائی رہی اور جو کام وہ کہتی ہیں۔ وہی

کرتی رہی۔

#### ۶۔ ضروری :-

ساری رات میں بائبل نہیں سو سکی۔ ساری رات میرے خوابوں میں اختر جیسا رہا۔

کبھی ہم دونوں نیلگوں پہاڑیوں کو عبور کر رہے ہیں۔ کبھی ہم داویوں اور گھاٹیوں کو طے کر رہے ہیں۔

ہم دونوں نے ہاتھ میں ہاتھ ملائے ہوئے ہیں۔ اور گھوم رہے ہیں۔ میں نے بے حد خوبصورت

پکڑے پہنے ہوئے ہیں اور اختر مجھے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔

رات بار بار نیند ٹوٹ جاتی تھی۔ آج کی صبح بڑے ہی عجیب انداز سے طلوع ہوئی۔

آج سورج نے بڑی شان سے آنکھیں کھولیں۔ آج کی صبح کس قدر خوبصورت تھی!۔

آسمان پر بادلوں کے خوبصورت جزیرے بنے ہوئے تھے۔ نیلا آسمان اور ٹھنڈی ٹھنڈی

ہوا۔ میری آنکھیں۔ اپنے آپ بند ہونے لگیں۔

اٹھائے آن کر اٹھایا۔ بیٹی! کیا آج نماز نہ پڑھو گی! جلدی اٹھو۔ اسکول سے دیر ہو جائے گی۔

لیکن اُمی دیکھو تو آسمان پر کتنے خوبصورت بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ہوا کتنی پیاری چل رہی ہے۔ اُچی! آج تو سونے کا دن ہے۔

پاگل بیٹی! بس بادلوں اور ہوا اور پھولوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے۔

چل اُسٹھ! اب بستر کو چھوڑ دے چل میری بیٹی! اور میں اٹھ بیٹھی!

اور جلدی سے تیار ہو کر اسکول چل دی۔ وہاں پر آسیہ ملی۔ اور اس نے مجھے گلے لگالیا۔ پہنا کیوں! کیا اسے علم ہو گیا ہے! میرا دل دھڑکا۔ اور اس نے ہولے سے میرے کان میں بھالایا۔ کہا۔ اور میں سرخ شفق بن گئی۔

تو تم بھی مجھے بنانے لگ پڑی ہو۔

میں بھلا کیوں بنانے لگی! اور پھر میں نے کیا بھی کیا ہے؟ تہیں تو خواہ مخواہ شک ہو گیا ہے۔

کاہے کا شک؟

اچھا بتاؤ۔ پرچے لائی ہو؟

او نہیں!

تو پھر کیسے ددگی؟

گھر آن کر لے جانا۔

میں نہیں روز روز گھر آتی۔

اب تو روز روز آنا پڑے گا۔

اُچی کو آن کر پھر تم ہی منانا۔

ہاں میں ان کو کہہ دوں گی۔

اور دادا جان کو!

ان کو خدا بتا دے گا!

خدا کیا اسکول میں پڑھتا ہے؟ اور کب آکر کہے گا؟

آج سے دو سال کے بعد خدا آن کر کہے گا۔ تب تیرا دادا خود تجھے دلہن بنا کر ہمارے

مرخصت کرے گا۔ سمجھیں!

اور دعا کے یگھٹی ہوئی۔ اور دعا کے وقت میں نے سر جھکا کر خدا سے عاجزی سے

دعا مانگی۔ کہ یا خدا میری مدد کرنا۔ مجھے بدنامی سے بچانا اور میرا ساتھ دینا۔

اور دعا مانگتے وقت میرا دل بھر آیا۔ اور دعا ختم ہونے کے بعد جب میں کلاس روم میں داخل

ہوئی تو میرے قدم سست تھے اور دل اداس۔

۱۵ فروری :-

آج ہمارے اسکول میں ہماری FAREWELL پارٹی تھی۔ کیونکہ پہلی مارچ سے

امتحان شروع ہو رہے ہیں۔ اور امتحان کی تیاری کے لیے پندرہ چھٹیاں ہوتی ہیں۔

کل آسیہ ہمارے گھر آئی تھی۔ اور اس نے میری والدہ اور دادا جان کو منالیا ہے

کہ وہ ان چھٹیوں میں ہمارے گھر پڑھنے آیا کرے گی۔

آسیہ کو اپنا گھر دکھاتے ہوئے میرا چہرہ اداس تھا۔ ان کا گھر کس قدر خوبصورت

ہے مگر ہمارا گھر ایسا نہیں ہے۔ کہیں آسیہ گھر جا کر اختر کو نہ بتا دے۔ اختر بھلا یہاں کیسے

آیا کرے گا؟

اس سوچ نے مجھے اداس اور آرزو کر دیا۔ اور میں سارا دن اداس رہی۔ خاموش رہی۔

خاموشی سے اسکول کو الوداع کہا۔ الوداع کتنے وقت میرا دل بھر آیا۔ مگر میری آنکھیں خاموش

رہیں۔



آسیہ کے ہاں روزانہ جاتی ہوں۔ وہاں پر اتنا جی بگ گیا ہے کہ بڑی مشکل سے رات گزارتی ہوں۔ اور صبح کو پھر چل دیتی ہوں۔ آسیہ بھی دادا جان پر نہ جلنے کیسا جادو چھوڑ گئی ہے کہ وہ کچھ نہیں کہتے۔ آسیہ کی اتنی کس قدر اچھی ہے!

اور آخر کس طرح سارا سارا دن تنگ کرتا رہتا ہے؟ ذرا آسیہ ادھر ادھر ہوئی۔ اور اس نے آن کر باتیں کرنا شروع کر دیں اور ہاتھ جو منے لگتا ہے۔ بے چین سا ہو جاتا۔ کتنی باتیں کرتا ہے کہ شادی کے بعد یہ کریں گے وہ کریں گے۔ زندگی کتنی دلچسپ اور کتنی پیاری چیز ہے۔ پہلے میں کتنی اداس

رہا کرتی تھی۔ اداس تو میں اب بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہوں۔ لیکن اس اداسی کا کیا ہے! امتحان پر آگیا ہے!

پرسوں سے امتحان شروع ہو رہا ہے۔ خدا کرے میں اچھے نمبروں پر پاس ہو جاؤں۔ اب تو پڑھائی میں وہ جی نہیں لگتا جو پہلے لگتا تھا۔

۱۔ مارتھ :-

آج جنرالیہ کا پرچہ تھا۔ جو بہت اچھا ہو گیا ہے۔ آسیہ کا بھی اچھا ہو گیا ہے۔ آخر نے بہت بہت مبارک دی ہے۔

۲۔ مارتھ :-

پرچے بہت اچھے ہو رہے ہیں۔ ڈائری سمجھنے کی فرصت نہیں مل رہی۔ امید ہے۔ باقی کے پرچے اچھے ہو گئے تو فرسٹ ڈویژن آجائے گی۔ خدا کرے۔ ایسا ہی ہوا۔ آمین.....

پھر آخر کس قدر خوش ہو گا!

۱۶۔ مارتھ :-

آج آخری پرچہ تھا۔ آج اتنی سے اجازت لے کر زندگی میں پہلی بار..... میں اختر اور آسیہ فلم دیکھنے گئے۔ درمیان میں اختر تھا۔ ایک طرف میں تھی۔ اور دوسری طرف آسیہ تھی..... وہاں رات فلم دیکھی۔ فلم مجھے بے حد پسند آئی اور خاص طور پر گیتا بالی کا کیریکٹر۔ مگر اختر اور آسیہ کو یہ فلم پسند نہ آئی۔

رات کو آسیہ مجھے گھر چھوڑنے آئی اور دادا جان سے یہ کہا کہ ان کے گھر میلاد شریف تھا۔ اس لیے دیر ہو گئی۔

دادا جان نے کہا۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں میلاد شریف میں بیٹھنا ثواب کا کام ہے۔ لیکن بیٹی! کسا ہے کے لیے میلاد شریف کروایا تھا۔

امی نے کہا۔ کوئی کاہ ہے کے لیے میلاد شریف کراتا ہے۔ اللہ کا نام کوئی کسی مطلب کے لیے لیتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔

میرا مطلب..... اچھا میلاد شریف کرایا تھا۔ بیٹھو بیٹی آسیہ اب کچھ دیر تو بیٹھو.....

نہیں میں اب جاتی ہوں۔

تو کیا اب کیلے جاؤ گی!!

نہیں۔ میرا بھائی ساتھ ہے۔

تو اسے بھی اوپر لے آؤ۔

میرا بڑا بھائی ساتھ ہے۔

تو کیا زادہ بھی اس کے ساتھ ہی آئی ہے۔

میں ڈر گئی۔

آسیہ نے کہا۔ وہ بہت پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اور ہم آگے آگے آ رہی تھیں۔ مانی نیر بھی ساتھ تھی۔ وہ پرلی گلی کی طرف مڑ گئی ہے۔

اچھا۔۔۔

آسیہ چلی گئی۔ مجھے ڈر تھا۔ بعد میں دادا جان کچھ نہ کہیں۔ مگر وہ خاموش رہے۔ اور کچھ دیر کے بعد پوئے۔

زائدہ بیٹی! وہاں مت جایا کر۔ جن کے گھر جوان بھائی ہوں۔ وہاں نہیں جانا چاہیے اگر تو اب گئی۔ تو یاد رکھیں تجھے بہت بڑی طرح ماروں گا۔ میں نے وعدہ کر لیا۔۔۔۔۔ دادا جان! اب کبھی نہ جاؤں گی۔۔۔۔۔ اور یوں خاموش ہو گئے۔

کی جھجھے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ ہاں واقعی نہیں جانا چاہیے۔ کیونکہ پھر شادی میں جب میری شادی وہاں ہوگی۔ تو وہ کہیں کچھ ایسی دلیسی بات ہی نہ سمجھ لیں شادی کرنے سے انکار کر دیں۔

ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے۔ اختر سے تو اب میری ساری زندگی وابستہ ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے اسی کی اور صرف اسی کی ہوں۔

۲۸ مارچ  
استغان

کب کے ختم ہو چکے ہیں اسکول بند ہو چکا ہے۔ سارا سارا وقت گھر پرانی کے ساتھ کام کر داتی رہتی ہوں۔ آسیہ نے کئی بار بلا بھیجا ہے۔ مگر نہیں جاسکتی۔ دادا جان جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ موسم بدل رہا ہے۔ دھوپ میں کچھ تمازت سی آچلی ہے جس سے دھوپ میں بیٹھا مشکل ہو رہا ہے۔ چھاؤں میں بھی نہیں بیٹھا جاتا۔ بالکل ایسے جیسے نہ اس گھر میں رہنے کو جی چاہتا ہے۔ اور نہ آسیہ کے ہاں جاسکتی ہوں۔ دادا جان کتنے عجیب ہیں۔ کی بھلا ان کی یہ بندش میرے دل سے اختر کا خیال نکال سکتی ہے!

کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں نکال سکتی۔

پھر کیا ہوا۔ اگر میں اختر سے نہیں مل رہی۔ اسے ملے کئی روز ہو گئے ہیں۔ مگر میں اسے لڑانا یاد کرتی ہوں۔ اور خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ دن جلد آئے۔ جب وہ مجھے پناہ کر اپنے گھر لے جائے۔ آمین۔ یا خدا میری اس آرزو کو ضرور پورا کرنا۔ اس کے بعد میں اس کے ساتھ نئے نئے ملک دیکھوں گی اور ساری دنیا کا سفر کروں گی اور اپنے بہن بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گی۔ پھر بہت کچھ ہوگا۔

میں بھی دادا جان سے پوچھے بغیر نہیں جاسکتے۔ نہ صرف دادا جان سے پوچھنا پڑتا ہے بلکہ لیے کئی ارد گرد دادا جان موجود ہیں۔ جن کا خیال کرنا پڑتا ہے۔  
 ذکر اچي شوق سے چلی جا۔ مگر تیری بد نصیب سہیلی کہیں نہ جاسکے گی۔ تو کراچی جائے گی کا دی میں بیٹھ کر عجیب اور انوکھے راستے اور موڑ دیکھے گی۔ کراچی پہنچ کر سمندر دیکھے گی اور میں نہ دیکھ سکوں گی۔

اے زائدہ! جب تو کراچی جائے گی تو وہاں کی ہواؤں اور سمندروں کو میرا سلام کہنا۔ سمندر میری مال کی گود ہے۔ جس میں سو جانا چاہتی ہوں۔ امن اور سکون سے سو جانا چاہتی ہوں۔ کاش! میں سنہری مچھلی ہوتی اور سارے سمندر میں نیندے نیندے پانیوں میں تیرتی پھرتی!  
 آسیہ! تو خواہ مخواہ اصرار کر رہی ہے۔ مجھے بھلا کس نے جانے دینا ہے۔  
 آسیہ نے بہت کہا۔ مگر توبہ کر دجی جو کہیں دادا جان اجازت دے دیتے۔

پھر آسیہ نے اتنی اجازت لے دی کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر جاسکوں اور شام ہونے سے پہلے پہلے والپس آجاؤں۔ دادا جان نے تاکید کر دی کہ اگر ذرا سا بھی اندھیرا ہو گیا اور تونہ آئی۔ تو پھر میں تجھے اس گھر میں کبھی زندہ نہ رہنے دوں گا۔ بلکہ زہر دے دوں گا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایک لڑکی۔ بلکہ جوان لڑکی رات کو کہیں باہر اپنی سگی ماں کے پاس ہی کیوں نہ رہے یا کسی سہیلی کے پاس رہے! تو پھر وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے پہلے ہی واپس آنا چاہیے۔ میں نے آنے کا وعدہ کر لیا۔ اور چلی گئی۔

راستے میں چلتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پتھر سے سے مٹل کر لیں ہوا میں آگئی ہوں۔

آسیہ نے بازار سے کچھ چیزیں خریدی تھیں۔ پہلے وہ خریدیں اور پھر ہم گھر گئے۔ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکن شروع ہو گیا۔ اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر کسے سامنے کیسے جاؤں گی! کیونکہ بہت دن ہو گئے تھے۔ ادھر گئے آسیہ کے کمرہ کی کچھ دیر بیٹھ۔ آسیہ سامان وغیرہ باندھنے میں مصروف ہو گئی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا اور فریج کھلی۔ مجھ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کھانے لگا۔ یہ تباہ اتنے روز تک تم آئیں گی!

۴۔ اپریل  
 آج آسیہ بہار سے گھر آئی تھی وہ چھٹیاں گزارنے کے لیے اپنے اٹکل کے پاس جا رہی ہے۔ آسیہ میری اتنی سے بار بار کہتی رہی کہ زائدہ کو بھی ساتھ بھیج دو۔ مگر اتنی بھاری اتنی کاماں ہو کر بھی مجھ پر کوئی اختیار نہیں ہے جو اختیار ہے وہ صرف دادا جان کا۔ اتنی کی تو کاماں بھی دادا ہے۔ میری میرے چھوٹے بہن بھائیوں کی۔ اور اپنی محبت کا بھی بھلا کیا اختیار ہے! ....

اچھی سہیلی آسیہ! تو خوش قسمت ہے۔ تو امیر گھرانے میں پڑھے سمجھے گھرانے ہوئی ہے۔ تیری قسمت بہت اچھی ہے۔ تو دنیا میں پھولوں کی طرح زندگی گزارنے کے لیے اور ہم لوگ تو صرف رونے اور جلنے کو یہاں آئے ہیں۔ ہمیں کراچی سے کیا! ہمیں آہی شہر لاہور سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ہمیں تو اس گلی کے باہر بلکہ اس مکان کے باہر بھی کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو اس گھر پر بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور تو کراچی ہے جیسے یہ بھی مکان کی اوپر والی یا نیچے والی منزل پر جانا ہے۔ ہم تو اوپر اور نیچے

کو رکھتی بھی جاؤں۔ اگرچہ ڈر لگا رہتا ہے۔ کہ کہیں کوئی پڑھ نہ لے۔  
ہائے اگر کوئی پڑھ لے تو غضب ہی ہو جائے۔ لیکن نہیں۔ میں تو اسے بڑا چھپا  
کر رکھتی ہوں۔ اور اگر کبھی کوئی ایسا وقت آیا تو انہیں جلا کر رکھ کر دوں گی۔

—

آسیہ چلی گئی ہے۔ اختر نے وعدہ لیا ہے۔ کہ میں کسی نہ کسی بہانے ضرور اس کے  
گھر آیا کروں۔ میں نے اسے کہا۔ کہ اس کی اتنی اور گھر والے کیا کہیں گے۔ کہ آسیہ تو ہے نہیں  
تو اب یہ آن کر کیوں بیٹھی رہتی ہے؟

تو اختر نے کہا۔ کہ وہ پھلا دروازہ کھول کر رکھا کرے گا اور میں چپکے سے آن کر چپکے  
سے چل جایا کروں۔ مجھے یہ بات بڑی خوفناک لگی۔ بڑا ڈر لگا۔ یعنی چوروں کی طرح آؤں۔  
اور چوروں کی طرح جاؤں۔ ہائے اللہ! میں تو ایسا کبھی نہ کر سکوں گی۔ کبھی نہیں اور  
میں نے اختر کو صاف صاف کہہ دیا کہ میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔

مگر اختر نے بتایا کہ ایسا کرنے میں بالکل حرج نہیں ہے اس کے کئی ایسے دوست ہیں  
جنہوں نے اس کو بتایا ہوا ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے ایک اسکا دوست سیم  
ہے جس کو ایک لڑکی شریا سے پیار ہے گھر والے ملنے نہیں دیتے اور وہ یوں ہی چھپ چھپ  
کر اٹالے اس میں بھلا کیا ہرج ہے۔ یہ بات اختر نے مجھے قائل کرنے کو کہی تھی۔ مگر مجھے یہ  
بات سن کر اور بھی خوف لگا اور میں یہ کہہ کر کہ گوشش کروں گی آنے کی چل دی  
میں تو ایسا نہ کر سکوں گی

کیوں نہیں! یہ بھلا کیا بات ہوئی! ہم تو روزانہ یاد کریں۔ اور تم آؤ سی نہ اور اب تو آسیہ جا رہی ہے  
پھر تو تم بالکل ہی نہ آسکو گی۔ اور اگر ایسی ہی بات ہے۔ تو پھر میں تمہیں آج جانے ہی نہیں دلا  
گا۔۔۔۔

اور نہ جانے کے خیال نے میرے سامنے موت کو لا کر کھڑا کر دیا بھلا کبھی ایسا بھی  
سکتا ہے۔ کہ میں گھر نہ جاؤں۔  
میں نے اس سے کہا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں گھر نہ جاؤں۔ اور یہاں رہوں۔  
ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟  
کبھی نہیں ہو سکتا۔

اور اگر میں ایسا کر کے دکھا دوں تو!  
میں سہم گئی۔ خدا کے لیے اختر ایسا نہ کرنا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا  
میرے منہ سے اپنا نام سن کر اختر اس قدر خوش ہوا کہ میرے ہاتھ کو کئی بار چوم لیا  
کہنے لگا پہلے یہ وعدہ کرو کہ تم مجھے اختر نام سے ضرور پکارو گی۔ پھر شادی تک نہیں  
یہاں نہیں رہنے دوں گا۔

اور میں نے وعدہ کر لیا۔۔۔۔ اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ میرا ہاتھ مٹھنڈا ہو گیا تھا  
اختر کی پتہ نہیں یہ کیا عادت ہے کہ وہ میرا ہاتھ ضرور چومتا ہے۔ نہ جانے وہ کیوں ایسا  
۔۔۔۔ مجھے اس کا ہاتھ چومنا اچھا نہیں لگتا۔ میرے خوابوں کا شہزادہ تو ایسا نہیں ہے۔  
جو بار بار ہاتھ چومے۔ میں اختر کو کہوں گی کہ وہ ایسا نہ کرے۔ شادی کے بعد بے شک  
لے۔ ابھی چومنا گناہ ہوتا ہے۔ اور پھر محبت میں بھلا ہاتھ چومنا کیا بڑا۔ محبت تو ایک  
پاکیزہ چیز ہے۔ جس میں صرف دو دل ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اور  
رہتے ہیں۔ اور نہیں کھجا جاتا۔

اتنی آوازیں دے رہی ہیں۔ اب تو مکھنا بھی بہت مشکل ہے۔ دادا جان  
ہیں کہ جب تیرے امتحان ختم ہو گئے ہیں۔ تو اب بیٹھ کے کیا رکھتی ہے۔ ان  
کر یہ ڈاڑھی نکھتی ہوں۔ دل کے اندر یہ خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ میں ان سے

رات گئے دیر تک میں سوچتی رہی۔ موسم بہت اچھا ہو گیا ہوا ہے اور مجھے فزینس آرہی تھی۔ میں بستر پر لیٹی دیر تک اختر کے متعلق سوچتی رہی۔ اختر کچھ عجیب سا لڑکا لگتا ہے نہ جانے کیا ہو گا! اور پھر اس کے دوست کیسے ہیں! وہ کون ثریا ہو گی جو اسے ملنے جاتی ہو گی چلو جو جو کوئی بھی ہے۔ مجھے اس سے کیا۔!

مگر مجھے گھر سے جانے کی اجازت کیسے ملے گی!

مجھے دادا جان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔

نہیں نہیں! میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی اور یہ فیصلہ کر کے سو گئی۔

لیکن میں تو سمجھاتی ہوں مگر ابھی سچی ہے نا۔

مجھے اس کی یہ بات بہت بڑی لگی۔ مگر میں خاموش ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اتنی سے کہا۔ اتنی! اگر آپ نے اسے پھر یہاں آنے دیا تو میں کبھی آپ سے نہیں بولوں گی۔ اتنی کہنے لگی پگلی! اگر وہ یہاں آجائے۔ تو کیا میں اسے نکال دوں۔!

دن گزر رہے ہیں۔ پھوپھی نامراد روزانہ آتی ہے۔ اور اب تو کل سے وہ بانا عذ یہاں آن کر رہے گی۔ جب تک اس کو مکان نہیں ملتا۔ دادا جان کہتے ہیں۔ یہیں آجائے۔ سنا ہے اس کی ایک فتنہ بیٹی اور ایک رنڈوا بیٹا بھی ہے۔ جس کی دو بیویاں مرچکی ہیں میں نے بہتر انداز لگایا ہے۔ میں روٹی اور چینی ہوں اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر وہ یہاں آن کر رہے گی تو میں گھر چھوڑ دوں گی۔ اتنی تو چپ چاپ رو دیتی ہیں۔ مگر دادا کا لیاں دیتا اور لالٹ ہے۔ یا خدا! میں کیا کروں! وہ تو ایک فتنہ عورت ہے اور پھر اس کا بیٹا یا لالٹ ہماری مدد کر!

اس نامراد پھوپھی نے تو کل یہاں تک دادا جان کو کہہ دیا تھا کہ زائدہ کو میری بیٹی بنا لیں۔ میرا بیٹا تو اب لاٹ صاحب کے دفتر میں نوکر ہو گیا ہے۔ سو روپیہ ماہوار کماتا ہے۔

بڑے بڑے گھر والے اپنی بیٹیاں دینے کو تیار ہیں۔ مگر میں تو اپنے ہی خاندان کی بیٹی

پھوپھی کہنے لگی۔ غضب خدا کا۔ کہیں ہم میں ایسا بھی ہوا ہے کہ جوان لڑکی کی شادی نہ کی جائے۔ اور اسے پڑھایا جائے۔ تیری تو مت ماری ہوئی ہے کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا۔ تمہیں تو اس کی ماں میں ہاں نہیں ملانی چاہیے۔ والدہ کہنے

چاہتی ہوں جو میرا چوہا سنبھال لے۔ مجھ سے اس بڑھاپے میں کیا نہیں جاتا۔ اور تو  
تو مان بھی گئے تھے۔

یا خدا! یہ کیا بیٹھ بیٹھ لئے مصیبت آنے والی ہے۔ میری مدد کرنا۔

کہاں میرے خوبصورت سوئٹز لینڈ جا کر زندگی بسر کرنے کے خواب اور کہاں  
زندہ رہنا۔ جو جب سے لاٹ صاحب کے دفتر میں ۱۰۰ روپیہ ماہوار پر نوکری ہوا ہے اور  
اس نے دھوئی کی جگہ پیٹ پہنٹی شروع کر دی ہے۔ اور سر پر تیل لگا کر تھپی مار رہی ہے  
شروع کر دی ہے۔ سبھی رشتہ دار اپنی بیٹیاں اس کے ساتھ بیٹنے کے خواب دیکھنے لگے  
ہیں۔ میرا اور اسکا بھلا کیا ساتھ! ان لوگوں کو کیا معلوم کہ میرا ذہن کیسا ہے! میرا توان  
سے دم گھٹتا ہے جن باتوں سے انکا چہرہ کھلتا ہے۔

ہائے! مجھے ایک تنگ سے مکان میں ایک غلام ماس اور نامراد قسم کے جواری  
خاندان کے ساتھ باورچی خانے کے دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں بیٹھ کر زندگی گزار  
کرنے سے تو موت لاکھ بار مبارک ہو۔

میں تو کبھی یوں پسو کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ میں تو تازہ ہواؤں اور کھلے نچلتاؤں  
پر فی ہوں۔ میں یہاں کیسے آگئی ہوں۔

یا خدا! تو نے مجھے کہاں پیدا کر دیا ہے! اختر نہیں کیا معلوم کہ تمہاری زاہدہ کن مشکو  
میں نہیں پھنسی ہوئی۔ کیا تم بھی مجھے اس مشکل سے نہ نکالو گے۔

اختر! اس تاریک اور سیاہ رات کے اندھیرے میں اگر کوئی جگنہ چمکتا ہے تو وہ  
تم ہی ہو۔ صرف تم د۔

بچو بھی بعد اس زہدوے کے ہمارے گھر آگئی ہے۔ اور نچی منزل اسے دے  
دی گئی ہے۔ آسیہ کا نوکر کل رقعہ لے کر آیا تھا کہ آسیہ کی اتنی تمہیں ملاتی ہے۔ تم ضرور آؤ۔  
جونہی اس کے نوکر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور پوچھا۔ "زاہدہ بی بی ہے؟"

تو بچو بھی اور اس کے زہدوے بیٹے۔ دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ بلکہ خود بھی  
کھڑے ہو گئے۔ کمرہ سے اٹھ کر ڈیوڑھی میں آگئے اور چپ کے پیچھے سے باہر گلی میں  
جھانکنے لگے۔ میں نیچے اتری لیبر بھی ساتھ تھی۔ اس نے نوکر سے رقعہ لے لیا۔ میں نے  
دوسری طرف کھد دیا کہ کل آؤں گی۔ اور اُدھر آگئی۔ دادا جان گھر پر نہیں تھے کچھ دیر کے  
بعد وہ آئے تو نیچے ہی بیٹھ رہے۔ بچو بھی نے دادا جان کو بتایا کہ کسی کا رقعہ آیا تھا اور  
اس نے مسکراتے ہوئے لیا۔ اور اس سے کہا کہ اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ کوئی آؤ جا  
گر میں اوپر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ . . . . . ماں تو اسکی اندھی ہے۔ مگر تو تو یوں عزت نہ بیج  
اگر اس کی اور ہماری دو عزتیں نہیں ہیں۔ تو اس کو کہیں باندھ دے اب۔ ورنہ میری یہ بات  
باد رکھنا کہ اس لڑکی کے رہنے والے پھن نہیں ہیں۔ شام کو اکیلی کوٹھے پر چلی جاتی  
ہے اور تنہا بیٹھتی ہے۔ سوچتی رہتی ہے۔ کام کاج کرتی نہیں۔ مجھے دیکھ کر مزہ دوسری طرف  
کرتی ہے۔ کل میں نے ننھے انجم سے کہا۔ جابا بازار سے مجھے جاکر مرصی لا دے۔ میں نے  
انٹر دوٹی بھیجی تھی۔ اور مرصی کم ہو گئی تھیں۔ میں نے انجم کو آواز دی۔ کہ جاکر بازار سے لا دے  
تو اسے اس نے سکھا دیا کہ جاکر کہہ دے میں کوئی نوکر نہیں۔

میں نے بھی بھائی ایہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے۔ یہ سب ناک کاٹنے والی باتیں ہیں۔

میرا کام تجھے سمجھانا تھا۔ اب سوئچ سمجھ کر جلدی سے یہ کام کر ڈال۔

دادا جان بولے۔ دیکھ مجھے میں اس حرامزادی کا راتوں رات نکاح کر دیتا ہوں۔  
پھوپھی بولی۔ خدا کے لیے ابھی اوپر جا کر کچھ نہ کنا۔ کسی اور بات پر بولنا۔۔۔۔۔ دوز  
یہ ماں بیٹیاں کہیں گی کہ اسے آئے ابھی دودن بھی نہیں ہوئے اور لگی لڑائیاں ڈالتے۔ کیا  
نائدہ!۔۔۔۔۔ تم آرام سے بات کرنا یا کسی اور بات پر سمجھانا۔ اور پھر نیچے کھسک پھر  
آوازیں آتی رہیں۔

میرا تو دل ہل گیا۔ اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا کہ اب تو وہ کچھ ہو گا جو کبھی نہ  
ہوا تھا۔ اور میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ اُمی سمجھاتی رہیں۔ مگر آنسو تھے کہ بھٹنے کا  
نام ہی نہ لے رہے تھے۔

آئی۔

آئی نے آتے ہی دادا جان کو کہا۔  
دادا جان بولے:-

توچ رہ۔۔۔۔۔

کیوں چپ رہوں! کیا میں اس کی ماں نہیں!

تو اندھی ہے۔ ماں ہو یا نہ ہو۔ مجھے اس کا نہیں پتہ۔

اور تیری دو آنکھیں نہیں۔ چھ آنکھیں ہیں۔ آج تو چھ آنکھوں سے ہم کو دیکھ رہا ہے  
دو تیری اور چار تیرے بچے کمرہ میں رہنے والے رشتہ داروں کی۔

خردار! جو تو نے زیادہ بکواس کی۔ تو اس کو خراب کر کے چھوڑے گی۔ تجھے تو کچھ نظر  
ہی نہیں آتا۔

اور دادا جان کتنا زیادہ بڑبڑاتے رہے تھے۔ میں خاموش ایک طرف بیٹھ گئی  
اور جب دادا جان بولتے ہوئے نیچے اتر گئے تو آئی نے آن کو پیار سے کہا۔ مت جا میری  
بیٹی تو داناں۔ تم نے کہہ دینا تھا کہ میرا دادا بڑا سخت قسم کا آدمی ہے۔ وہ نہیں آنے دیتا۔  
اور میں رونے لگ پڑی۔

اچھی اماں! آج مجھے کسی طرح اجازت لے دو۔ آج میں نے ضرور جانا ہے۔ میں  
نے اسے کہلا بھیجا تھا کہ ضرور آؤں گی۔ میری سہیلی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

لیکن بیٹی میں تجھے کیسے بھیجوں!

تیری قسمت ہی ایسی تھی کہ وہ بھی بچے کمرہ میں آن لسی ہے تو کچھ روز تک سہیلی کے  
ہاں جانا بند کر دے۔ یہ کہیں جا لیں تو پھر چلی جانا۔

آئی تو یہ کہہ کر کام میں لگ گئیں۔ اور میں دیوار کے ساتھ منہ لگا کر رونے لگ پڑی۔  
انتہی انتظار کر رہا ہو گا اگر میں نہ گئی تو وہ نہ جانے کیا سمجھے گا! میرا دل کتنا چاہ رہا تھا  
کہ بھاگ کر جاؤں۔۔۔۔۔ ساری دیواریں اور دروازے توڑ کر اس قید خانے سے بھاگ  
جاؤں اور اختر کے چوڑے سینے کے ساتھ لپٹ کر روؤں۔ خوب روؤں۔ اور اسے بتاؤں

آج آسہ کے گھر جانا تھا۔ اختر میرا انتظار کر رہا تھا۔ مگر دادا جان صبح سے ہی  
ٹھٹھک کر گھر بیٹھ گئے تھے۔۔۔۔۔ میں نے منہ ماتھ دھو کر بال کو نہسنے کے  
لیے کنگھی اٹھائی۔ اور آئینہ کے سامنے جا کھڑی۔ دادا جان نے گھور کر دیکھا اور  
کرپاس آگئے۔

کہاں جا رہی ہو؟

میں نے سہم کر ڈرتے ڈرتے کہا۔

دادا جان جی! میری ایک سہیلی کی ماں بہت بیمار ہے۔ کل اس نے اپنا نوکر بھیج

تھا کہ خبر لینے کو ضرور آؤ۔ وہاں جانا ہے۔

دادا جان نے کرٹک کر کہا۔

سہیلی کی ماں بیمار ہے۔ یا تیرا بیمار ہے۔

خدا کے لیے کچھ تو خیال کرو۔ یوں یا بیمار کا لفظ منہ سے کہتے ہوئے تمہیں سن

میں کوئی فکر نہ کروں۔ اس کے ہوتے کوئی مجھے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ چند روز کے اندر ہی ہمارے گھر رشتہ بھجوادے گا اور پھر..... پھر زندگی ان کے لیے ایک ایسا دلنشین خواب بن جائے گی..... جسے کوئی بھی نہ توڑ سکے۔

اس بات نے مجھے کس قدر خوشی بخشی تھی! میں بیان نہیں کر سکتی۔

پھر ہم کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اختر کس قدر اچھا ہے۔

وہ لمحے کس قدر مسانے اور پیار سے تھے جو اختر کے پاس گزرے۔ اختر مجھے کتنا پیارا نہیں

راتا تھا۔ وہ جب پیار سے میری طرف دیکھتا ہے تو میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکتا

ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آج اس نے کئی بار میرے ہونٹوں

پر جو میرے ہاتھوں کو چوما اور ہونٹ چومتے ہوئے اختر نے بتایا تھا کہ وہ مجھے بے حد چاہتا

ہے۔

آج میرے ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی سرخی پھیلی ہوئی ہے۔ آج میرے ہونٹ چمک رہے ہیں۔ کیا اختر بیچ بچ سے پیار کرتا ہے۔

لیکن پیار کو تو جسم سے کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا..... پھر اختر ایسا کیوں کرتا ہے۔ وہ

دعائی پیار کیوں نہیں کرتا۔ جس میں ایک دوسرے کو گلے نہیں لگا جاتا۔ بلکہ صرف ایک

دوسرے کو پیار سے دیکھا جاتا ہے۔ پیار سے سوچا جاتا ہے۔ پتہ نہیں پیار کیا ہوتا ہے!

(کیا پتہ ہونٹ چومنے کا نام ہی پیار ہوتا ہوگا! اختر کو ٹھیک پتہ ہوگا۔ اختر مجھ سے بڑا ہے۔

دریں اختر سے کتنی ہی چھوٹی ہوں۔

اچھا اب اگر میں اختر سے مل تو اس سے پوچھوں گی کہ اختر پیار کیا ہوتا ہے؟ اور پیار

سا ہوتا ہے؟ ضرور پوچھوں گی۔

لیکن یا خدا! میرے پیار کا علم کسی کو نہ ہو۔ یا خدا! میری مدد کرنا۔ ان لوگوں کو اگر پتہ

لگے گا۔ تو یہ لوگ مجھے زندہ جلا دیں گے۔ پھر میں اختر سے کبھی نہ مل سکوں گی۔

پھر اختر میرے بغیر کیسے زندہ رہے گا۔! نہیں نہیں میں کبھی نہیں مروں گی۔ میں اختر کے لیے زندہ رہوں گی۔ میں اختر سے ہمیشہ

کو میرا خالم دادا ہم پر کس قدر غم کرتا ہے!

وہ مجھے تم سے ملنے نہیں دیتا۔ اگر اس کو ہمارا پتہ چل گیا تو وہ ذبح کر ڈالے گا۔

اچھے اختر! پھر کیا ہوگا! پتہ نہیں کیا ہوگا؟

میں کیسے جاؤں؟.....

دوستے دوستے خود ہی چپ ہو گئی۔ اور دادا سی ہو کر اوپر چھت پر آن کر لیٹ گئی۔

دوپہر کو اتنی نے کھانے کے لیے آدائیں دیں۔ مگر میں نے بھلا کیا کھانا تھا! ہمارے

پاس کھانے کو غم جو ہے۔

اتنی نے بہتر اصرار کیا۔ مگر میں نے دوپہر کو روٹی نہ کھائی۔ دو بجے کے قریب دادا جان

کے ایک دو دوڑھے دوست آگئے جو ان کو ساتھ لے کر چل دیئے کہ آج رات غیر دین کے

گھر دعوت ہے۔ ابھی چلو دہاں۔ ذرا میلہ رونق رہے گا۔

اوہ اللہ! تو کس قدر اچھا ہے! تو نے میری دعا سن لی ہے پتہ نہیں میری دعا سنی ہے

یا اختر کی..... کیا وہ بھی میرا انتظار کر رہا ہے!..... جزور کر رہا ہوگا۔

میں ابھی جاؤں گی۔ اور اختر کو سارا کچھ سناؤں گی۔

اور پھر میں جلدی جلدی تیار ہو گئی

اختر کھڑکی کے ساتھ لگا میرا انتظار کر رہا تھا۔ بیڑھیوں پر مجھے کوئی نہ ملا۔ میں سیدھے

اختر کے کمرہ میں چلی گئی۔

وہ اندر بیٹھا تھا۔

پھر اس نے پوچھا کہ میں نے اتنی دیر کیوں لگا لی ہے! میری آنکھیں کیوں سو جی ہوئی

میں!

اور پھر میں نے رو رو کر سارا حال سنایا۔

وہ یہ سارا کچھ سن کر چپ ہو گیا۔ پھر میں نے اختر سے کہا۔

اختر! اب میں نہ آنکھوں کی..... میرا آنا ہمیشہ کے لیے مشکل ہے۔

اختر نے مجھے گلے کے ساتھ لگا لیا۔ میرا سا جسم لرزنے لگا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ



پیارے کروں گی۔ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے سارا کچھ بھول جاتا ہے۔ صرف وہی یاد رہتا ہے۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

کچھ روز کے بعد میری اختر سے شادی ہو جائے گی۔ پھر ہمیں منے سے کوئی نہ روک سکے گا۔ پھر ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ مائے پھر کس قدر اچھا ہوگا! وہ دن کب آئے گا؟ کل سے میں باقاعدہ اٹھ کر نماز پڑھا کروں گی۔ اور خدا سے دعا مانگوں گی کہ میری شادی الگ سے ہو جائے۔ مائے! دادا جان کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ سارے ہمسائے میری قسم پر حیران رہ جائیں گے۔ اتنی جس روز مجھے دلہن بنے نکواب کے کپڑوں میں دیکھے گی تو کس قدر خوش نہ ہوگی۔

میری نسیم بہن اور انجم بھتیجا! دونوں خوشی سے ناچیں گے۔ میں ان دونوں کے بغیر اداس ہو جاؤں گی۔ میں امی کے بغیر بھی اداس ہو جاؤں گی۔

پھر کیا ہوگا؟ .... لیکن ہم یہ مکان ہی چھوڑ دیں گے۔ آج میں نے اختر سے کہا تھا نا .... کہ اختر! شادی کے بعد میں تمہارے ساتھ ملک ملک کی سیہ کروں گی اور ہم ساری دنیا کا چکر لگائیں گے۔ اختر میری یہ بات مان گیا تھا۔ اختر کتنا اچھا ہے اچھے اختر! ہمیشہ اچھا اختر رہنا۔ بڑے اختر کبھی نہ بننا۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔

کل! سارا دن میں بہت خوش رہی تھی۔ اختر سے پرسوں ملی تھی۔ پرسوں کا دن خواب معلوم ہوتا ہے۔ ہرگز نہ ہوا دن خواب کی طرح لگتا ہے۔ مگر آج میں بہت اداس ہوں آج ذرا سی بات پر دادا جان نے نسیم کو اس بڑی طرح مارا کہ دو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔

اے ظالم دادا! تجھے اس معصوم بھول پر ماتھا اٹھاتے ہوئے ذرا رحم نہ آیا۔ میری نسیم بہن! میری جان نسیم بہن! امیرے گلے لگ جا۔ .... یہ ظالم دادا تجھے کبھی نہیں مار سکتا۔ تو مت رو۔ تو مت دکھی ہو۔ آج نسیم نے جب پیار سے یہ کہا تھا کہ باجی! جب آپ کی شادی ہو جائے گی اور آپ یہاں سے چلی جائیں گی تو پھر مجھے کون پیار کرے گا۔ پھر دادا جان بہت مارا کریں گے۔

تو میں نے اسے بہت پیار کیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک تو بڑی نہ ہو جائے گی میں شادی ہی نہ کروں گی۔ اور وہ خوش ہو گئی تھی۔ لیکن اس بچکی کو کیا خبر کہ میری شادی تو بہت جلد ہو جائے گی۔ پھر میں نسیم اور انجم کو بہت اچھے انگریزی اسکول میں داخل کرا دوں گی۔ میں ان کو ہسٹل میں داخل کرا دوں گی۔

مگر نہیں۔ پتہ نہیں کیا ہوگا! آج دادا جان امی سے پھر رشتہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ بھوپھی ادھر آن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

جی چاہتا تھا۔ اس عورت کی دونوں آنکھیں نکال لوں۔ بھلا میرا اور اسکا کیا ساتھ رہے تو جب آگ جلاتی ہے۔ اور چوہا گرم کرتی ہے۔ تو سارا کمرہ دھوئیں سے بھر جاتا ہے۔ بہتر کہتی ہوں کہ کمرہ کے دروازے کھول دے۔ دھواں باہر نکل جائے مگر دروازے نہیں کھولتی۔ اس کا تو دھوئیں میں بھی بیٹھ کر آنکھ سے آنسو نہیں نکالنا اور میرے تو یونہی پہنے لگتے ہیں۔

مائے! میری پیاری ماں! کیا تو اپنی بیٹی کو اس دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرہ میں دم گھٹنے کو چھوڑ دے گی!.....

پیاری اتنی! کیا تو میری شادی اس گندے سے میلے سے آدمی سے کر دے گی جو اپنی مونچھوں پر روزانہ تیل کی مالش کرتا ہے۔ اور لاٹ صاحب کے دفتر میں سارا دن گزار کر جب رات کو گھر آتا ہے۔ اور ماں کے گھٹنے کے ساتھ لگ کر روٹا کھاتا ہے۔ اور روزانہ ماں کو کہتا ہے۔ ماں اب میری شادی کر دے۔ ورنہ میں خود ہی کوئی لے آؤں گا۔ پچھلے دنوں اس نے کچھ روپیہ بھی اکٹھا کر لیا تھا۔ جس کا ایک ریٹا بھی خرید لیا ہے۔ اور اب تو ماں کی خوشی کی حد ہی نہیں۔ کل اماں سے کہہ رہی تھی۔ مائے بہن! ایسے گھر میں کون اپنی بیٹی نہ دے گا۔ جہاں ریٹا یو بھی ہے۔ اور پھر ایک ہی اکٹوتا لڑکا ہے۔ کل کلاں کو گھر کی یہی مالک ہوئی۔ میرا کیا ہے۔ چند روز کی زندگی ہے۔ یہ گھر آگئی۔ تو میری بھی آخرت اچھی ہو جائے گی۔ چین۔ سے دن گزار لوں گی۔ اور سنو بہن! اب مکان کو اسے پر کیا لینا!.....

اب تو کچھ روز تک بیٹا مکان خود ہی خرید لے گا۔ چاچی عائشہ کی لگی میں ایک مکان خالی ہوا ہے۔ اس کی بات چیت ہو رہی ہے۔ بچی ہو گئی۔ تو انشا اللہ یہ مکان لے لیں گے۔

اور میری اماں ہوں ماں کرتی رہی۔ وہ تو یہاں باسکل میری شادی نہیں کرنا چاہتیں۔

مگر دادا جان کو کون منائے۔

ساتر سے ملے کئی روز ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اختر سے کبھی نہیں ملی تھی۔ کبھی نہیں ملی تھی۔ کبھی نہیں۔ میری سہیلی سعیدہ آج آگئی۔ کہ چلو قدسیہ کے ہاں جا کر اپنا نتیجہ معلوم کرتے ہیں کہ پاس ہو گئے ہیں یا فیل کیونکہ اس کا بھائی یونیورسٹی میں ہے۔ اور ہم نے رول نمبر اسے دیئے ہوئے تھے۔ آج ۶۔ مئی ہے۔ دس مئی کو ہمارا نتیجہ شائع ہو جائے گا۔ آج ہے بہ روز کے بعد۔

دادا جان گھر پر نہیں تھے۔ اتنی کو کہہ کر میں سعیدہ کے ساتھ قدسیہ کے ہاں گئی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ کہ خدا جانے یہ کیا خبر نائے گی۔ اس نے آتے ہی مبارک باد کا اور مجھے دوسری دوسری مبارک باد دی کیونکہ میرے ۵۶ نمبر آئے تھے۔ اور میں کلاس میں فرسٹ آئی تھی اور مجھے وظیفہ بھی ملا تھا۔

مائے اللہ! یہ خبر اتنی اچھی تھی کہ مجھے یوں لگتا تھا۔ جیسے میری جھولی میں چاند ٹوٹ کر آن کر رہا ہے۔ آئیہ فیل ہو گئی تھی۔ جہاں ایک خبر نے مجھے خوشی پہنچائی تھی۔ دال دوسری خبر نے مجھے اداس کر دیا۔ ....

اب میں اختر کو جا کر سب سے پہلے یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی۔ مگر..... یہ خیال کہ وہ آئیہ کاسن کو اداس ہو گا۔ مجھے اداس کر رہا تھا۔

بہر حال..... میں بغیر کوئی فیصلہ کئے سیدھے اس کے گھر کی طرف بڑھتی گئی۔ راستے میں سوچتی گئی کہ آئیہ کے فیل ہونے کا کس طرح افسوس کر دوں گی۔ مجھے افسوس کرنا نہیں آتا تھا۔

ایک دفعہ میری ایک پیاری سہیلی شکیلا مر گئی تھی۔ حالانکہ وہ میری بے حد عزیز

پہن کر لیں۔ پھر تو تمہارے دادا جان کو پڑھانے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔  
 تمہیں نے کہا۔ اختر تمہاری اتنی کیسے مانیں گی!

مگر اختر نے کہا۔ تم اسکا کوئی خیال نہ کرو۔ اس کے بعد میں دو تین گھنٹے اختر کے پاس رہی۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا رہا۔ کبھی میری آنکھوں کی تعریف کرتا اور کبھی میرے لمبے بالوں کی۔ کبھی میرے بھولے بھالے چہرہ کی۔ اور کبھی میری سادی طبیعت کی۔

آج پاس ہونے کی خوشی میں اس نے مجھے بہت پیار کیا۔ واپسی پر گھر آتے ہوئے میں نے اسے پھر کہا۔ اختر! داخلے تو کل شروع ہو رہے ہیں۔ دس روز تک رہیں گے تم دس دنوں تک بات پتی کر لینا۔ ورنہ بہت بری بات ہوگی۔

اور اختر نے ہکا وعدہ کر لیا۔ اور پھر میں آگئی۔

بہت دیر ہوگئی تھی۔ شام ہوگئی تھی۔ مگر آج مجھے کوئی ڈر نہیں لگتا تھا۔ آج میں نے پاس ہونے کی خوش خبری گھر میں سنائی تھی آج بے شک دیر ہو جاتی۔ گھر آتے ہی اتنی کو یہ خبر سنائی۔ دادا جان کو بتایا۔ دادا جان کا غصہ سے تنا ہوا چہرہ خوشی کے لطیف جذبات میں بدل گیا۔ اور انہوں نے زندگی میں پہلی بار مجھے بہت پیار کیا۔ ان کے پیار کرنے سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور میں رونے لگ پڑی۔

دادا جان حیران ہو گئے کہ خوشی کے موقع پر یہ آنسو کیسے؟

اے دادا! تجھے کیا خبر! تیرے اتنا سا پیار کرنے سے میرا دل کیا نہیں ہو گیا۔ میرے ذہن میں تو تیرا تصور ایک ظالم دادا سے زیادہ نہیں تھا۔ کہ آج تو نے بھول کر پیار لیسے دیا!

بھوپھی اور اس کے لڑکے کو بھی پتہ چلا۔ . . . . بھوپھی بولی کسی کو کچھ دے دلا کر اہل ہوگئی ہوگی۔ . . . . آتی جاتی تو رہتی ہے۔ رقتے بازی بھی ہوتی رہتی ہے۔

اس کی اس بات نے میرا دل جلا کر رکھ کر دیا۔ آج اتنی بھی بہت خوش تھیں رات گئے جب سب سو گئے۔

پہلی تھی۔ مگر چونکہ مجھے افسوس کرنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے میں ان کے گھر ہی نہ گئی سناں کا آخری دفعہ منہ دیکھا۔ بلکہ گھر ہی میں روتی رہی۔

آسیہ کا گھر آگیا۔ سیدھی اختر کے کمرہ کی طرف بڑھی۔ دروازہ بند تھا۔ تالا لگا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا۔ کہ اتنی مشکل سے آئی تھی۔ نہ جانے اب آنا کب ہو۔ تو کیا کروں! . . . . . ابھی میں کھڑی یہی سوچ رہی تھی۔ کہ اختر آگیا۔

مجھے دیکھ کر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں آگئی ہوں۔ پھر ہم اندر جا کر بیٹھ گئے۔ اور پھر میں نے اسے اپنے پاس ہونے کا بتایا اور آسیہ کا بھی بتایا۔ آسیہ کے خیال ہونے کا سن کر اس نے ذرا سا بھی منہ نہ بنایا۔ بلکہ کہنے لگا پھر کیا ہوا؟ اگلے سال پاس ہو جائے گی اور میرے نمبروں کا سن کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ کہنے لگا بتاؤ کیا تحفہ لوگا! میں نے کہا کچھ نہیں لوں گی۔ کچھ نہیں۔ اس نے بہت اصرار کیا تو میں نے کہا اپنی تصویر دے دینا اور اس نے مجھے ایک بہت پیاری تصویر دے دی۔ مگر یہ پوچھا دکھو گی کہاں! میں نے کہا کہ اپنے کپڑوں کے صندوق میں۔

اور وہ ہنس پڑا۔

پھر وہ کہنے لگا کہ اب تو تم کالج نہیں داخل ہوگی۔

مگر یہ سن کر بہت اداس ہو گئی۔ بھلا میں کہاں کالج میں داخل ہو سکتی ہوں! یہ تو خیل میں بھی ممکن نہیں۔ . . . . میں نے اسے بتایا کہ دادا جان مجھے کسی قیمت پر بھی کالج میں داخل نہیں کرنا چاہتے۔ اب تو وہ میری شادی کر رہے ہیں۔ اور پھر میں نے اسے لڑکے کا بھی بتا دیا۔

اختر یہ سن کر چپ ہو گیا۔ . . . . اور تھوڑی دیر کے بعد پھر خود ہی بولا کہ میں آج نا اتنی سے بات کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کم از کم بی اے ضرور کرو۔ اس کے بعد شادی کریں گے۔ ہم منگنی اب کر لیں گے اور شادی چار سال کے بعد۔ میں آج رات اتنی سے بات کروں گا۔ تاکہ وہ پیغام لے کر تمہارے کالج میں داخل سے پہلے پہلے منگنی کہت

مگر نہ جانے ایسے مخوس خیال کیوں میرے دل میں آنے لگ جاتے ہیں۔ تو بہ! بھلا اختر کی بات اس کی اتنی کبھی ٹال سکتی ہیں! کبھی نہیں۔

اور یہی سوچتی ہوئی مجھے نیند سی آنے لگی۔۔۔۔۔ اس وقت رات کے ۹ بج چکے تھے دو کہیں ریڈیو پر فرماشی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ ریکارڈ بیچ رہا تھا۔

آئی۔ آئی شام سہانی۔۔۔۔۔

سن رہے خوشی کی کہانی سن رہے خوشی کی کہانی

بڑی ہی پیاری ہوا چل رہی تھی۔۔۔۔۔ موسم بڑا سہانا تھا۔۔۔۔۔ اس موسم میں سکھ اور سکون کی نیند آنکھوں میں لے کر خاموشی سے سو گئی۔۔۔۔۔ کیونکہ سونے کے بعد میں نے بڑے پیارے پیارے خواب دیکھے تھے۔

چھ روز ہو گئے ہیں۔ مگر اختر نے ابھی تک اپنی والدہ کو نہیں بھیجا۔ نہ جانے کیا بات ہو گئی ہے! کیا آسیہ کے خیال ہونے کا اسے صدمہ ہوا ہے!۔۔۔۔۔ کیا اس کی اتنی پیار ہو گئی ہے! نہ جانے کیا بات ہوئی ہے! اختر نے بھیجے کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اختر جھوٹ نہیں بول سکتا۔

پھر کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا!

اچھا کل دادا جان کام پر جائیں گے۔ تو جا کر پتہ لوں گی۔ کیونکہ ایک دور دراز تک تو پھر دانستے بند ہو جائیں گے۔

نیلے آسمان کی ناروں سے بھری ہوئی چھت کے نیچے جب ہم سب لوگ لیٹا اور صرف میں اور اتنی جاگتی رہ گئیں۔ تو اتنی نے کہا:

بیٹی! اب میں چاہتی ہوں کہ میرے جیتے جی تیری شادی ہو جائے۔۔۔۔۔

تم نے میرا حال دیکھا ہے۔ دن بدن موت کے قریب ہوتی جا رہی ہوں اور پھر رشتہ دار بھی طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے۔ ہمارے خاندان میں کوئی پڑھا لکھا شخص تو ہے نہیں تو زیادہ پڑھ لکھی ہے تو شادی کے لئے مشکل ہو جائے گی۔ ہم غریب لوگ ہیں اور پھر ہمارے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں ہے کہ تجھے آگے پڑھا سکیں۔

میں نے کہا۔ اتنی! مجھے تو ۲۵ روپے ماہوار وظیفہ بھی ملے گا۔ فیس کی اب کوئی فکر نہیں وہ محاف ہو جائے گی۔ اور ۲۵ روپے ہر مہینے مفت ملا کریں گے۔

اچھی ماں! میں نے ابھی شادی نہیں کرنی۔ میں جب تک کوئی اچھا لڑکا نہ ہو گا شادی نہیں کروں گی۔

اتنی کہنے لگی۔ اس بچہ بھی کے لڑکے سے تو تیری شادی نہیں ہونے دوں گی! خالہ زینب کا لڑکا جو بینک میں نوکر ہے۔ میٹرک پاس ہے اور دو سو روپیہ تنخواہ لیتا ہے! بڑا نیک لڑکا ہے۔ میں چاہتی ہوں وہاں تیری شادی کر دوں۔ شادی کے بعد تم بیک آگے پڑھ لینا۔

میں نے کہا۔ اچھا اتنی! شادی کر لوں گی۔ مگر یہاں نہیں۔ میں اپنی مرضی آٹھ روز کے بعد بتاؤں گی۔

اور اتنی مطمئن ہو کر سو گئیں۔

میں اندر ہی اندر سنہتی رہی۔ بھلا میں اتنی کو خود ہی کیسے بتا دیتی

اتنی کو پتہ چل جائے گا۔ کل یا برسوں تک آسیہ کی اتنی عز داریں گے۔

کہیں وہ ہمارا غریب سا گھر دیکھ کر برا نہ منے۔۔۔۔۔ اگر کہیں ایسا ہو گیا تو۔

موسم کس قدر بُرا آگیا ہے! اگر میوں کا موسم مجھے بہت زہر لگتا ہے۔۔۔۔۔  
 بہت دکھ دیتا ہے۔ ہمارے پاس نہ بجلی کا پنکھا ہے۔ نہ خنک ٹیٹیاں۔  
 یا خدا! یہ گرمیوں کا موسم کیسے بیٹے گا؟ کانچ گرمیوں کی پھیٹوں کے لیے بند ہو  
 چکا ہے۔ دادا جان کی کس قدر منتیں نہیں کیں۔ گردہ نہ مانے۔۔۔۔۔ دادا جان  
 بھی نہ مائیں گے۔

کانچ اب ستمبر میں کھلے گا۔  
 ہائے! مجھے پڑھنے کا کس قدر شوق ہے۔ تو پھر کیا کروں گی۔ لیکن نہیں  
 میں مزدور داخل ہوں گی۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ ضرور داخل ہوں گی۔  
 اختر! تم کہاں چلے گئے ہو تمہارے کچھ بتایا بھی نہیں۔ اور پھلے گئے ہو۔  
 کتنا اچھا ہو۔ جو میں کل گھر میں داخل ہوں اور تم آجاؤ۔  
 کیا تم مجھے کل ملو گے نا!۔۔۔۔۔ اچھا لوگ کہتے ہیں کہ سچے دل ضرور ملتے ہیں۔  
 میں دیکھوں گی تم مجھے ملتے ہو یا نہیں۔

آج میں آسیہ کے ماں گئی۔ پتہ ملا کہ اختر آسیہ کو لینے کراچی گیا ہوا ہے۔ یہ سن کر  
 میری جان میں جان آگئی۔ اور میں خوش ہو گئی۔  
 اس کی امی کہتی ہوگی۔ میں اکیلے کیسے جاؤں! آسیہ کو لے آؤ اکٹھے جائیں گے۔ ایک دو  
 روز تک اختر ضرور آجائے گا۔  
 میں لیٹ فیس دے کر کانچ میں داخل ہو جاؤں گی۔ پھر میں گھر آگئی۔ اور مطمئن ہو گئی

داخلہ بند ہو چکے ہیں مگر اختر ابھی تک نہیں آیا۔ اسے کئے ۲۰ روز ہو گئے ہیں  
 اختر کیوں نہیں آیا؟  
 اختر کہیں بیمار تو نہیں ہو گیا؟  
 اچھے خدا! اختر کو بہت جلد واپس لے آ۔  
 یا خدا! میری دعا سن لے۔۔۔۔۔

اختر ابھی تک نہیں آیا۔ چار روز اور بیت گئے ہیں۔ کل میں ضرور اس۔  
 گھر جا کر پتہ کروں گی۔۔۔۔۔

پھر میں نے بیٹھ کر شام تک سیمہ اور انجم کی قیضیں تیار کیں۔ میں اپنے خیالوں میں اور قیضوں کے سینے میں اس قدر محو ہوئی کہ مجھے شام ہونے کا پتہ ہی نہ چلا۔  
دو دنوں کے لیے ساتھ کی ہمسائی سے مشین مانگی ہوئی ہے۔ کل اور پر سوں دونوں دن بیٹھ کر سارے کپڑے تیار کرنے میں گرمیوں میں موٹے کپڑے نہیں پہنے جاتے۔

پندرہ روز گزر گئے ہیں آسیہ کے ہاں نہیں گئی۔ حالانکہ اختر نے ہر ہفتے آنے کو کہا ہوا تھا۔ میرا دل کتنا ملگن اور اداس ہے۔ دادا جان ستمبر کے مہینے میں میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔  
نہ جانے کیا ہونے والا ہے! کیا اختر کو اس چیز کا خیال نہیں ہے میں اختر کو ساری بات بتا چکی ہیں۔ اب بار بار کیا بتاؤں! .....  
اچھا کل آخری بار اسے جا کر ضرور کہوں گی۔ کہ ستمبر میں میری شادی ہو رہی ہے۔

آج میں اختر کے ہاں گئی گئی تو وہ سامان باندھنے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میرا دل دکھ سا گیا..... میں چند منٹ کھڑی رہی اور پھر واپس آنے لگی تو اس نے آواز دے کر بٹھرا لیا۔  
کنے لگا۔ میں تم سے خفا ہوں۔ تم اتنے روز کیوں نہیں آئیں؟ میں تمہیں روزانہ یاد کرتا تھا۔ روز تمہارا انتظار کرتا تھا۔ مگر تم کس قدر غلام اور بے وفا ہو۔ میں نے کہا۔ غلام اور بے وفائیں ہوں یا آپ!  
کیوں میں کیسے ہوں! میں اگر تمہارے گھر آسکتا تو تم دیکھتیں۔  
کہ روزانہ آتا۔ بلکہ وہیں رہتا۔  
اچھا۔

آج میں آسیہ کے ہاں گئی۔ تو اختر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میرا جی چاہتا تھا۔ بھلا کر اس سے لپٹ جاؤں۔ اور پھر رو رو کر کہوں۔ کہ تم کہاں چلے گئے تھے اختر.....  
اختر اتنے روز کہاں رہے ہو..... تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا..... جاؤ..... میں تم سے نہیں بولتی..... مگر میں خاموش رہی۔  
اختر نے مجھے دیکھتے ہی معذرت پیش کرنی شروع کر دی کہ آسیہ کی تارا لگئی تھی۔ کہ وہ گر پڑی تھی۔ میں فوراً لگا اسے ہسپتال داخل کرایا اور اب کہیں جا کر وہ کچھ ٹھیک ہوئی ہے میں نے بہت فکر کا اظہار کیا۔ آسیہ کا ایڈریس لے لیا۔ تاکہ اسے خط لکھوں مگر اختر نے کہا کہ خط میں چوٹ وغیرہ کا بالکل ذکر نہ کرنا۔ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں تمہیں نہ بتاؤں۔ کیونکہ تم فکر کر دو گی۔

میں حیران ہو گئی۔ آسیہ نے یہ بات کس جذبے کے تحت کی ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔  
اس کے بعد اختر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ سفر کی باتیں۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ پھر یاد کرتا رہا مگر شادی اور کالج کی کوئی بات اس سننے نہ کی..... میں نے بھی بات کرنی مناسب سمجھی اور آگئی۔ میرا دل بہت اداس اور پریشان تھا۔  
اختر نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ہفتے میں ایک روز اسے ضرور ملنے آؤں.....  
پھر وہ مجھے بہت سی باتیں بتائے گا۔  
گھر آن کر میں نے اتنی کو آسیہ کا بتایا کہ وہ گر پڑی ہے اتنی نے بھی بہت افسوس کا اظہار اتنی بازار سے کپڑا خرید کر لائی تھی۔

ہاں۔ تو کیا تئیں شک ہے!۔  
نہیں۔ بالکل نہیں۔ آپ نے روزانہ آنے کو ٹھیک ہی تو کہا ہے۔

اچھا آئیہ کا حال بتائیں۔ وہ کیسی ہے!  
اب تو بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔

اور یہ سامان کیا باندھا جا رہا ہے؟ کہاں بھاگنے کا ارادہ ہے!

بھاگنا کہاں ہے؟ کوہ مری جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ یہاں گرمی میں نہیں رہا جاتا۔  
ستبر میں واپس آنے کا ارادہ ہے۔ چلو گی تم بھی ساتھ!

میرا دل بھرا آیا تھا۔۔۔ اور میں بول نہ سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں میچ کر لیں۔ اور غاروں  
سے زمین کو تکتے لگی۔

تو لو کیا چلو گی میرے ساتھ؟

نہیں۔  
کیوں؟

میری مرضی!

کیا مجھ سے خفا ہو؟

لڑائی کب ہوئی تھی؟

نظر تو ایسا ہی آتا ہے۔

نظر تو ویسا ہی آ سکتا ہے۔

یہ آج تئیں ہو گیا ہے؟

مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔

پھر آخر اسٹھ کو میرے پاس آ گیا۔ اور ہاتھ سے میرا چہرہ پکڑ کر ادھر کرنے لگا:  
نے کہا۔

مجھے نہ ہاتھ لگانا۔

آخر نے ہنس کر کہا۔ کیوں؟ یہ کیا ہو گیا؟

مجھے ہاتھ لگانا اچھا نہیں۔۔۔۔۔  
سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ کہ تم اب اچھے نہیں لگتے اب کوئی اور اچھا لگتا  
ہوگا۔

میں تڑپ اٹھی۔ اور کہا۔ ایسی بات پھر کبھی نہ کہنا۔

یہ کوئی اتنی بری بات نہیں ہے۔

تمہارے لیے بالکل معمولی بات ہوگی۔ مگر میرے لیے یہ برائی کی آخری بات ہے  
بھئی کمال ہے۔ تم بھی حد کرتی ہو۔ مذاق کی بات کو اتنا (SERIOUS) لے لیتی

ہو۔

مذاق کا بھی کوئی وقت ہونا چاہیے۔

وقت تم بتا دو۔۔۔۔۔ میں نے تو یوں ہی بات کر دی تھی۔

اچھا تو میں جلتی ہوں۔

ابھی نہیں جاسکتیں۔

کیوں؟

بس۔ میری مرضی!

تم کون ہو؟

میں تمہارا آخر ہوں۔

تم میرے کچھ بھی نہیں لگتے۔

لیکن پہلے تو کچھ لگتا تھا۔

میں کچھ نہیں جانتی۔

مگر زاہدہ! تمہارا مزاج کیوں خراب ہو گیا ہے۔ بتاؤ نا۔ تئیں کیا ہوا ہے؟

میں چند لمحے خاموش رہی۔ اور جب اس نے دوبارہ میرا چہرہ پکڑ کر ادھر کیا۔ تو میرا منہ

چونے لگا تو میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اور دیوار کے ساتھ منہ لگا کر سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ اور پھر اتنے آنسو بہے کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ اختر بہتر چپ کر آ رہا۔ مگر میرے آنسو تھکنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔

پھر اختر نے مجھے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔ اور پوچھا بتاؤ۔ کیوں رو رہی ہو؟ مجھے کچھ نہیں ہوا اختر۔

تو تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہو۔

بلکہ یہ کہنا چاہیے۔ کہ اختر اب تم مجھے بے وقوف نہ بنا سکو گے۔ تم اچھا بھلا جانتے ہو اور پھر یہ کہتے ہو۔

بھئی زاہدہ! دیکھو۔ سیدھی سیدھی بات کر دو۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔

کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں؟ نہیں بتاؤں گی۔

اچھا نہ بتاؤ۔ میں جانتا ہوں۔ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔

تم غلط جانتے ہو۔ میں پیار نہیں کرتی۔

اچھا تو کیوں کہہ لو کہ اختر تمہیں پیار کرتا ہے۔

ہاں اختر مجھے پیار کرتا ہے اور میں زاہدہ اختر کو پیار نہیں کرتی۔ اور اختر اس قدر پیار کرتا ہے کہ اس کے پیار سے میری آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ میں نا۔

تو کیا تمہیں شک ہے! اچھا لو۔ آؤ سارا عقدہ تھوک دو۔ بھلا جانے سے پہلے مجھ سے کیوں خفا ہوتی ہو۔ کیا پتہ میں ہی مر جاؤں۔ اور واپس ہی نہ آؤں۔ پھر!..... پھر تو تم بہت خوش ہو گئی۔

ہاں..... خوش کیوں نہیں ہونا اختر!..... تمہاری یہ دکھی کر دینے والی باتیں کبھی فراموش نہیں کروں گی۔

تو کیا تم کو میرے مرنے کا افسوس ہو گا۔

وہی تم نہیں جانتے کہ مجھے افسوس ہو گا! تیس کا ہے کا افسوس ہو گا؟

اچھا نہیں ہو گا۔ نہیں ہو گا۔ اس بات کا تمہیں بہت جلد یقین آ گیا ہو گا۔ میں نا۔ بس اس طرح بہت بحث ہوتی رہی۔ پھر میں خاموش ہو گئی۔ میں نے اسے ایک بار لایا کہ تم نے تو ہمارے گھر پیغام بھیجنا تھا اور یہ کہ میری شادی ستمبر میں ہو رہی ہے۔

رہ ستمبر میں کوہ مری بیٹھے ہو گے۔ پھر میں نے کہا۔

اختر! کیا تم میری شادی پر آؤ گے!

تمہاری شادی پر نہیں آنا۔ تو اور کس کی شادی پر آنا ہے۔

اچھا!

کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟

ستمبر کے آخر میں۔

کاغذ میں داخل نہیں ہو گی؟

نہیں دادا جان بالکل اجازت نہیں دیتے۔ وہ تو ایک جگہ بات کچی کر رہے ہیں۔

تو تم نے انہیں منع کیا ہوتا۔

میری بات بھلا کون سنتا ہے؟

اختر کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

میں نے اتنی سے بات کرنی تھی۔ مگر ان دنوں اتنی کاموڈ ٹھیک نہیں ہے تم فکر نہ کرو ستمبر میں ان کو سارا کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ پھر میں اتنی کو منالوں گا۔

میں خاموش رہی۔

پھر اختر کتنی ہی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا کبھی کانے لگ جاتا۔ کبھی بڑبڑاتی کہتی کرتا۔ کبھی مجھے پیار کرتا۔ بس یونہی وقت گزر گیا۔

پھر اختر نے خدا حافظ کہا۔ اور کہا کہ اچھا ہوا۔ جو تم آج آگئیں ورنہ میں نے دو تین ہینڈل کے بعد ملنا تھا۔



اور پھر میں آگئی۔ میں سارا رستہ روتی رہی۔ نہ جانے کیوں اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی میری آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑا۔۔۔۔۔ اور پھر آنسوؤں کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے میں نے گھر کے قریب پہنچ کر آنسو خشک کیے۔ گھر میں داخل ہوئی تو ڈیڑھ گھنٹہ کے پاس ہی پھو پھی کھڑی تھی۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں اُدھر آگئی اور چپکے سے کوٹھے کی چھت پر جا کر لیٹ گئی اتنی نے پوچھا۔ کیا ہوا تجھے !

میں نے آواز کو درست کر کے بڑی چپک کر کہا۔ جیسے بہت خوش ہوں۔ ہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں ہوا۔ اور میں خاموشی سے دیوار سے ٹیک لگا کر جلیاں ہیر بیٹھ گئی۔ اور سامنے خلاء کو گھورنے لگی۔ آج میرا دل کس قدر ویران تھا! یہ میں بتا نہیں سکتی۔ میری زندگی کے چن میں بہار آنے سے پہلے ہی رخصت ہو گئی۔ میری دل کا پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔ مجھے اپنے چاروں طرف دیرانی ہی دیرانی نظر آتا کیا ہو گیا؟

وہ کیسی صبح ہوئی تھی جس کی اتنی جلدی شام بھی ہو گئی !

وہ روشن دن کدھر گیا؟

کیا ہونا تھا۔ اور کیا ہو گیا؟

اختر نے تو کوئی بھی پرواہ نہیں کی۔ اختر نے تو وہ جوش و خروش دکھایا ہی نہیں کا اس نے شروع میں یقین دلا یا تھا۔

اب کیا ہوگا؟

اختر جا رہا ہے۔

کل وہ کوہ مری پہنچ جائے گا خوبصورت اور مرد بہاڑوں پر وہ کل کی رات کے چین سے سوئے گا۔۔۔۔۔ مگر مجھے کیسے نیند آئے گی !

میں اختر کو جانے سے کیسے روکوں !

میں نے تو اسے ایک بار بھی نہ روکا۔۔۔۔۔ شاید وہ رک جاتا۔۔۔۔۔ لیکن شاید وہ نہ ہی رکتا۔ لیکن میں اسے ایک بار تو کہہ لیتی۔ شاید وہ نہ ہی جاتا۔

اختر! امت جاؤ۔۔۔۔۔ میں یہاں تین مہینے کیسے گزاروں گی اگر جانا ہی ہے تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ اختر! میں کیسے زندگی کے دن گزاروں گی۔ اور پھر میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ شام ہوئی گئی۔

اندھیرے کا سورج ہر چیز کو لے کر ڈوب گیا۔

میں بالکل بے حس و حرکت اور لیٹی رہی۔

پھر اتنی نے بہت آوازیں دیں۔ تو اٹھ کر بیٹھے آئی۔۔۔۔۔ اپنا چہرہ چھپاتی رہی اپنا دکھ چھپاتی رہی۔ کس کو سناتی؟ یہ دکھ کس نے دیا نہیں۔ خود ہی مول لیا۔ اس دکھ کو کیسے بتاؤ؟ اس دکھ کا کیا نام تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی۔ روشنی کی طرف سے مپھ کر کے اندھیرے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔

ہنسی مذاق کی باتوں پر بے تحاشا ہنستی رہی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آنسو بھی پونچھتی جاتی تھی۔

آج میں ان لوگوں کے درمیان بے اس دل اور ویران چہرہ بیٹھ چکی تھی۔ میرا دل دکھ گیا تھا۔ مگر کسی کو علم نہیں۔

سامنے دادا جان بیٹھے اپنے کاغذوں کو دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے الماری کھولا ہوا ہے اور چہرے کے ساتھ کاغذوں کو لگائے پڑھ رہے ہیں۔

نیمہ نل سے پانی لا کر حمام کو بھر رہی ہے۔ انجم بازار سے کچھ خریدنے گیا ہوا ہے والدہ اوردی خانے میں بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہیں۔

میری امی کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔

ان کا رنگ کتنا زرد ہوتا جا رہا ہے۔

پتہ نہیں ان کو کیا ہو گیا ہے! آبا کے مرنے کے بعد سے تو ان کی حالت دن بدن

گھر دن تک بھی جا پہنچے۔ اور پھر باقاعدہ ایک لڑائی شروع ہو گئی۔  
ایک کچے تجھے بات کرتے بھی شرم نہیں ہوتی۔ تیری بیٹی کو نسی کنواری بیابھی گئی  
ہرام کا لڑکا پیدا کر کے ہی سسرال پہنچی تھی۔ پھر بھی تو گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتی  
دوسرے تیری منور بھی ایک نہیں کئی حرام کے بچے پیدا کرے گی۔ روز دہ یار سے ملنے جاتی  
ابھی طرح تیری ناک کاٹے گی۔

یا خدا!..... ایسی ایسی فحش باتیں کر رہی تھیں کہ سنی نہیں جا رہی تھیں۔  
اور مال یہ سن کر منور کو پیٹ رہی تھی۔ کہ نامراد! نہ تو پیدا ہوتی نہ تیرے یار کا طعنہ  
ہوتا۔

یہاں تو روزانہ ہی کچھ ہوتا ہے۔ روز جھگڑے ہوتے ہیں۔ چختی ہیں۔ چلاتی ہیں۔  
ت کو خاندان اور بیٹے گھر آتے ہیں تو روز رو کر ان کو سنا تی ہیں..... پھر اس نے جس جس  
ڈانٹا ہوتا ہے۔ ڈانٹا ہے۔ اور رات گئے تک بڑبڑا ہوتی رہتی ہے۔ صبح کو پھر وہی  
سلسلہ بنتا ہے۔

میں ایسی باتیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہتی ہوں کہ یہ دنیا میں کا ہے کے لیے آئی ہیں  
انہیں آنے کا ان کا مقصد کیا ہے۔

یا خدا! تو مجھے اس ماحول سے کب نکالے گا۔ میرے لیے یہ ماحول اتنا اجنبی کیوں  
ہے۔ کب تک اجنبی رہے گا۔!!

آج میں اختر کو خط لکھوں گی۔ مگر پوسٹ کیسے کر دوں گی۔!!  
اچھا کل انجم کے ساتھ بازار چلوں گی۔ تو راستے میں پوسٹ کر دوں گی۔ خدا کو رے یہ  
خط اختر کو مل جائے۔ ایڈریس تو اُس نے ٹھیک ہی دیا ہو گا۔

آج کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر خط لکھوں گی۔ سب سے چھپ کر۔ اور جو  
لیں دادا جان کو پتہ چل جائے۔ تو گھر کو آگ ہی لگا دیں گے۔

میں اختر کو بتاؤں گی کہ میں اسے کتنا زیادہ یاد نہیں کرتی میں اس کے بغیر زندہ نہیں  
رہ سکتی اور اسے کہوں گی کہ تم جلدی جلدی آ جاؤ۔

انتہر ہوتی جا رہی ہے.....  
ڈاکٹر نے کام کرنے کو باسکل منہ کیا ہوا ہے۔ مگر پھر بھی کرتی ہیں۔  
میری اتھی! میں کل سے تمہیں کوئی کام نہ کرنے دوں گی۔ میں سارا کام خود کر دوں گی۔  
میری اتھی! تم نہیں جانتیں..... مگر تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری زاہدہ اس دن  
کتنی آزر دہ بیٹھی ہے۔

لیکن کیا پتہ۔ اختر ستمبر میں کوشش کر ہی دے۔ آتی دفعہ اس نے مجھے کٹنا  
سنائی نہیں دی تھی۔ میں ہی پاگل ہوں جو یوں سوچتی ہوں۔ میں تو خواہ مخواہ رونے لگا  
پڑی تھی۔ اب نہیں روؤں گی۔ اوستمبر کا انتہائی صبر اور جوصلے سے انتظار کر دوں گی  
دادا جان شادی کی بات پکی کر ہی گئے۔ تو میں اسے کسی نہ کسی طرح ٹال دوں  
اچھے خدا! تم میری مدد کرنا۔ ضرور کرنا۔

دن گزر رہے ہیں۔ صبح ہوتی ہے اور شام ہو جاتی ہے۔ رات ہوتی۔  
اور پھر صبح ہو جاتی ہے۔ کئی روز گزر گئے ہیں۔ اختر کو پچیس روز ہو گئے ہیں۔ اس  
مجھے کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ مگر وہ مکھ بھی کیسے سکنا تھا!..... ہمارے گھر میں تو  
نہیں سکنا۔ اگر کوئی ڈاکا میرے نام کا خط لے کر آجائے۔ چاہے وہ میرا کسی  
ہی کیوں نہ لکھا ہو۔ تو میری تو شامت ہی آجائے..... دادا جان یہ کیسی پنا  
کرتے کہ میں کسی سہیلی سے ملوں۔ یا خط دکن ثابت کر دوں۔ اور پھر ہمسائے بھی تو  
کی باتیں کرتے ہیں۔

ہمارے گھروں میں کیسی بری عادتیں ہیں۔ لیکن ان کو کیسے دور کر دوں.....  
تو دور دوڑ تک جاہل لوگ رہتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑتے ہیں۔ کل شمیم  
اور شمیم کی دادی میں بہو اور ساس میں جھگڑا شروع ہوا۔ تو اس جھگڑے کے

اختر کو تین خط ڈال چکی ہوں۔ آج اختر کو گئے دو مہینے ہو گئے ہیں۔  
۱۵ ستمبر تک اس نے آنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ ۲۰ روز باقی رہ گئے ہیں۔  
یا خدا! یہ بھی جلدی گزر جائیں تو اچھا ہے۔ اختر نے تصویر دینے کا وعدہ  
کیا تھا۔ وہ بھی نہیں دی۔ اچھا دن گزر رہی جائیں گے کسی نہ کسی طرح۔

کئی روز سے ڈائری نہیں لکھ سکی۔ بہت بخار آتا رہا۔۔۔۔۔ رات کو  
مری بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ آسمان سے ساری رات شبنم گرتی رہتی  
ہے۔ اور میں معمولی سی چادر اوڑھ کر سوتی رہتی ہوں۔ جس سے سردی لگ  
رہنا ہو گیا ہے۔

اختر ابھی تک کوہ مری سے نہیں آیا۔۔۔۔۔  
اکتوبر کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ خدا جلنے اب وہ واپس بھی آئے گا یا  
نہیں۔

دادا جان نے کالج داخل نہیں ہونے دیا۔۔۔۔۔ سارا سارا وقت روتی رہتی  
ہوں۔ زندگی میں کیا دلچسپی رہ گئی ہے۔ لیکن دلچسپی پیدا ہی کب ہوئی تھی؟ دلچسپی کے بغیر  
زندگی نہیں گزر سکتی۔ ہماری زندگی تو ایک دیران اور کالی رات ہے جس میں چند لمحے کو جلو  
لگائے تھے۔ اور خدا جانے رات کو اسی تاریکی میں وہ کہاں کھو گئے ہیں۔ کن  
ماحول کی سمت اڑ گئے ہیں؟

میری ساری سہیلیاں کالج میں داخل ہو گئی ہیں۔ زندگی ان کے لیے ایک ایسا پھول  
ہے۔ جسے بہار اپنے دامن میں پر دان چڑھا رہی ہے۔ مگر میرے لیے زندگی ایک  
بالا بارغ ہے۔ ہر درخت پتوں سے خالی ہے۔۔۔۔۔ شاید کبھی یہاں بھی  
برآمدے!

اختر کو میں چھ خط لکھ کر ڈال چکی ہوں۔ لیکن یہ نہیں بتہ کہ اسے ملتے ہی  
میں۔ یا نہیں۔ اب یہ تو اس کے آنے پر پتہ چلے گا۔ اس نے آنے میں اب کوا  
سے دن رہ گئے ہیں۔ صرف چار دن باقی رہ گئے ہیں۔

نہ جانے اختر اب کیا ہو گا؟۔۔۔۔۔ ضرور موٹا ہو گیا ہو گا؟  
ہم تو اس مٹری گرمی میں کس مشکل سے دن گزارتے رہے ہیں۔ اس دن  
برسات بھی نہیں ہوئی۔ گرمیوں کا یہ موسم کتنا برا موسم ہے۔ کل رات کس قدر  
آئی تھی۔ دنیا میں سب سے زیادہ اگر مجھے کوئی چیز بری لگتی ہے۔ تو وہ سرد  
آندھی ہی ہے۔ آندھی چل رہی ہو تو کو کھٹوں پر سے چیزیں اتارتے ہوئے لوگ  
بھوت لگتے ہیں۔ آندھی ہر چیز کو خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے۔ کہتے ہیں جس چیز  
انسان کو نفرت ہو۔ اکثر وہی چیز اس کا مقدر بن جاتی ہے۔۔۔۔۔

آندھی سے مجھے نفرت ہے۔  
کہیں میری زندگی میں بھی کوئی ایسی آندھی نہ چل جائے۔ جو میری زندگی میں  
آرزوؤں اور میری جوانی کو خاک میں ملا کر رکھ دے!  
یا خدا! ایسا کبھی نہ کرنا۔ کبھی نہ کرنا۔

اتنی ان کو کہنا..... یہاں پھر کبھی نہ آئیں۔ اور اتنی ہنس دیں کہ پگی! تو تو یوں ہی مذاق کیا کرتی ہے! تو پڑھ لکھ گئی ہے۔ مگر ان کو تو کبھی اسکول میں نہیں پڑھایا گیا نا..... یہ بچاری سیدھی

سادھی ہیں۔

تو اتنی! ان سیدھی سادھیوں کو پھر سیدھے سادھے گھر میں جانا چاہیے۔ اتنے میں دادا جان آگئے اور میں خاموش ہو گئی۔

آج وہ لوگ شادی کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آئے تھے۔ وہی لوگ جہاں دادا جان شادی کرنا چاہتے ہیں۔ دادا جان نے کہا ہے میں ایک ماہ کے بعد تہاڑی گا کہ میں زاہرہ کی شادی کروں گا..... یا نہیں..... ان عورتوں نے مجھے بھی دیکھا۔ ان کا خیال ہو گا شاید میں شرمائل گی..... مسکراؤں گی اور گھونگھٹ نکال لوں گی۔

لیکن میں خاموش۔ اداس اور زرد چہرہ لیے ان کے سامنے چپ چاپ بیٹھ رہی..... میں ان کو کیا کہتی!!

کتنی موٹی۔ بے ڈھنگی عورتیں آئیں تھیں!..... ایک نے اگر کس کو چٹاکی پر مٹی تو دوسری نے یوں جوڑا کیا ہوا تھا۔ جیسے کیلوں سے ٹنگا ہوتا ہے۔ سروں پر بے تحاشا لگایا ہوا تھا..... ایک نے گلابی شلوار۔ فیروزی قمیض اور کبیری دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ دہانے موٹا رنگ کا سوٹ اور سرخ رنگ کا دوپٹہ۔

واہ! واہ! کیا پیچ کیا ہوا تھا! سبحان اللہ..... جن کو رنگوں کا سیٹ نہیں۔ ان دماغ میں تو گھاس بھی نہیں کیا بھرا ہو گا.....

کیا میں ان لوگوں کے درمیان رہ سکتی ہوں!..... نہیں نہیں کبھی نہیں ہو سکتا! کیا نہیں ہو سکتا۔ میں زہر کھا لوں گی۔ خودکشی کروں گی۔ مگر یہ شادی نہ کروں گی۔

ان کے جانے کے بعد میں نے اتنی سے کہا..... اتنی! یہ کس جڑی گھر جانور آئے تھے!!..... کس میلے میں گھومنے گئے تھے۔

آج کا دن میری زندگی میں خوب صورت ترین دن طلوع ہوا تھا آج کی صبح کتنی حسین تھی! آج کی صبح نے اس اہتمام سے آسمان کے مشرقی کناروں سے اپنا چہرہ ادھر اٹھایا کہ یوں لگتا تھا جیسے ایک نہیں دو سورج طلوع ہوئے ہیں۔ آج اختر کوہ مری سے واپس آگیا تھا۔ اور اتنے ہی اس نے کہلا بھیجا تھا کہ جس طرح بھی ہو تم ابھی ملنے آؤ۔ میں تمہارے بغیر بہت اداس ہوں۔ آج میں کتنی خوش تھی!.....

میرے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔ کاش! آج کا دن ہمیشہ میری زندگی پر چھایا رہتا۔ آج کے دن کی شام کبھی نہ ہوتی۔ آج کا دن اتنی جلدی کیوں غروب ہو گیا! مائے! جب آج میں اختر سے ملی۔ تو میرے لیے وہ لمحہ کس قدر سہانا..... کس لافانی! اور کس انمول لمحہ نہ تھا۔

اسے زندگی کے حسین ترین لمحے! تو کب سے میری انتظار میں بیٹھا تھا!..... کیا تو مجھے

بار بار نہیں ملے گا؟

اختر کس قدر موٹا اور سرخ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ ٹپک ہو گئی ہیں۔۔۔۔۔ جب وہ میری طرف پیار سے دیکھتا ہے تو میری دنیا ڈولنے لگتی ہے مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہنے لگا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم اتنی کمزور اور زردی نظر آ رہی ہو۔ میں نے یہ سن کر رونا شروع کر دیا۔ میں اسے کیا کہتی!!۔۔۔۔۔

میں اسے کیا بتاتی۔۔۔۔۔ کہ تیری جدائی نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ یہ صرف تیری ہی جدائی ہوگی۔ جو مجھے موت سے ہم آغوش کرے گی۔ اور تیرا ہی ملاپ ہوگا۔ جو مجھے زندہ بچائے گا۔

پھر میں اور اختر صحبت دیر باتیں کرتے رہے اختر اپنی سیر کے واقعات سناتا رہا۔۔۔۔۔ کہنے لگا۔ وہاں مال روڈ پر شام کو اس قدر رونق ہوتی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس دفعہ کوہ مری اتنی خوبصورت خوبصورت لڑکیوں سے بھری ہوئی تھی۔ کہیں بتا نہیں سکتا۔

اس کی یہ بات سن کر نہ جانے کیوں میرا دل اداس ہو گیا۔۔۔۔۔ اختر کو کسی اور لڑکی کا ذکر کرنے یا اسے خوبصورت کہنے کا کیا حق حاصل ہے بلکہ میں خاموش رہی۔

پھر وہ کہنے لگی۔ ایک لڑکی زمرینہ روزانہ مجھے وہاں مال روڈ پر سیر کرتی مل جاتی تھی ادا پھر وہ مجھ سے باتیں بھی کرنے لگی۔ ہمارے گھر بھی آنے جانے لگی۔

مگر میں نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی۔ میں تو صرف تمہیں یاد کرتا رہا۔ صرف تمہیں کا اگر تم بھی یہاں ہوتیں۔ میرے ساتھ پہاڑ پر آئی ہوتیں۔ تو ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سیر کرتے۔ پھر کتنا مزہ آتا۔

اور میرا دل جو زمرینہ کی بات سن کر بھردھارتا تھا۔ پھر سے چمک اٹھا۔ اور میں بہت خوش ہو گئی۔ اختر یہ مجھے پورا یقین ہو گیا۔۔۔۔۔ پورا پورا یقین۔ کہ وہ مجھ سے انتہا چاہتا ہے۔

میں نے اختر سے کہا۔ اگر تم چاہتے۔ تو تم مجھے ساتھ لے جاسکتے تھے۔

وہ کیسے زاہدہ؟

کیا تم نہیں سمجھتے؟

اچھا تو پھر سہی!

اچھا۔ تو پھر اگلے سال سہی۔ یہی ترکیب پھر بھی چل سکتی ہے۔ پھر میں نے بھی اختر کو اپنی باتیں بتائیں۔ کہ اس کے بغیر میری زندگی کے دن کیسے گزرے۔ اسے بتاتے وقت بڑی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اختر کہنے لگا۔

تم بالکل بچہ ہو۔ ذرہ ذرہ سی بات پر رونے لگ جاتی ہو!

پھر اختر نے پوچھا۔ کالج داخل ہو گئی ہو؟

میں نے کہا۔ بالکل نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ اور نہ ہو سکتی ہوں۔ دادا جان تو اگلے ماہ میری شادی کر رہے ہیں۔

اختر نے بڑے آنسوؤں کا انبار کیا۔ مگر وعدہ کیا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور مدد کرے گا۔ اس نے بتایا کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور یہ کہ اس نے مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ اس کے سینے کے ساتھ لگتے ہی میں نے آنکھیں بند کر دیں اور مجھے یوں لگا جیسے میں جادو کی مدد سے جنت میں داخل ہو گئی ہوں۔ اس کے

پوڑے سینے پر سر رکھ کر میں زندگی بھر تک سوئی رہنا چاہتی تھی۔ اس کے گریبان کے پاس سے بہت اعلیٰ سینٹ کی خوشبو آرہی تھی۔ پھر اختر مجھے بہت پیار کرتا رہا۔۔۔۔۔

لیکن بار بار ایک خیال آتا تھا کہ جہاں جدائی نے مجھے اداس اور زرد کر دیا تھا وہاں اختر کو جدائی نے کتنا سرخ اور موٹا کر دیا تھا۔

کیا اختر کو جدائی اس آگئی تھی؟۔۔۔۔۔ مگر نہیں نہیں۔۔۔۔۔

مجھے ایسے شک اور دہم کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے۔ یہ دہم اور

شک محبت کو قتل کر دیتے ہیں۔

میں نے شروع دن سے ہی اس کی بات پر یقین کر لیا تھا اور ہمیشہ اس کی باتوں پر ایمان لاؤں گی۔ وہ کبھی جھوٹا آخر ثابت نہیں ہوگا۔  
گھر آتے ہی دادا جان سے جھڑکیاں پڑیں مگر آج ان کی جھڑکیوں کی کون پر دا بکرتا تھا۔

ایک ماہ گزر گیا ہے۔ دادا جان نے میری دہاں بات پکی کر دی ہے۔ اور کہا ہے کہ شادی بھی جلدی کر دیں گے۔  
ہائے! میں کیا کروں گی۔ میں نے تین روز سے روٹی بھی نہیں کھائی۔ بھوک بڑا آں شروع کی ہوئی ہے۔ رورو کر پاگل ہو رہی ہوں مگر میری بات کوئی نہیں مانتا۔ اچھی ماوش ہیں۔ اسی کو کیا پتہ کہ یہ شادی نہیں بلکہ اس کی بیٹی کی موت ہوگی۔ دادا جان بھی نہیں مانتے ہیں۔

وہ تو بالکل ہی پاگل ہو گئے ہیں۔ کیا انہوں نے اپنی شادی کرنی ہے۔ یا خدا میری مدد کرنا۔ میں تو نہ راتوں کو سو سکی ہوں نہ کچھ کھا رہا ہے۔  
ہائے! میں کیا کروں گی!

آخر تو کبھی کچھ خیال نہیں ہے!

میں ایک دو روز تک آخر کو جا کر غرور کہوں گی۔ ضرور کہوں گی کہ کیا وہ میرے ساتھ فریب تو نہیں کر رہا! میرے دل میں شک آرہا ہے۔  
لیکن نہیں جب تک اس کو دیکھ نہ لوں گی۔ شک کو پاس نہ آنے دوں گی۔ میں اس سے آخری بات پوچھ کر آؤں گی۔

ہائے! مجھے بار بار شادی کا کتنے ہونے شرم بھی آتی ہے مگر آخر کو کوئی خیال نہیں ہے۔ اچھا۔ میں اب بالکل آخری دفعہ آخر سے کہوں گی۔ کہ اگر اب اس نے اپنی کوشش نہ کی تو پھر میں اس سے ملنے کبھی نہ سکوں گی۔

آج میری پرانی سہیلی نجمہ نے مجھے خط لکھا۔ نجمہ کتنی مہربان اور اچھی لڑکی ہے! اور خط کے ساتھ اس نے مجھے ایک جوڑا بھی بھیجا ہے۔ میں لینا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس نے کتنے پیار اور اصرار سے بھیجا تھا!.....  
جوڑا کتنا پیارا ہے! اچھی کہتی ہے۔ چیز کے لیے رہنے دو۔ مگر میں تو لے پہن لوں گی۔

میں اسے پہن کر آخر کے پاس جاؤں گی۔۔۔۔۔ آسیدہ کراچی سے آئی ہی نہیں، بلکہ دہاں سے کوئٹہ چلی گئی تھی۔ اور اب وہ سکول بھی نہیں آئے گی۔ لیکن مجھے اب سکول سے کیا۔

لیکن آج دادا جان سے کہوں گی۔ رات رورو کر ان کو مناؤں گی کہ مجھے کالج میں داخل کرادیں۔ آخر نے تو کوئی بھی نہیں کہلا بھیجا۔  
وہ بچا رکھے بھی کیسے؟ دادا جان تو ایک پل میں عزت اتار کر رکھ دیتے ہیں پھر کیا ہوا۔ اگر آخر نے وعدہ کرنے کے باوجود کسی کو نہیں بھیجا میں اس سے اس بات پر کبھی خفا نہیں ہوں گی۔ آخر جو کچھ بھی ہے اچھا ہے یا بُرا۔ اب تو میرے دل کی خوشی میری زندگی کا خون اور میرے سر کا تاج ہے۔ اگر وہ مجھ سے پیار کرتا ہے تو پھر میرے لیے یہ سارا کچھ ہے۔ اور وہ یقیناً مجھ سے پیار کرتا ہے۔

کیا اختر کے گھر والوں میں سے کسی نے بتایا ہے! لیکن اور کون بتا سکتا ہے! اور تو کسی کو علم نہیں! مجھے جس بات کا ڈر تھا۔ وہ ہو گیا ہے۔  
اب کیا ہو گیا۔

اختر! کیا تمہارے گھر والے اس قدر بے رحم اور ظالم ہیں! میں نے اٹھایا بگاڑا تھا!.....  
اختر! میں نے تو تم سے بھی کچھ نہیں چاہا تھا..... تم سے صرف محبت ہی کی تھی نا.....  
اس ایک سال کے عرصہ میں صرف تم سے محبت ہی کی ہے نا..... اور تو تم سے کچھ نہیں چاہا۔ میں نے تم سے کچھ لیا تو نہیں نا..... بلکہ دینا ہی چاہا ہے نا..... پھر ایسا کیوں ہو گیا؟

کیا تم نہیں جانتے تھے کہ ہم لڑکیاں..... ہم جیسے ماحول کی لڑکیاں..... کسی سے یوں محبت نہیں کر سکتیں۔ وہ اگر کسی لڑکے سے محبت کرتی ہیں تو اس کو اپنا خاندان سمجھ کر کرتی ہیں ہم محبت کہیں اور شادی کہیں اور نہیں کر سکتیں۔  
نہ ہم محض دوستی رکھ سکتی ہیں..... پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں کہیں اور شادی کر لوں۔

میرا تو اب کسی اور شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔

اختر! لو نا! میں کیا کر دوں گی! میں تمہیں کیسے بھلا دوں۔

تمہیں بھلنا میرے اختیار سے باہر ہے۔

میں اب تو تمہیں مل بھی نہیں سکتی۔ ورنہ میں تمہیں سارا کچھ بتاتی۔ کاش! میری مہربانی پہیلیاں بھر رہی ہوتی۔ تو میں اسے سارا کچھ بتاتی۔ مگر وہ اتنی دور سیلون بیٹھی ہے۔  
اب کیا ہو گا! سوخ سوخ کر میرا تو سر بھٹنے لگا ہے۔

پھر میری زندگی کے سارے گیت ختم ہو جائیں گے۔ ہر آواز خاموش ہو جائے گی۔  
میرے آسمان پر سے ہر ستارہ ٹوٹ کر کہیں گم ہو جائے گا۔  
اور سارا آسمان تاریک ہو جائے گا۔ میری دینا اندھیری ہو جائے گی۔ نہ کوئی نور چمکے گا..... اور نہ کوئی چاند مسکرائے گا۔  
میں اسے سارا کچھ بتا دوں گی..... ضرور بتا دوں گی۔

آہ! ابھی اس بہار کا پہلا پھول بھی نہیں کھلا تھا۔ اور ابھی کسی بیل نے بھی ٹہنیوں بیٹھ کر کوئی بھی رسیلا گیت نہیں گایا تھا۔ کہ خزاں کی زرد آندھی چھا گئی۔  
کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ یہ کیا ہو گیا ہے! میرے کسی دشمن نے میری شکایت لگا دی ہے؟

آہ! دادا جان اور امی کو کسی نے آن کر میری اور اختر کی دوستی کی تمام باتیں بتا دی! اور میں نے جو خط اختر کو لکھے تھے۔ اس کا بھی بتا دیا ہے! آہ! ایسا میرا کون دشمن تھا نے اس کا کیا بگاڑا تھا:-

امی نے مجھے کچھ نہیں کہا ہے۔ بالکل کچھ نہیں۔ مگر ان کے آنسو نہیں تھتے۔  
ان کو بہتر یقین دلاتی ہوں۔ کہ امی! یہ سارا کچھ جھوٹ ہے۔ بالکل جھوٹ ہے۔  
اور انہوں نے مان بھی لیا ہے کہ یہ سارا کچھ جھوٹ ہی ہو گا۔ مگر وہ میری قسمت رہی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ رو رہی ہیں۔

اور دادا جان نے تو مجھے اتنا مارا ہے اور گالیاں دی ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ نہ دور دراز گھر میں کچھ پکا ہے۔ دادا جان کہتے ہیں۔ اس کی ڈولی یا خاندان گھر سے نکال کر ہی اب یہاں گرم کر دوں گا..... میرے خدا! یہ کیا ہو گیا ہے! مگر یہ بتایا کس نے ہے۔

میں اختر کے سوا کسی سے شادی نہیں کر سکتی! لیکن اگر میری شادی اختر سے نہیں ہو سکتی۔ تو پھر میں کسی سے بھی نہیں کروں گی۔  
پھر میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گی۔ لیکن یا خدا! اس دادا جان کو تو ہی سمجھا  
میں کس کے آگے فریاد کروں!!

کل سے بارش ہو رہی ہے۔ سردیوں کی ٹھنڈی اور تیز بارش!۔  
دادا جان کو گجرات جانا تھا۔ مگر نہیں گئے۔ اب بارش تھمے گی تو  
پھر جائیں گے۔ ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہی ہوں۔  
یوں لگتا ہے..... جیسے یونہی جلتے جلتے مرجاؤں گی۔ بس ایک  
بار اختر سے ملنے اور دل کر ساری باتیں کرنے کی حسرت ہے۔ وہ  
پوری ہوئے تو پھر مرجاؤں گی۔ مجھ کو زندہ رہ کر کیا کرنا ہے!

دات دادا جان گجرات چلے گئے ہیں۔ آج میں اختر سے ملنے گئی۔ ان کے گھر  
میں کافی چہل پہل نظر آتی تھی۔ جہان وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ میں نے واپس آنے کا ارادہ  
کر لیا۔ مگر پھر سوچا کہ شاید پھر نہ آسکوں آج ہی بات کر کے جاؤں۔  
اختر کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا میں اندر جا کر بیٹھ گئی اور کمرہ کو دیکھنے لگی۔ مجھے پھلے  
ماتے دل یاد آ گئے۔ اور سارے دنوں کے ساتھ ہی آنکھوں میں بے شمار آنسو آ گئے  
اتنے آنسو جو بے بغیر نہ رہ سکے۔ میرا دل بھر آیا۔ اور میں نے سسکیاں بھر بھر کر رونا شروع  
رہا۔

پھر ایک دم خیال آیا کہ اگر کوئی اور آگیا۔ تو! اور میں نے جلدی سے اپنے آپ  
بجھالنا شروع کر دیا کہ کچھ بھی تو نہیں ہوگا کہ میں خواہ مخواہ پاگل ہو رہی ہوں۔  
اتنے میں اختر آگیا..... مجھے دیکھ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا.....

زندگی دکھوں اور غموں سے بھری ہوئی ایک ایسی طویل اور سیاہ رات نظر آتی  
ہے۔ جس کی صبح قیامت تک بھی ہوتی نظر نہیں آتی.....  
اس زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرتا۔ جو خوشی کا ہو..... بے وفا اختر! دو ماہ  
ہو گئے ہیں اس سے ملے ہوئے۔ مگر اس نے بھول کر بھی خبر نہیں لی..... مجھے کبھی خیال  
نہیں آیا تھا کہ اختر ایسا بھی بے وفا ہو سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کی باتوں پر یقین کیا تھا  
وہ جھوٹا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن کیا پتہ۔ یہ اس ہی کی شرارت نہ ہو۔  
وہ تو کتنا تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں..... پھر وہ شرارت کیسے کر  
سکتا تھا!.....

کل شام دادا جان گجرات جا رہے ہیں..... ان کے جانے کے بعد میں  
بار خود بھی اختر سے ملوں گی۔ ضرور ملوں گی۔  
پھر اس کے بعد جو ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا ناکہ میں خود  
کر لوں گی..... میں نیلا تھوٹا تھا کھالوں گی..... اور مرجاؤں گی۔ مجھ کو بھلا نہ  
رہ کر کیا کرنا ہے!

لیکن میری بہن اور میرے بھائی اور میری ماں کا کیا بنے گا! میری ماں تو یہ  
کبھی نہ سہم سکے گی۔ 'زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ چند ماہ تک میری شادی ہو جائے گی۔'  
بلے! میں شادی کیسے کر سکتی ہوں! مجھے ان لوگوں سے نفرت ہے جہاں یہ میری شادی  
کرنا چاہتے ہیں۔



یہ اپنے دل سے پوچھو۔ یا ان لوگوں سے پوچھو۔ جنہوں نے میرے گھر میں چنگیاں لگائی تھیں۔ اختر!..... تم مجھے یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا مگر تمہیں ایسا رویہ کبھی اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

تم نے میرا جینا اجیرن کر دیا ہے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تمہارے کارن ہمارے گھر میں جو کچھ ہوا ہے۔ وہ تمہیں میں کبھی نہ بتا سکوں گی۔ نہ تمہیں اس کا احساس ہو سکتا ہے ہماری زندگی تو پہلے ہی دکھوں سے بھری ہوئی تھی اختر! پھر تم لوگوں نے ایسا ظلم کیوں کیا اختر!

مگر اختر نے قسم کھالی۔ کہ اسے اس واقعے کا کچھ علم نہیں ہے نہ اس کے گھر والے ایسے ہو سکتے ہیں۔

لیکن میرے دل کو یقین نہ آیا۔ بھلا ان لوگوں کے سوا اور کسی کو کیا علم تھا۔ لیکن میں چپ ہو گئی۔

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اختر نے بتایا کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ اور واقعی محبت کرتا ہے۔ لیکن شادی کرنا اس کے متعلق وہ اب کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس نے گھر میں بہت زور بکایا تھا۔ مگر اس کی امی کسی طرح نہیں مان رہی۔ وہ اپنی بھتیجی شبنم کے ساتھ میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔

اختر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔.....

موت کا سنا سنا چھا گیا.....

مجھے اختر کے اس جواب کی ہرگز ہرگز توقع نہ تھی۔ میرا دل اتنی شدت سے دھڑکا۔ جیسے ابھی تک جاگ رہا تھا۔

پھر کچھ دیر تک میں دماغ بیٹھی رہی۔ اور پھر اٹھ کر آنے لگی۔ اختر نے واسطے سے اسے کہہ دیا کہ خدا کے لیے حوصلے اور صبر سے کام لینا۔ اور ملنے ضرور آیا کرنا۔ میں مجبور ہو گیا ہوں۔ وعدہ کرو ملنے آؤ گی۔

دیکھو..... غم نہ کھانا۔

اس کے لپٹنے کی دیر تھی۔ کہ آنسوؤں کا سیلاب سارے بند توڑ کر منہ نکلا..... اور پھر میں اس قدر روئی کہ اس کی قبض گیریاں کے پاس سے تر ہو گئی۔ اور وہ خاموش رہا۔ باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تو وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور میں بھی درست ہو کر بیٹھ گئی۔ آنسوؤں سے بھسکا ہوا چہرہ میں نے رومال سے خشک کر لیا۔ منہ پر لی طرف کر لیا۔ لیکن کوئی بھی ادھر نہ آیا۔ بلکہ سیدھا اوپر چڑھ گیا۔ اختر نے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔ اور پھر پاس کی کرسی پر آن بیٹھا۔

زاہدہ! کیا مجھ سے خفا ہو۔

میں خاموش رہی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں بات کیسے شروع کروں۔

میں پھر بھی خاموش رہی۔

کیا مجھ سے بولو گی نہیں۔

میں پھر بھی چپ رہی۔

پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا۔

زاہدہ! زاہدہ! کچھ تو بات کر دنا۔ دیکھو تم نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے۔

میں چپ تھی۔

زاہدہ! تمہیں میری جان کی قسم! کچھ تو بات کرو۔

مگر مجھ سے بات ہی نہیں ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے مجھ سے قوت گواہی

ہی چھین لی ہے۔ ہونٹ کھولنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

(پھر وہ اٹھ کر میرے پاس آ گیا اور میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے)

میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اور کہا:-

تمہیں اب کوئی حق حاصل نہیں۔ کہ تم مجھے یوں پیار کرو۔

کیوں؟

... میری سہیلیاں ہنسی خوشی کاٹ جاتی ہوں گی۔ اختر بھی بہت خوش خوش زندگی گزار رہا ہوگا۔ اس کو مجھ سے کیا؟

اس نے تو محض کھیل کھیلنا تھا۔

کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔۔۔۔۔ اگر زندگی تباہ ہوئی ہے تو صرف میری۔۔۔۔۔

مال جانتی ہے کہ مجھے کوئی روگ اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ اور اس خیال سے ہاں جان بھی کھل رہی ہے۔ مگر وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ دادا جان میری شادی کرنا چاہتے۔ وہ لوگ میری عیادت کو آئے تھے۔

نیچے چھو بھی نے نہ جانے ان کو کیا سکھایا ہے۔ کہ وہ منہ پھلا کر یہاں بیٹھی ہیں۔ پھر چلی گئیں۔ اللہ کرے اب کبھی نہ آئیں۔

سمجھ میں نہیں آتا۔ زندگی کیسے بسر ہوگی؟ کیا ہوگا؟

نسیم میرا کس قدر خیال رکھتی ہے! بچاری ننھے ننھے ہاتھوں سے میرا سر دھو رہی ہے۔ کتنی ہے۔ باجی! آپ کب اچھی ہوں گی! آپ کو ایسا بڑا چمکے لے آلیگا کہ آپ ساری سیڑھیاں ہی گر پڑیں۔۔۔۔۔

میری بہن نسیم! میری چھوٹی ننی گڑیا! ہتھیں کیا پستہ۔۔۔۔۔ میں کہاں سے گری ہوں؟

تو تو صرف سیڑھیوں پر سے کہہ رہی ہے۔ میں تو اپنی زندگی کی بلند ترین چوٹیوں سے گری ہوں۔ اور ایسی گری ہوں کہ اب کبھی نہ اٹھ سکوں گی۔۔۔۔۔ یہ سیڑھیوں پر چڑھنا تو چند روز کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر میرے دل پر جو چوٹ آ رہی ہے اور جو زخم لگ گیا ہے۔ وہ دن بدن پھیلتے گا۔ ناسور بنے گا۔ اس کو کبھی آرام نہ آئے گا۔ یہ زخم کبھی مندمل نہ ہوگا۔ یہ تو میری زندگی کی بنیاد کو ہلا کر رکھ دے گا۔

یہ مجھے قبر میں اتار کر دم لے گا۔ یہ نہ جانے اور کس کس کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ تو ابھی مصوم ہے۔

خدا کو اسی طرح منظور تھا۔ مجھ سے اس کے کچھ نہ سنا گیا۔۔۔۔۔ مجھے اپنے چاروں طرف آنکھیں چلتی نظر آئیں۔ اور میں نہ جانے کس مشکل سے دایمیں چل کر گھر آئی۔ اور پھر سیڑھیوں میں ہی پکڑ کھا کر جو گری تو بعد کی ہوش نہ رہی۔

آج کئی روز کے بعد ہوش آئی ہے۔ سارا جسم درد سے چور چور ہو گیا ہے۔ سیڑھیوں پر جب گری تھی۔ تو نیچے پانی کا گھڑا پڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ جاکر ٹکرائی۔۔۔۔۔ ہاتھ اور آنکھ کے قریب سے جگہ پھٹ گئی۔ کانوں سے خون بہنے لگا۔ بازو کے قریب شدید چوٹیں آئیں۔ بہت برا حال ہوا۔

امی سارا وقت روتی رہتی ہیں۔۔۔۔۔ سوچنے اور سمجھنے کی ہر قوت جیسے جواب دے گئی ہے۔

کئی روز کے بعد آج بستر سے نیچے اُتری۔ آئینہ میں چہرہ دیکھا۔ تو ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ آج میں نے اپنا بستر اور پردھوپ میں لگوایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر چلنے پر بیٹھ گئی۔

آسمان گہرا نیلا ہو رہا تھا۔ اور بڑی ہی پیاری اور سنہری دھوپ چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ دن بڑا ہی روشن تھا۔

یہ سماں دیکھ کر نہ جانے کیا خیال جی میں آیا کہ سارا جسم لہر اٹھا۔ اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ آنسو یوں نامعلوم آواز میں گرتے رہے کہ پونچھنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔۔۔۔۔

ایک دم دل میں خیال آگیا۔۔۔۔۔ کہتے کیا تھی؟ میں نے کہاں سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اور میں کہاں آگئی ہوں!

کبھی میں بھی معصوم تھی۔ تم جیسی ایک چھوٹی سی پیاری لڑکی تھی.....  
مگر اب!.....  
اب تو نہیں جان سکتی..... نہ خدا کرے تو کبھی جانے!  
پھوپھی کے لڑکے نے آج چھٹی لی ہوئی ہے۔ ریڈیو لگا کر کمرہ میں بیٹھا ہوا ہے۔  
ریڈیو پر ریکارڈ لگا ہوا ہے۔

دل آہ بھر ایسی۔ کہ میری جان جلا دے  
خورشید گار ہی ہے۔  
اے میرے دل! تو بھی ایسی آہ بھر۔ کہ میری جان جلا کر رکھ کر دے!

زندگی کا کوئی مقصد سامنے نہیں رہا۔ اور بلا مقصد زندگی بسر کرنا کس قدر  
اور کٹھن کام ہے۔

سارا سارا دن اوپر چھت پر دھوپ میں لیٹی رہتی ہوں۔ چہرے کا رنگ سیا  
مائل ہو رہا ہے۔ کبھی آسمان تو نکلتی رہتی ہوں اور کبھی دیوار سے اکھڑی ہوئی پستر کو گھورتی رہتی  
کاش! میں کالج داخل ہو جاتی..... تو میرا جی کس قدر نہ لگ جاتا.....  
لگ جاتا..... ہیلیوں میں اور پڑھائی میں محو ہو کر میں اختر کے سنجے ہوئے علم کو کبھی  
مگر اب کیا کروں! سارا وقت صرف اسی کا خیال دل میں سمایا رہتا ہے۔ اور مجھے دلتا  
ہے۔

اختر نے مجھے کئی بار بلا بھیجا ہے۔ مگر میں نہیں گئی۔ میں نے اب کیا جا کر کرنا ہے!  
ہر طرح بھی ہوا اپنا جی نکاؤں گی۔ میں اسے بتاؤں گی کہ اگر تم مجھے آسانی سے بھلا بیٹھے  
تو میں بھی تمہیں بھلا سکتی ہوں۔  
میں کبھی اختر کو ملنے نہ جاؤں گی

وہ جو میرا رشتہ لے کر آیا کرتی تھیں۔ ان کو پھوپھی نے جل کر نہ جانے کیا کیا  
کہہ دیا ہے کہ انہوں نے کھلا بھیجا ہے ہم نے کہیں اور منگنی کر لی ہے۔  
اس خبر نے جہاں دادا جان کو دکھ پہنچا یا ہے۔ وہاں مجھے بے اندازہ خوشی بخشی ہے  
پھوپھی اب اپنے لڑکے کو پیش کرنا چاہتی ہے۔  
مگر میں بھلا کبھی اس سے شادی کر سکتی ہوں! کبھی نہیں کروں گی۔ میری زندگی تو پہلے  
ایک ٹکڑا ہو چکی ہے۔ اور اب مزید کیا تلخ ہوگی۔

چاہ مہینے گزر گئے ہیں۔ میں نے گھر پر ایف اے کی کتابیں منگوا کر پڑھائی شروع  
کر دی ہے۔ سعیدہ میری سہیلی کا دلچسپ کے بعد روزانہ یہاں آ جاتی ہے۔ اور پھر اہم دونوں  
لڑکوں کا کام کرتی ہیں۔  
اختر کا خیال کسی لمحے نہیں بھولتا۔ میں اپنے آپ کو ہر لمحہ مصروف رکھنے کی کوشش  
کرتی ہوں تاکہ اسے بھول جاؤں..... سعیدہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ تم کتنی کمزور  
ہو گئی ہو۔

کے ساتھ؟ ..... وہ مجھے اندر کو مٹھڑی میں لے گیا تھا اور پھر..... پھر اس نے ایک ایسی بُری بات بتائی کہ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ یہ بھلا کون ہو؟ میرے بھائی کو خراب کرنے والا!

میں نے اسی وقت دادا جان اور والدہ کو بتایا..... اور دادا جان نے دوسرے ہی دن چھوچی کو نوٹس دے دیا کہ یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔ جہاں جی چاہے بیٹے کی شادی کرو۔

اس بات پر بہت جھگڑا ہوا۔ اور نامراد عورت چھوچی نے میرے وہ دہ طعنے دادا جان کو دیئے کہ ہمسائیاں توبہ توبہ کرنے لگیں۔ دادا جان سارے گھر میں گالیاں دیتے پھرتے تھے اور میں اور والدہ ہنسی ہوئی تھیں۔

اس وقت میرا جی کس طرح رو رہا تھا! ..... جس شخص کے لیے بدنام ہوئی جس شخص کے لیے زندگی کو روک لگایا۔ وہ پھر بھی اپنا نہ ہوا۔ اور یہی وہ نازک اور دردناک وقت ہوتا ہے۔ جب محبت پھوٹ کر روتی ہے۔ میں اس لمحے کس قدر ویران نہیں ہو گئی تھی..... میں کسی کو منہ دکھانے قابل نہیں رہی تھی۔

اگرچہ آدھی ہمسائیوں نے یقین کیا تھا۔ اور آدھی ہمسائیوں نے یقین نہیں کیا۔ ان کو معلوم تھا کہ میں کیسی لڑکی ہوں۔ کبھی کوٹھے پر جا کر یا کھڑکی میں کھڑے کر تا تک جھانک نہیں کی تھی۔

مگر پھر بھی یہ عورت میرا زخمی دل تو دکھا گئی نا۔ .... دادا جان کے دل میں تو برائی ڈال گئی نا۔ ....

وہ پرانی وضع کے جاہل قسم کے آدمی ہیں۔ ایک پل میں گالیاں دینے پر اترتے ہیں۔

دلت کو دادا جان آئے۔ تو میں ان کے سامنے ہی نہ ہوئی۔ ایک دو روز تک

اختر کو دیکھے چھ ماہ گزر گئے ہیں۔

پتہ نہیں وہ کس حال میں ہے!!

لیکن میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ خواہ مخواہ سوچ لیتی ہوں۔ جیسے شاید وہ بھی میرا

بغیر اداس ہوگا۔

لیکن اس نے بھلا کا ہے کے لیے اداس ہونا ہے!

وہ اچھا بھلا ہوگا!

اے دل اب اسے بھول جا۔ ہمیشہ کے لیے بھول جا۔

چھوچی اس گھر سے چلی گئی ہے۔ مگر چونکہ دادا جان نے اس کے لڑکے سے بڑے نہیں کیا۔ اس لیے جاتے ہوئے دادا جان کو کہہ گئی ہے۔ دیکھ لینا! تیری بیٹی کو سارا خاندان اور ساری برادری میں نشر کر کے چھوڑ دوں گی۔ اسے اس قابل نہیں رکھوں گی کہ اس اور شادی ہو سکے۔ پھر تو خود ہی میری منتیں کرے گا۔ اور یوں تجھے اپنے قدروں پر ہٹا ہٹا دیکھوں گی۔

کتنی ذلیل عورت ہے۔ اسکا یہاں آنا بد نصیبی کے آنے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جب سے یہاں آئی تھی ہزاروں طرح کی لڑائیاں کرواتی رہی تھی۔ اور اب جا جاتے بھی دھکی دے گئی ہے۔

یہ نیکی کا زمانہ ہے ہی نہیں۔ رہنے کو جگہ دے دی اور انعام یہ دے گئی ہے اور اس نے تو ابھی نکلن بھی نہیں تھا۔ دادا جان نے خود ہی اسے رخصت

ہے۔

اس کا رنڈا بیٹا! انجم کو بری بری حرکتیں سکھا رہا تھا..... اور یہی

ہی نہیں تھا.....

کل جب انجم روتا ہوا میرے پاس آیا کہ وہ جو نیچے آدمی رہتا ہے نا!

ان کا غصہ اتر جائے گا۔ میں ان کو سمجھا لوں گی۔۔۔۔۔

دادا جان کو بات سمجھا دی جلتے ہو تو سمجھ جاتے ہیں۔۔۔۔۔  
لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ وہ نامراد تو یہاں سے چل دی نا۔۔۔۔۔  
ایسی عورتوں سے خدا بچائے۔ یہ تو شیطان کو بھی آگے لگاتی ہیں۔

آج میرا دل بہت اداس تھا۔ نہ جانے اختر کیوں بار بار یاد آ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ جب آنکھوں سے آنسو گرتے ہیں تو سارا جسم لرزنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ آنسو نہیں گرتے بلکہ خون نکلتا ہے خون کے آنسو بہتے ہیں۔

آج جی چاہتا ہے کہ اختر سے ملوں۔ مگر کیسے ملوں؟ اور پھر فائدہ بھی کیا ہے؟ کیا معلوم۔ وہ مجھے بالکل ہی بھول چکا ہو! یقیناً یہی ہوگا۔۔۔۔۔ وہ مجھے بھول چکا ہوگا!۔۔۔۔۔ آہ!

ایک خط! جو پوسٹ نہ ہو سکا! :-

اختر! تم سے بے بغیر یہ دن کچھ یوں گزر رہے ہیں۔ جیسے ان کا میری زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جیسے رنگین تصویروں کی کتاب دیکھتے دیکھتے اچانک بیچ میں ساڈا اور سفید ورق آگئے ہوں۔ جیسے سینا دیکھتے دیکھتے ایک ایسی فلم ٹوٹ گئی ہو۔ آج نہ جانے کیوں تمہاری ایک بات تمہارے ساتھ گزرا ہے ہوئے وہ حسین دن مجھے بڑی طرح یاد آ رہے ہیں۔ جیسے میرے سامنے رنگین تصویروں والی فلم چل رہی ہو۔ جیسے میں گہرے اندھیروں میں روشنیوں کے خواب دیکھ رہی ہوں۔ جیسے ڈراؤنے خوابوں کی بجائے دلانے چلیے خوابوں کے ٹکڑے دیکھ لیے ہوں۔

اختر! بے وفا اختر! میں اکثر سوچتی ہوں کہ وہ بھول گیا کیوں نہیں کھتے۔ جو ان دنوں کھلا کرتے تھے۔ اور ویسا ہی چمکیلا سوز اب کیوں طلوع نہیں ہوتا! جو پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر نہایت آب و تاب کے ساتھ چمکا کرتا تھا۔ لیکن اب تو شام کے گہرے سائے اور طرف پھیل رہے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہ قوس و قزح ہمارے آسمان پر دوبارہ نہیں چھا سکتی۔ تو پھر ان دنوں کی سوگوار یاد کیوں باقی رہ جاتی ہے۔

شام کی اداسی چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ اور میں تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔ جو

لیکن تم تو یہ ساری باتیں بھول چکے ہو گے۔ تم مرد لوگ سارا کچھ آسانی سے  
اموش کر دیتے ہو۔

کاش! میں بھی تمہیں بھلا سکتی!

اختر! ایک لڑکی کی زندگی کو خراب کرنے سے پہلے تمہیں یہ سوچ لینا  
چاہیے تھا۔ جن وادیوں کو۔ جن راہوں کو تم نے نہ کر سکتے تھے۔ تم نے وہاں قدم  
کیوں رکھا۔

تم امیر لوگ ہو اختر۔ اور ہم غریب!..... تمہارے گھر والے یہ  
بے گوارا کر سکتے تھے۔ کہ تم ایک غریب لڑکی سے شادی کرو.....

اختر! کاش! میں تمہیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتی۔ کہ میرے دل کے ہر رستے  
ہم نے زخم پر تمہارا ہی نام کھدا ہوا ہے۔ تمہارے ہی گھاؤ لگے ہوئے ہیں۔ مگر تم  
اپنی ذرا سی بات کہہ کر میرے چاروں طرف دیرینیاں پھیلا کر چل دیئے۔

اور میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ کہ مرد کی محبت ایک لمحہ میں بدل  
سکتی ہے۔

مرد جو کچھ کہتا ہے کبھی اس پر عمل نہیں کرتا۔ مرد کبھی وہ نہیں ہوتا جو اپنے آپ  
کائنات کرتا ہے۔

کاش! تمہیں معلوم ہو سکتا۔ کہ کس شدت کے ساتھ تمہاری پرستش کی جاتی  
رہا ہے۔

کاش! تمہیں اس کا ذرا سا بھی احساس ہوتا.....

تمہیں معلوم ہو سکتا۔ کہ محبت کتنی زبردست چیز ہے۔ محبت تو ایک ازلی و  
ابدی چیز ہے۔ یہ ایک آگ ہے۔ جو ایک بار روشن ہو جائے تو ریشے ریشے  
بل کر اتر کر جاتی ہے۔ جو بجھنا نہیں جانتی۔ محبت دل کے چور دروازوں سے  
داخل ہو کر کبھی رخصت نہیں ہوا کرتی۔

لیکن تمہاری محبت محبت نہیں تھی۔ تمہاری محبت "ہوس" تھی۔ تمہارا پیار تہی

کبھی پوسٹ نہ کر سکو گی۔ اس لیے نہیں کہ یہ خط تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے کہ اب  
ایسے خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا؟

تم مجھے بھول چکے ہو گے۔ نئے چمکیلے رنگ سے نشینے نے تمہیں اپنی طرف کھینچ  
لیا ہو گا۔ نئے پھول کی خوشبو تمہیں پسند ہو گی۔ تمہارے دماغ پر چھا چکی ہو گی۔ اور تم مجھے  
فراموش کر بیٹھے ہو گے۔

کاش! تم انہی غریب لڑکی کی محبت کو سمجھ سکتے!

میرا یہ انتظار بالکل فضول ہے۔ کہ شاید تم پلٹ آؤ۔ شاید تم واپس آ جاؤ۔ اور بہاریاں  
پھر اس اجڑے چمن کو ہرا کر دیں۔ اور ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے۔ زندگی کے ہر لمحہ  
کے اس بار اتر جائیں۔

کاش! بے وفا اختر! تمہیں اس کا احساس ہو سکتا۔ کہ تم نے وفاداری کو کس بے رحمی  
سے زبردست کیا ہے تم نے بھول کر اپنی پتی تو خنجر کو فضاؤں میں بکھیر دی ہے۔ مگر تم اتنی دور جا  
چکے ہو کہ اب تمہیں پکارنا بالکل فضول ہے۔ محبت کا چشمہ تمہارے دل میں سوکھ چکا ہے  
اور ان درختوں پر اب کبھی پھول نہیں کھلیں گے۔

میری دنیا سے اب بہار رخصت ہو چکی ہے۔ درختوں نے افسردگی کا لبادہ لٹا  
لیا ہے۔

محبت کا چاند پہاڑیوں کے عقب میں غروب ہو چکا ہے۔ اب چاندنی محبت کے  
کبھی گیت نہ گائے گی۔

تم! ایک بے وفا آدمی! یہ صرف تم ہی وہ شخص ہو۔ پہلے ادب آخری۔ جس نے  
میں نے محبت کی ہے۔ اور اس محبت کو دل سے نکال دینا میرے بس ہے اب

محبت کا پھول صرف ایک ہی بار کھلتا ہے۔ یہ سورج ایک ہی بار طلوع ہوتا ہے۔  
اختر! تم نے اگر یوں چھوڑ دینا تھا۔ تو پھر میری معصوم جوانی کو محبت کے

راگوں سے کیوں بھرا تھا۔ میری زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی۔ تم نے مجھے کیوں لایا  
تھا۔ تم نے کیوں اپنا بنانے کا وعدہ کیا تھا۔

کی طرح اُٹا۔ آنا فائیں چھا گیا۔ اور طوفان کی طرح چپ چاپ اتر گیا۔  
 اختر! تم نے مجھے ساری زندگی خون کے آنسو بہانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔  
 میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی! ... لکاش میں تمہیں بھول سکتی۔  
 میں تمہیں پونسی بے فائدہ خط مکھ رہی ہوں۔ جو تمہیں کبھی نہ بھیجوں گی۔ میں ایسے ہی  
 گڑبگڑی خط مکھ کر پھاڑ چکی ہوں۔  
 اب تمہیں خط لکھنے کا کیا فائدہ!

آج میں دوپہر کو کھانا کھا کر اُدھر گئی۔ اور ابھی بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ اتنی نے اُدھر  
 دیں.....  
 میں نے پوچھا۔ کیا ہے؟ تو کہنے لگیں تمہاری سہیلی کی نوکرانی آئی ہے۔  
 میں نے کہا۔ ادھر ہی بھیج دو۔  
 اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کہ وہ آسیہ کے ہاں سے آئی تھی۔  
 میرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ پھر اُس نے بتایا کہ چھوٹے  
 صاحب بہت بیمار ہیں۔ انہیں بیمار ہوتے ہیں روز ہو گئے ہیں اور انہوں نے آپ  
 کو بلا دیا ہے۔

اس خبر نے مجھے شعلے کی طرح مضطرب کر دیا! میرا جی چاہتا تھا کہ اگر اختر بیمار ہے  
 تو اس کی تیمارداری کرنے کا حق صرف مجھی کو ہے۔ میرا جی چاہتا تھا بھاگ کر جاؤں  
 اور اختر سے لپٹ جاؤں۔

وہ میری زخمی محبت جس کا گلا اس نے بے رحمی سے گھونٹ ڈالا تھا۔ آج پھر  
 ایکایک بے چین ہو گئی۔ روشنی کے مینار کی مانند میرے تاریک سمندر میں ابھر آئی۔  
 لمحوں محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے اسی پرانی محبت نے جس کام میں نے اپنے طور پر خاتمہ

آج کا دن ایک عجیب اداسی میں گزرا۔ پہلی پہلی دھوپ اور آسمان پر چھائے  
 ہوئے گہرے غبار نے سارے ماحول کو غلین بنا رکھا ہے۔ سردیوں میں پچکے  
 سے دھندلے دن کو جب بادلوں کے مٹاے ٹکڑوں نے سورج کو ڈھکاپ  
 رکھا ہو۔ اور چاروں طرف غبار کا گہرا خول ہو تو نہ جانے ایسے سے دل کیوں  
 اداس ہو جاتا ہے۔  
 روح کسی بوجھ کے نیچے دبی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ساری دنیا غلین نظر آتی  
 ہے جیسے کسی چیز میں بھی حسن۔ دل کشی اور رعنائی نہیں رہی۔ میرے لیے تو  
 دلیے بھی دنیا میں نہ کوئی خوشی رہی ہے اور نہ حسن رہا ہے۔  
 ..... اب تو میں اختر کو بھی بھلا رہی ہوں۔

کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ خبر سنتے ہی میرے سارے جسم کو جھنجھوڑ ڈالا۔  
میں بہت پریشان ہو گئی۔

آخر نے کس بے رحمی سے مجھے یادوں کے خزاں نصیب جنگلوں میں تنہا چھوڑ دیا  
ہوا تھا۔ جہاں اس کی ہر بات ایک مستقل قہقہہ اور مذاق بن کر چاروں طرف پھیلی ہوئی  
تھی۔ میں اس جنگل میں تنہا اور ماری ماری پھرتی رہی ہوں، بجز اور پتے ہوئے ریتے صحراؤں  
میں دھنسی ہوئی تھی۔ میں نے وہ دن کس طرح بسر کیے تھے؟ میں نے وہ سال کس مشکل سے  
گزارا تھا؟

آخر تم نے مجھے کس بری طرح مصیبتوں کے اس وسیع صحرائے تنہا چھوڑ دیا۔ کیا  
تمیں ذرا خیال نہ آیا تھا؟ تم نے اپنے کیے ہوئے وعدوں کا ایک لمحہ کے لیے بھی خیال نہ کیا۔  
تم نے وعدوں کے سارے سینے ڈبو دیے۔ اور تم ٹہینے سے شادی کرنے کے  
لیے تیار ہو گئے۔ تم ٹہینے کے خیال ہی سے وہ سارا کچھ بھول گئے۔ جب تم نے میرے ماتہ  
مل کر آسمان کی لازوال وسعتوں میں خواب دیکھے تھے۔ اور ستاروں کی وادیوں میں پہنچ  
کر محبت کے گیت گائے تھے۔ تمہاری محبت پانے کے بعد میں نے اپنی زندگی کے غزال  
میں ان پھولوں کو سنہری دھوپ میں کھلتے اور ٹہکتے دیکھا تھا جو اس سے پہلے کبھی نہ کھلے  
تھے۔ جو اس سے پیشتر کبھی نہ ٹہکتے تھے۔

ہم محبت کرتے تھے۔ . . . اور تم نے زندگی بھر ساتھ بچنا ہے کا وعدہ کیا تھا  
مگر جب ٹہینے کو تمہارے سامنے پیش کیا گیا تو تم نے مجھے چھوڑنے وقت پل بھی نہ لگایا۔ تم  
نے مجھے ایک لمحہ میں ہی گری کھڈ میں گرا دیا۔

اس کی لو کرانی کھڑی تھی اور میں خیال ہی خیال میں کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی تھی۔  
پھر میں ایک دم خیالوں سے چونک پڑی اور اسے کہا۔ تم جا کر کہہ دو۔ میں نہ آسکوں  
گی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے اور وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک روتی رہی۔ میں کیوں اسے ملنے جاؤں؟  
میرا اور اس کا اب کیا ساتھ!

وہ رنگ محل میں رہتا ہے۔ اور میں وہاں رہتی ہوں۔ جہاں خاک اڑتی ہے۔  
زندگی میرے لیے ایک سنگین حقیقت بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس کے لیے  
نہ ایک مذاق ہے۔ . . . . میرے ہر سمت اداسیوں کے کھنڈرات سلسلہ در سلسلہ  
پہنچے چلے گئے ہیں۔ اور اس کے گرد خوشیوں کے راگ ہیں۔

میں وہاں ہوں جہاں کوئی آواز نہیں۔ کوئی گیت نہیں! کوئی زندگی نہیں۔ وادیوں  
میں دھب چکا ہے۔ پرندے گنگ ہو گئے ہیں۔

اب میں جا کر کیا کروں گی! . . . . . لیکن نہیں۔ . . . . میں جاؤں گی۔ آخر یہاں ہے  
میں دیکھنے ضرور جاؤں گی۔ . . . .

یا خدا آج کا دن جلدی سے گزار دے۔ تاکہ میں کل جاسکوں اس وقت سہ پہر کے  
انچ رہے ہیں۔ اب نہ جاسکوں گی۔ کل جاؤں گی۔

میری رات نہیں سو سکتی۔ . . . . آخر کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی  
ہوں۔

آج میں اسے دیکھنے ضرور جاؤں گی۔ . . . . جو رات جاگ کر دکھ کی  
گزاراں جلے۔ . . . . وہ کس قدر لمبی رات ہو جاتی ہے! سو سال کی رات  
ہو جاتی ہے۔

یوں لگتا تھا۔ جیسے کبھی صبح نہ ہوگی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ صبح ہو گئی  
ہے۔



یکتی۔ اسے ملنے کے لیے آسکتی۔

ادرب! پھر شاید! اسے میری محبت کا خیال آتا....  
اختر مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا.... میں سوکھ کر ادھی سے بھی زیادہ کم ہو  
جاتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اختر کے پاس پہنچ کر مجھے رونا آ جاتا۔ اس نے صرف اتنی سی بات  
کی کہ یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔

ادرب میں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہو گئی۔  
مجھے خیال آ جاتا ہے کہ یہی تو وہ شخص بیٹھا ہے جس نے مجھے برباد کیا ہے۔ میری  
داسی۔ میری تباہی.... میری غمگینی۔ میری کمزوری ہر چیز کا باعث صرف یہی شخص  
ہے۔ اسی شخص کی محبت ہے جس نے میری زندگی کو دکھ میں بدل دیا ہے....  
ادرب یہی شخص مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ تجھے کیا ٹوٹا؟....

کیا یہ رونے والی بات نہیں ہے؟  
اس کے بعد بڑی مشکل سے اختر نے چپ کرایا.... بہت پیار کرنے لگا  
بڑی باتیں کہیں کہنے لگا۔ میں ہمیں کبھی نہیں بھلا سکتا۔  
میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کروں گا۔

ادرب نے ابھی تک ٹھنڈے سے بھی شادی نہیں کی۔ میں دماں شادی کرنا نہیں  
پاہتا۔ میں تو صرف تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ تم جو میری محبت ہو....  
اس کے بعد پھر اختر ایک بار مجھے درغلانے لگا۔ کہنے لگا۔

میں تمہاری محبت کو آزمانا چاہتا تھا.... یہ دیکھنا چاہتا تھا.... کہ تم آتی ہو  
بائیں.... اور اگر چہ تم نے کل انکار کر دیا تھا۔ مگر مجھے پتہ تھا۔ تم آؤ گی۔  
میں خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ میرے پاس ان باتوں کا کیا جواب  
تھا!

اس نے کہا۔ وعدہ کرو۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھو گی۔  
اور یہ سن کر مجھے رونا آ گیا.... اختر کو بھلا میرا درد کیسے آ گیا!

آج میں اختر سے ملنے گئی۔ ایک طویل مدت کے بعد ان کے ہاں گئی تھی۔  
اختر کے کمرہ میں گئی۔ وہ کبل اور طے سو رہا تھا۔ کمرہ میں اور کوئی نہ تھا۔  
میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوئی۔ کمری پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب میں سوچ رہی تھی۔  
اسے اٹھاؤں کیسے؟

کیا کبل کھینچوں! لیکن اگر کوئی اور ہوا تو؟  
کیا اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دوں!  
لیکن میں خاموش بیٹھ گئی۔ بالآخر میں اٹھی۔ اور سر ہانے کی طرف جا کر جھک کر  
دیکھنے لگی کہ اختر ہی ہے یا کوئی اور ہے؟

ادرب وہی میں جھکی۔ اختر نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ پکڑ لیا۔ اور میرا منہ  
منہ کے پاس لے گیا.... میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں بنے زبردستی اس کے ہاتھ  
پھٹائے اور وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا.... میں دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ اچھا بھلا  
تھا بالکل بیمار نہیں تھا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گیا تھا۔

اس کو تندرست اور صحت مند دیکھ کر میرا جی اداس ہو گیا.... اختر وہ  
... اور میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ کاش! یہ بیمار ہوتا! پھر میں اس کو

اس کی بے دردی نے تو مجھے دکھ دیا ہے۔ اور اب یہی میرا درد کر رہا ہے!  
یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے!..... نہ نہ اختر! تم میرا درد نہ کرو۔ تم صرف  
ظلم کرو۔ یہی نہیں اچھا لگتا ہے۔

اختر نے بتایا کہ وہ اپنی اتنی کو منارہا ہے کہ وہ یہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔  
اور اگلے ہفتے تک اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اس کی اس بات نے مجھے  
حیران کر دیا..... پھر اختر نے وعدہ کیا کہ میں اگلے ہفتے معلوم کرنے ضرور آؤں گا۔

یہ ہفتہ ایک عجیب قسم کے موڈ میں گزرا ہے۔ عجیب شش و پنج میں کبھی اس  
بندھ جاتی تھی۔ کبھی ناامیدی ہو جاتی تھی۔ کبھی یہ خیال آ جاتا تھا کہ شاید وہ میری حالت  
دیکھ کر مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔  
لیکن اگر اس کے دل میں چاہ نہیں ہے۔ تو پھر میں یہ شادی نہیں کروں گا۔  
میں تو شادی سے زیادہ یہ چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے اور صرف مجھ سے محبت کرے  
بے شک شادی نہ بھی ہو۔

شاید وہ میری حالت پر رحم کھار رہا ہے؛  
خدا نہ کرے۔ اگر ایسی بات ہوتی۔ تو میں کبھی شادی ہی نہیں کروں گی۔  
میں اس کا رحم نہیں چاہتی۔ مجھے رحم سے نفرت ہے۔ اگر اس نے مجھ پر رحم کیا  
میں سختی سے ڈانٹ دوں گی۔  
میں کوئی فقیرنی ہوں۔ جو وہ مجھ پر رحم کر کے مجھے خیرات دے۔

پرسوں اختر کے ہاں جانا ہے۔ پتہ نہیں۔ وہ کیا بتائے گا؟  
خدا کرے..... وہ مجھے بہت بڑی خوشخبری دے۔

پھر میں اختر کے پاس ہمیشہ رات دن رہوں گی۔ پھر جذباتی کے یہ ہوں کہ دن  
بیتے میں نے گزارے ہیں۔ ان سب کی تلافی ہو جائے گی!  
پھر دنیا کتنی خوبصورت ہو جائے گی؟..... پھر ہر چیز چمک اٹھے گی!  
خدا..... کیا تو میری اتنی سی آرزو بھی پوری نہ کرے گا؟

اک لک چاندنی رات کس قدر خوبصورت تھی۔ دُڑے دُڑے سے حسنِ چہنچہ کی  
اندھ بھڑپڑا تھا..... نیلی نیلی بے داغ چاندنی چاروں طرف بھی جا رہی تھی.....  
چاندنی کسی خوبصورت دوشیزہ کی طرح چمپ چاپ لیٹی ہوئی تھی..... ہر چیز  
انوریز کیفیت طاری تھی۔

میں سو رہی ہو کر اختر کے متعلق سوچ رہی تھی؟ یہ کس قدر خوبصورت رات ہے!  
بہتر دن کی گلیوں کے اندر یہ خوبصورت رات ہے۔ تو پہاڑوں اور جنگلوں میں یہ رات کیا  
ہو جاتی ہوگی! میں ان پہاڑوں اور جنگلوں میں کب جاؤں گی! جہاں ایسی خوبصورت  
چاندنی ہوگی! ایسی خوبصورت راتیں تو سو کر نہیں بسر کرنی چاہئیں۔

میرا ہی چاہتا ہے میں چاندنی راتوں کا سارا حسن اپنی بھولی میں سمیٹ لوں۔ ہائے میں  
ان کی کشیدگی ہوں۔

ایسی راتوں میں بس یہی جی چاہتا ہے کہ چاندنی میں نہلے ہوئے خوبصورت باغوں  
کا جا کر رقص کریں۔ خوب اچھلیں۔ کودیں اور گائیں۔ شور مچائیں۔ اور آنکھ مچولی کھیلیں۔  
گر الیا کہاں ہو سکتا ہے۔

ان جگہوں پر رہ کر ایسا سوچنا اور ایسے رنگین خواب دیکھنا لوگوں کے نزدیک محض حماقت ہے۔ مگر میرے دل سے ایسی باتیں الگ نہیں ہوتیں۔ بے شک چاہے یہ حماقت ہی کیوں نہ ہو!

میں اٹھ کر آگئی۔۔۔۔۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اگر اختر نے ٹینہ سے شادی کرنی تھی۔ تو پھر اس نے مجھے آج بلایا کیوں؟  
مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اختر مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔۔۔۔۔  
ٹینہ کو دکھا کر یہ کہنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ دیکھا۔۔۔۔۔ میں جس سے شادی کرنا بتا ہوں۔ وہ کیسی ہے؟

ہاں! اختر سچ کہتا ہے۔۔۔۔۔ محبت یونہی نہیں کی جاتی۔  
ایسی محبت میں آنسو نہیں بہاتے جاتے۔۔۔۔۔ بلکہ آنکھوں میں  
EYE LANCE  
اگر آنکھوں کو خوبصورت بنایا جاتا ہے تاکہ دیکھنے والے کو اچھی طرح گھائی کیا جاسکے۔  
ایسی محبت کرنے کے لیے ریشمی ساڑھی اور کٹے ہوئے بالوں کی ضرورت ہے۔  
نازدادار کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ دولت کی ضرورت ہے۔ آسودگی اور خوشی  
ضرورت ہے۔ رشتہ داری کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہاں بھلا کیا ہے؟  
ٹینہ وہاں رہتی ہے۔ جہاں پھول کھتے ہیں۔۔۔۔۔ جہاں سکتے کھنکھتے ہیں۔  
یہاں ریشمی ساڑھیاں ہیں۔

مگر ہم وہاں رہتی ہیں۔ جہاں رک رک کر بیہنے والے آنسو ہوتے ہیں۔ غریبی  
لگتی ہے۔ اور باقی پھولوں کے مار ہوتے ہیں۔  
کل تک اختر مجھے کہتا تھا۔ کہ ہمارا جنم جسم کا ساتھ ہے۔ اور آج وہ ٹینہ سے  
بہر رہا ہوگا۔ مجھ سے پہلے اور نہ جانے کس کس کو کہتا رہا ہوگا۔ اور نہ جانے کب تک  
لہتا رہے گا؟

کیا اختر اس قدر گھٹیا ہے!۔  
میں نے جس اختر کو تاج محل کا رنگ مینا دیکھا۔ وہ تو سڑک پر پڑا ہوا پتھر نکلا۔۔۔  
اں کی محبت کا قطب مینا رنگین چٹانوں پر نہیں بلکہ ریت کی بوریوں پر تعمیر ہوا تھا۔ ان  
لوگوں کے لیے محبت تماش کے پتوں کی طرح ہے جسے ہر ایرے خیرے میں بانٹتے پھرتے  
ہیں۔

آج میں اختر کے ہاں گئی۔ تو اختر گھر پر نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد آیا اور اس کے  
ایک لڑکی بھی تھی۔ اختر نے تعارف کر دیا۔  
یہ ہے مس ٹینہ! میری پھوپھی کی لڑکی۔

اور یہ ہے۔ مس زاہرہ سلطانہ۔ آسیہ کی بہیلی۔  
ٹینہ جب کہ سامنے صوفے میں جا دھنسی۔۔۔۔۔ اس نے فیروزی رنگ  
ساڑھی باندھی ہوئی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی لہر  
شک لگی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ بالکل خون کے رنگ کی۔ جیسے ابھی ابھی کسی کا خون پانی  
ہے۔ جیسے اس نے میرا ہی خون پیا ہے۔ میرے اربالوں کا خون۔

میں خاموش زرد اور اداس چہرہ لیے بیٹھی تھی۔۔۔۔۔  
اور اختر کبھی میری طرف دیکھتا تھا۔ اور کبھی ٹینہ کی طرف۔۔۔۔۔  
ٹینہ شرمناکرا سے دیکھ رہی تھی۔ اداس دیکھا رہی تھی۔۔۔۔۔ اور اختر اس  
نچھا اور ہورہا تھا۔۔۔۔۔

کچھ دیر کے بعد میں نے اختر سے اجازت مانگی کہ اب مجھے جانا ہے۔  
ٹینہ نے کہا کہ کچھ دیر بیٹھو مگر میں کاہے کیئے بیٹھی۔

ساری رات میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ سو سکی۔۔۔ میری ساری روشنی  
میری آخری آس ہر چیز گل ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ رنگوں کے دیک بکھ گئے تھے۔ روشنی  
چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نامعلوم تاریکیوں میں جا چھپا۔

اور میں اپنے آپ کو اس قدر نڈھال محسوس کر رہی تھی جیسے ابھی گری کہ گری۔  
بت بنی بیٹھی ہوں۔۔۔۔۔ پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھتی ہوں۔ نہ جلا  
کیا ہوگا؟ یہ صدمہ کیسے بھولے گا!

رات سے پھر بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ منہ سے ایک لفظ تک نہ  
نکلا جاتا۔۔۔۔۔ دادا جان کہہ رہے تھے۔۔۔۔۔ میری بیٹی کو نہ جانے  
کی نظر کھا گئی ہے۔

میرے دادا! کیا تو مجھ سے پیار کرتا ہے! کیا تو واقعی مجھے بیٹی سمجھتا ہے  
تو اس بیٹی کو زہر لا کر دے دے کہ یہ مصیبتوں سے چھوٹ جائے۔

بخار اترتا ہی نہیں۔ نہ زور کا چڑھتا ہے۔۔۔۔۔ نہ رات کو نیند آتی ہے  
ذرا سا پڑھ لوں۔۔۔۔۔ تو دماغ تھک جاتا ہے۔  
اتنی رات دن پریشان رہتی ہیں کہ نہ جانے ان کی بیٹی کو کون سا گھن لگ  
گیا ہے۔

مگر امی کو کیا پتہ؟!  
زندگی کتنی عجیب ہو گئی ہے؟

کل میں ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آرہی تھی۔ تو راستے میں اختر کا ٹوکریل گیا۔ اس نے  
بتایا کہ اختر بابو کی شادی اگلے اتوار کو ہو رہی ہے!

اس خبر نے مجھے پاگل سا بنا دیا۔۔۔۔۔ بڑی مشکل سے ڈاکٹر کی دکان تک پہنچی اور  
یوں نڈھال ہو کر بیچ پر بیٹھ گئی۔ جیسے طوفان سے ٹوٹی ہوئی شاخ درخت ہوتی ہے۔ وہاں  
پر پے شمار عورتیں آئیں ہوئی تھیں مگر مجھے کسی کا کچھ علم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ میرا رنگ لیموں  
کی طرح زرد تھا اور میری آنکھ میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے میرا کلیجہ کوئی کھارہا ہے  
دل ڈوب رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سرد تھے اور جسم گرم تھا۔

بڑی مشکل سے گھرائی۔ ڈاکٹر کی دوائی پی۔ اور بے سدھ ہو کر پڑی۔  
اے نیلے آسمانوں پر بسنے والے خدا! میری دنیا تباہ کر کے تیرے ہاتھ کیا آیا۔  
کونسی خوشیاں مفت دے دی تھیں۔ جن کی قیمت لینی تھی؟

آج اختر نے شادی کا کارڈ بھیجا ہے۔ کہ اگر مجھے اس سے محبت ہے تو میں اس کی  
شادی میں ضرور آؤں۔

ادخلم اور بے وفا شخص! کیا تو چاہتا ہے کہ میں اپنے جنازے میں خود ہی شریک  
ہوئے آؤں؟۔۔۔۔۔ کیا میں اپنے سامنے تیری شادی ہوتے دیکھ سکتی ہوں! تجھے یہ کارڈ  
بھیجتے ہوئے بھی کوئی خیال نہ آیا۔

تم میرا سہاگ مجھ سے چھین کر مجھے کفن پہنا رہے ہو! تم سارے لوگ پھتر ہو۔ تم  
بھی ایک پھتر ہو۔ مجھے ان پھتروں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ بہت جلد یہ سارے  
پھتر پھٹ جائیں گے۔ ریت چاروں طرف پھیل جائے گی اور یہ آندھی نہ جانے مجھے کہاں  
اڑائے جائے گی۔

میں ریت کے اس طوفان میں نہ جانے کہاں کھو جاؤں گی۔

میرے بہن بھائی اور والدہ نہ جانے مجھے کہاں ڈھونڈتی پھریں گی۔ میں ان کو کہاں

ملوں گی :

آہ ! یہ ایسا غم نہیں جسے میں بھول سکوں گی۔ یہ اسی اختر کی شادی ہو رہی ہے جس نے مجھے اپنی زندگی۔ اپنی جان کہا تھا۔ جس نے کہا تھا۔ زادہ ! تم میرے جسم کا خون اور میرے بھول کی خوشبو ہو۔ تمہارے بغیر میں کبھی زندہ نہیں رہ سکتا ! آہ ! میں کس قدر بھولی تھی اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔

مگر وہ تو لفظوں کا سوداگر تھا۔ لفظوں کے مینا بازار سجا کر مجھے رانستے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے زندگی بھر کا سودا چند جھوٹے اور کھوٹے سکوں سے بھی کم تر ادا کر دیا لفظوں پر یقین کر کے کر لیا۔ وہ تو کہتا تھا کہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ہر بڑی سے بڑی طاقت سے شکر مول لے لوں گا۔

اور پھر وہ مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیتا۔ اور کہتا کہ کوئی مجھے تم سے الگ نہیں کر سکتا..... میں گھبرا جاتی۔ میرا سانس رک جاتا تھا۔ مگر وہ مجھے نہیں چھوڑتا تھا..... اس کے اس رویہ سے مجھے ڈر آتا تھا۔ کیونکہ اس طرح پیار کرتے ہوئے اس کی شکل بدل جاتی تھی۔ وہ کوئی ایسا خونخوار درندہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ابھی ایک پل میں مجھے کھا جائے گا..... اور میں کبھی ہونی ہر فی کی طرح اسے نکلتی تھی.....

اور جب میں اسے کہتی

اختر !..... یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے..... تمہارا جسم مانپنے کیوں لگ جاتا ہے۔ تمہیں بخار کیوں ہو جاتا ہے۔

تو وہ کہتا تم نہیں جانتیں۔ میں تم سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں اور جی چاہتا ہے تمہیں اپنے اندر اتار لوں۔ یا خود تمہارے اندر چلا جاؤں..... چند روز کے بعد جب تم میری بیوی بن جاؤ گی۔ تو پھر تم دیکھنا۔ جو میں نے ایک پل کے لیے بھی تمہیں چھوڑا۔ اس لیے کہ میں تم سے لازوال محبت کرتا ہوں۔ اور تم میری بیوی بننے والی ہو۔ میں تمہارا ملک اور شوہر ہوں۔

مگر اب وہ مینہ سے شادی کر رہا ہے..... کیا مر کی محبت یہی ہوتی ہے۔

اس نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی سے کھیلا اور جب دل بھر گیا تو لا پرواہی اختیار کر لی۔ مر کی محبت جب لڑکی کو چھو لے تو وہ ختم ہو جاتی ہے۔

اختر مجھ سے کبھی بھی محبت نہ کرتا تھا بلکہ وہ تو ایک عورت ایک جسم کو چاہتا تھا اب اسے ایک اور جسم مل گیا ہے۔ ایک خوبصورت جسم۔ ریشمی ساٹھیوں میں لپیٹا ہوا وہ اسے بیوی کے روپ میں ملے گا..... وہ مجھ سے لا پرواہ ہو گیا ہے۔

بس اس کے سوا کوئی اور بات نہیں ہے۔ اختر نے مجھے جس قدر خوفناک دھوکہ دیا ہے جس بلندی سے گرایا ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہ کروں گی۔ خدا اس سے ضرور بدلے گا..... اس نے ایک ایسا دل توڑا ہے جو ہمیشہ سے دکھی تھا۔ دکھی دل محبت کا بھوکا ہوتا ہے۔ اور میری محبت عظیم محبت تھی..... مگر آخر نے اسے پاؤں تلے کچل ڈالا :-

کل اتنی پانی کا اتنا بڑا گھڑا تھا کہ اوپر لارہی تھیں کہ میٹرھیوں پر پاؤں پھسل گیا۔ اور وہ سیدھی نیچے جا گریں۔

گرنے کا دھاکا ہوا۔ اور میری تو جان ہی نکل گئی۔ میں بستر کو چھوڑ کر بھاگی۔ دادا جان بھی گھر پر نہیں تھے۔ ساتھ ہی ہسپتال کو بلا دیا اور اتنی کو اٹھا کر ادھر لائے۔ ان کا چہرہ ہلکی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور انکھیں بند تھیں نسیم نے رونام شروع کر دیا۔ انجم گھر پر نہیں تھا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑکا۔ کہیں میری امی کو تو نہیں کچھ ہو گیا۔ بڑی دیر کے بعد اتنی کو ہوش آئی..... میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک پل میں ہی میری آنکھوں کے سامنے سے کئی تصویریں گزریں۔

مگر میں نے ایسے منحوس خیالوں کو اپنے پاس تک نہ پھٹکنے دیا۔

اور رات گئے تک اتنی کو سینک کرتی رہی۔ گرم دودھ پلایا۔ رات کو دادا جان آئے تو ڈاکٹر سے دوائی لائے۔

مگر اتنی کو ضرور بچانا ہے۔

کیا میں اختر کو بتاؤں؟

لیکن نہیں..... یا خدا! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے خواہ مخواہ اس کا نام لیا۔ وہ ہمارا کچھ نہیں گنتا۔ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا لوں گی مگر اسے کبھی نہ کہوں گی۔ کہ اتنی بیمار ہے۔

بچہ کو خط لکھوں! مگر ایک عرصہ سے اس کا بھی خط نہیں آیا..... بچہ کو کیسے لکھوں!.....

کاش! وہ یہاں ہوتی!

میں اپنی ایف اے کی کتابیں بیچ ڈالوں گی مگر اس سے کیا ہوگا؟

یا خدا تو میری ماں کو آرام دے دے۔ ورنہ ہم سب کو مار ڈال اکٹھے ہی ہم سب کو اس دنیا سے اٹھا لے۔ اپنی اس دنیا سے جہاں ہم دکھ اٹھانے کو زندگی گزار رہے ہیں۔

آج اتنی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ساری رات چار پائی کے ساتھ لگی اتنی سے نظر بچا کر روتی رہی ہوں..... پاگل ہو گئی ہوتی لگتی ہوں..... اتنی کے بعد ہمارا کیا بنے گا؟

میری اتنی جان! میری پیاری اتنی جان..... اپنی آنکھیں کھول دے دیکھ میری اتنی۔ تیری زائدہ بیٹی تجھے بلارہی ہے! تو نے تو ابھی اس کی شادی کرنی ہے..... ابھی تو انجم اور سیمہ نے بڑا ہونا ہے۔

میرے خدا میری فریاد سن۔ میری دعا قبول کر۔

اپنی بیماری مجھے بھول گئی ہے۔ اور اتنی کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی ہوں اتنی نہایت بیمار ہو گئی ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کیا ہونے والا ہے؟..... یا خدا! ہم پر رحم کرنا.....

اچھے خدا! ہم پر اپنا کرم کرنا..... ہم سے ہماری اتنی کو نہ لینا میری جان لے لے مگر اتنی کو آرام دے دے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگتی ہوں۔ یا خدا! ہمارا قصور مٹا کر دے۔

اتنی سے کروٹ تک نہیں بدلی جاتی..... بہت زیادہ کمزور ہو گئی ہیں۔ ان کو بیمار ہونے ایک حینہ ہو گیا ہے۔ مگر آرام نہیں آتا۔ مجھے بھی سجا آتا ہے۔ مگر میری اتنی کو آرام آجائے.....

نہ گھر میں کھانا کھاتا ہے۔ نہ کوئی ہنستا ہے۔ بازار سے دونوں وقت کچھ نہ کھاتا ہے۔ میرا تو کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ صرف نسیم، انجم اور دادا جان کے لیے منگا لیتے ہیں۔

یا خدا! تو امیر لوگوں سے ڈرتا ہے۔ ان کو کچھ نہیں کہتا..... مگر تو نے ہم پر کیوں اتنی سختی شروع کر رکھی ہے..... پہلے تو نے آبا جان کو چھین لیا اور اب اتنی کو آرام نہیں دیتا۔

یا خدا! میری جان لے لے۔ یا خدا! آج ہی لے لے مگر میری ماں کو آرام دے لے میرے خدا میری اتنی کو لے کر ہم پر اور زیادہ سختی نہ کرنا.....!

ہمارے پاس اتنا روپیہ بھی نہیں ہے کہ شاندار طریقے پر اتنی کا علاج کر لیں۔ ڈاکٹر بھی دس روپے فیس لیے بغیر نہیں آتا..... اتنے اتنے قیمتی انجکشن وغیرہ

کہاں سے منگا لیں؟!

میں جانتی ہوں کہ میں کتنے روز کی جہان ہوں۔

اور اب جب کہ میں دن بدن مرنے کے قریب ہوتی جا رہی ہوں نہ مجھے کوئی دکھ رہا ہے۔ نہ غم رہا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں بہت جلد اُچی اور اُباتا کے پاس جانے والی ہوں۔۔۔۔۔ دادا جان پہلے ہی پہنچ چکے ہیں۔۔۔۔۔ صرف ایک غم ہے۔۔۔۔۔ میری نیند بہن اور انجم بیٹا کا کیا بنے گا؟

وہ فیصل آباد (لاک پور) میں خالہ کے پاس رہتے ہیں۔ وہ یہاں نہیں رہ سکتے۔ ان تین چار سالوں میں ہم پر کیا کچھ نہیں بیتا؟ مگر گلہ کیا؟ اب کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ کسی سے نہیں ہے۔ نہ خدا سے نہ دنیا والوں سے۔ آخر بھی نہ جانے کہاں ہو گا؟

آہ! میں نے اس پھول سے پیار کیا۔ جس کی خوشبو میں کبھی نہ سونگھ سکی۔ اور ان راستوں پر بیٹھی۔ جہاں سے آخر کبھی نہ گزرا۔

شام کی اداسی چاروں طرف چھا رہی ہے۔ سینی ٹویم کی اس اداس شام کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔۔۔۔۔ اور پھر آج کل تو خزاں کا موسم ہے۔ جس کی وجہ سے فضا اور بھی اداس اور تاریک نظر آتی ہے درخت پتوں سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ سامنے کے درخت سے زرد زرد پتے ایک ایک کر کے گرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ جیسے یہ میری یادیں ہیں۔ جو ایک ایک کر کے میری زندگی کے درخت سے جھڑپڑ رہتی ہیں۔۔۔۔۔ اور جب یہ درخت بالکل خالی ہو جائے گا۔ تو میں مرجاؤں گی میں دنیا کی باتیں۔ یادیں سارا گھر ہیں چھوڑ جاؤں گی۔

دور سیاہ پہاڑیوں کے پیچھے زرد آفتاب غروب ہو رہا ہے ابھی کچھ دیر کے بعد چاند کالی کالی ٹہنیوں کے پیچھے سے نکل آئے گا۔ اور میری ختم ہوئی ہوئی زندگی کا ایک اور لفظ کم ہو جائے گا۔ ایک دن اور بیت جائے گا۔۔۔۔۔ موت کی گھڑی اور قریب آ جائے گی اب مجھے موت سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ موت میری بہیلی ہے۔

موت ہی مجھے اپنے گھر میں پہنچا دے گی۔ ایسے گھر میں جہاں میرے آبا اور میری

اتنی کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ دادا جان خاموشی سے آتے ہیں اور چپ چاپ بیٹھ جاتے ہیں۔ اب نہ وہ گالیاں دیتے ہیں۔ نہ کسی سے بولتے ہیں۔ پہلے سے زیادہ بوڑھے ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔

دادا جان کے ایک ایک کر کے پانچ جوان بیٹے مر گئے۔ پھر تین بیٹیاں مر گئیں اور اب۔۔۔۔۔ ان کی بہو۔۔۔۔۔ بستر علالت پر دراز ہے۔

یارب العزت! اسے پاک پروردگار! اسے میرے مہیود۔ آسمانوں پر بسنے والے خدا۔۔۔۔۔ میری ماں کو آرام دے دے۔ ہماری مصیبتوں میں ہزار بار اضافہ کرنے مگر ماں کو آرام دے دے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ ماں کے بغیر ہم کیسے زندگی بسر کریں گے؟ اور اگر تجھے نہیں پتہ۔۔۔۔۔ تو پھر ہم کو پتہ کر دے۔ ہم سب کو اپنے پاس بلا لے۔ ہم نے تیری دنیا میں رہ کر کیا کرنا ہے؟

یا خدا! ہم تیرے کھلونے ہیں۔ تو ہم سب کو ستا رہا ہے جو تیرا جی چاہتا ہے تو کرتا ہے تو امیروں سے ڈرتا ہے۔ ان کو کچھ نہیں کنتا۔۔۔۔۔

مارے ہم کو۔۔۔۔۔ جو جی چاہے کرے

تو نہ جانے کب سنے گا؟۔۔۔۔۔

اتنی کو وفات پانچ ایک سال گزر گیا ہے۔ اور مجھے سینی ٹویم میں آئے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ مگر پہلے سے زیادہ ہی بیمار ہو گئی ہوں۔

پہلے تو صرف ایک پھیپھڑا پھلتی ہوا تھا۔۔۔۔۔ اب دوسرا بھی ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر لٹیاں دیتے ہیں۔ مگر میں ان کی جھوٹی تسلی سن کر ہنس دیتی ہوں۔۔۔۔۔

اتنی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں اپنی اتنی اور آبا کے پاس اپنے گھر میں رہنا چاہتی ہوں یہاں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں۔۔۔۔۔ پھر میں یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔  
جوں جوں موت کے قریب ہوتی جاتی ہوں۔ اختر سے ملنے کی خواہش بڑھتی جا رہی ہے مگر میں اسے نہیں ملوں گی مجھے کیا خبر کہ وہ کہاں ہے؟  
وہ زندہ ہوگا۔۔۔۔۔ اور زندگی کی ہر خوشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہوگا۔۔۔۔۔  
دنیا میں ایسے ہی لوگوں کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ خدا نے انہی لوگوں کے لیے زندگی بنائی ہے۔

۲۸۱  
دسب لوگ ان کو پڑھیں گے۔ شاید کسی کو اختر کا پتہ چل جائے۔۔۔۔۔ اور وہ ان سے پہچان جائے۔  
لیکن اگر اسے پتہ بھی چل گیا۔ تو کیا ہوگا؟ اسے تو جیتے جی میری پرداہ نہ ہوئی تو کیا ہوگی؟  
آہ!۔۔۔۔۔!!

ورنہ وہ ہمارا گھریلوں نہ اجاڑتا۔۔۔۔۔  
پہلے ہمارے آبا کو لے لیا پھر غریبی دے دی۔ پھر اتنی کو لے لیا۔ پھر دادا جان کو اور اب میری باری ہے۔ کچھ روز کے بعد نسیم اور انجم کی بھی باری آجائے گی۔ ان دونوں کو بھی بخار رہتا ہے۔ کاش! یہ دونوں میرے سامنے مر جاتے۔  
دونوں خالہ کے پاس رہتے ہیں۔ جو رات دن ان سے کام لیتی ہوگی۔۔۔۔۔ اور کھانے کو کیا دیتی ہوگی۔۔۔۔۔ میں تو چاہتی ہوں کہ خالہ زیادہ سے زیادہ ظلم کرے۔ تاکہ یہ جلد سے جلد ہم سے آن ملیں۔ میں ان کو دنیا میں عینوں کے گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی! میں ان کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ جن بچوں کے والدین دنیا میں نہ رہیں۔ دنیا انہیں اپنے پاؤں تلے کچل ڈالتی ہے۔ اپنے ظلم کا نشانہ بنا ڈالتی ہے۔۔۔۔۔ یہ دنیا میں ظلم سمجھنے کیلئے کیوں زندہ رہیں؟

میری محسوم کلیو! میرے بہن بھائیو! میرے قریب آ جاؤ۔۔۔۔۔ ان دنوں میں تو میرے پاس رہو۔

روزانہ ڈائری لکھتی ہوں۔۔۔۔۔ ڈاکٹر سے چھپ چھپ کر۔۔۔۔۔

آدھی سے زیادہ ڈائری کھو گئی ہے۔۔۔۔۔

کاش! میں تندرست ہو جاتی۔۔۔۔۔ تو اپنی داستان خود لکھتی۔ مگر۔۔۔۔۔ اب نہیں لکھ سکتی۔۔۔۔۔ جو کھا تھا۔ وہ بھی آدھے سے زیادہ کھو چکا ہے۔ میرے مرنے



ڈاکٹر اشفاق روزانہ آتا ہے۔ کس قدر سنس مکھ اور ہربان ڈاکٹر ہے.....  
 بتی تلی ذیل سے..... مجھ سے کتنی کتنی دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے میرا  
 ملا ہے۔ وہ مجھے ٹھیک کرنے کا ہر ہر گوشش میں مصروف ہے۔  
 لیکن میں کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں؟..... میں اسے کیا بتاؤں..... کہ اختر کا غم  
 لگایا ہے۔ ایک مرنے غم دیا ہے اور دوسرا دم کو مندل کر رہا ہے.....  
 بن کون کامیاب ہوتا ہے۔ اختر کا غم بھاری رہتا ہے۔ یا ڈاکٹر اپنی گوششوں میں  
 اب رہتا ہے۔

ڈاکٹر مجھ سے کہتا ہے کہ اپنے دل کی ہیرات مجھے بتا دو۔ مگر کیسے بتاؤں؟...  
 میں نہ بتاؤں گی۔ اب یہ راز میرے منہ سے نہیں نکل سکتا۔ ہاں۔ اگر وہ میری یہ  
 ی پڑھے تو پڑھے۔  
 لیکن یہ بے ربط ڈائری..... کسی کو بھلا اس کی کیا سمجھ آئے گی؛  
 اور پھر اگر کسی کو سمجھ آجی گئی تو کوئی محسوس کرنے والا ہی محسوس کرے گا..... عام لوگ  
 کیا سمجھیں گے۔

کل یہاں ایک لڑکا آیا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ آیا تھا۔ اس کی بہن کی سہیلی  
 یہاں بیمار ہے۔ اسے دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ اس کی شکل بالکل  
 اختر سے ملتی ہے۔

اور میں اس کے جلنے کے بعد رات گئے تک روتی رہی۔ بغیر آنسوؤں  
 کے روتی رہی۔ اب میں آنسوؤں سے تو کبھی نہیں رو سکتی۔ اب بغیر  
 آنسوؤں کے روتی ہوں۔

شاید وہ کل پھر آئے۔ وہ ضرور آئے۔ میں اسے ضرور دیکھنا چاہتی ہوں

سینی ٹوریم میں بستر پر لیٹے لیٹے جب کھانسی کھانسی نہ ٹھہال ہو جاتی ہو  
 تو اٹھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ دور دور تک بے ہوش پر مریض پڑے ہوئے ہیں۔  
 کبھی کبھی سوچنے لگ جاتی ہوں..... کہ نجانے ان میں سے کتنوں کو دنیا  
 وجہ سے ملی ہوگی!!.....

پھر جی چاہتا ہے۔ ان سب سے ان کے حالات پوچھوں اور ان سب  
 لکھوں اور پھر دنیا والوں کے سامنے پیش کروں کہ دیکھو..... تمہارے ظلم  
 نشانے کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں۔

کیا پتہ ان میں سے کسی لڑکیوں کو محبت کی وجہ سے دق ہوئی ہو۔  
 کیا خدا ان سے خون کا بدلہ لے گا!..... ریوں کوئی کسی کو قتل کر دے تو  
 کی سزا دی جاتی ہے مگر اس طرح ہزاروں لوگوں نے ہزاروں لڑکیوں کو.....  
 کو ظلم کر کے اندر ہی اندر گھن لگا کر موت کے گھاٹ پہنچا یا ہوا ہے۔ ان کا بدلہ  
 نہیں لیا جاتا ظلم کرنے والوں کو سزا کیوں نہیں دی جاتی! یہ کیا انڈھا انصاف ہے!  
 اور خدا سارا کچھ دیکھتا ہے۔ اور چپ رہتا ہے۔ خاموش رہتا ہے؟

کہ میرا ایک بھائی بالکل میری طرح ہے۔ جتنی کہ اتنی شکل ملتی ہے کہ لوگوں کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس نے یہاں کیا کرنے آنا ہے؟

آج کا دن کتنی خوشی کا دن تھا! آج میں نے اپنی سہیلی نجمہ کو دیکھا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر رونے لگ پڑی۔ .... اس کے پاس ابھی آنسوؤں کا ذخیرہ موجود ہے۔ خدا کرے اس کی آنکھوں سے آنسو کبھی نہ بہیں۔ میری آنکھ سے اب ایک بھی آنسو نہیں نکل سکتا۔ وہ بہت دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔  
کتنی ہیراں ہے! کتنا افسوس کرتی تھی کہ متاری یہ حالت کیسے ہو گئی؟ اور میں نے اسے کہا۔ تین پھر بتاؤں گی؟

اور پھر کھانسی شہ روح ہو گئی۔ اور کوئی بات نہ ہو سکی۔ نجمہ روزانہ آتی ہے مجھ سے بات تک بھی نہیں ہو سکتی۔ وہ طرح طرح کی باتیں کر کے میرا دل بہلاتی ہے۔ ڈاکٹر سے باتیں کرتی رہی۔ مگر .... میں بھلا کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں؟

نجمہ نے بتایا کہ باجی کی شادی کے بعد اب اس کی شادی ہونے والی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میں جلد ہی اچھی ہو جاؤں تاکہ اس کی شادی میں آسکوں۔  
نجمہ کتنی بھولی ہے۔ بہت زیادہ!!

بھلا میں کبھی ٹھیک ہو سکتی ہوں!  
آج اس کے جانے کے بعد میں تقریباً نیم بے ہوش سی پڑی رہی اور یہی سوتی رہا۔ .... کہ ہم لوگوں میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے؟  
اُم نے کون سا گناہ کیا تھا۔ جس کی سزا یہ مل رہی ہے۔ کہ میں سینی ٹورم

آج اس کی بہن آئی ہے۔ مگر وہ نہیں آیا۔ کیا میں اس کی بہن سے پوچھوں؟ نہیں۔ میں کسی سے نہیں پوچھتی۔ میں کسی سے نہیں پوچھوں گی۔  
جب زندگی ختم ہو رہی ہو۔ اور موت کا سفر شروع ہونے والا ہو۔ تو بار باتوں سے کیا فائدہ؟

یہاں کے اکثر بیمار مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم کو ملنے والا کوئی نہیں آتا۔ اور میں ہنس دیتی ہوں۔ میں ان کو کیا بتاؤں؟ کہ مجھ سے ملنے کے لیے کسی نے آنا ہے؟ مجھ سے ملنے کے لیے تو اس جہاں میں پہنچ چکے ہیں۔ جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ .... اب ان سے ملنے کے لیے میں ان کے ہاں جاؤں گی۔ اختر کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ یہاں آئے۔ اے دنیا والو! میں بہت جلد تم کو الوداع کہنے والی ہوں۔ یہ بخار اور یہ کھانسی۔ یہ مجھے چند دنوں کے بعد ختم کر دیں گی۔ .... پھر میں آسمانوں کی طرف چلی جاؤں گی۔ نہ جانے دوسری دنیا کیسی ہوگی!

افسوس! ڈاکٹر اشفاق نے جس طرح میری تیمارداری اور خدمت کی ہے میں نے اس کا حق بالکل نہیں دیا۔ چند لمحوں کے لیے بھی دل سے غم کو دور نہیں کیا۔ میں اس کا ساتھ کیونکر دے سکتی ہوں؟ یہاں سے نکل کر میں اس بھری دنیا میں اور کہاں جا سکتی ہوں! .... لوگوں کے لیے بھری گھر میرے لیے خالی دنیا! پھر میں کیونکر اس سے تعاون کر سکتی تھی!؟

آج وہ لڑکی اور وہ لڑکا پھر آیا تھا۔ .... میں کب ل کی اوٹ سے کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ بالکل اختر کی طرح لگ رہا تھا۔ .... کہیں یہ اختر کا بھائی ہی تو نہیں ہے؟ .... اختر کہا کرتا تھا۔ ....

میں سسک سسک کر جان دے رہی ہوں۔ اور انہوں نے کون سی نیکی  
کی تھی۔ کہ امن۔ خوشحالی اور خوبصورتی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ اور اب  
اس کی شادی بھی ہوگی! یہ کس کا ماتھ ہے۔ جس نے اسے خوشی بخشی ہو  
ہے۔ اور ہمیں دکھ! .....  
اس راز کو کہاں سے پاؤں! .....

آج! میری حالت زیادہ خراب ہے۔ آج یوں لگتا ہے۔ جیسے زندگی  
آخری رات ہے.....  
کاش! میں اپنے بہن بھائیوں سے مل سکتی! پھر شاید میں مرنہ سکتی!۔  
کتنا اچھا ہو۔ جو میں مرنے سے پہلے بے ہوش ہو جاؤں..... میں  
یہ ڈائری وغیرہ بچہ کے نام کر کے اسے بھجوا دوں گی۔  
میرا دل ڈوب رہا ہے۔ اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں:

زادہ کی ڈائری پڑھنے میں اس قدر محو ہوئی تھی کہ مجھے وقت کا پتہ ہی نہ  
ہو..... اور جب میں نے ڈائری بند کر کے رکھی۔ تو میں پھوٹ پھوٹ کر  
لڑنے لگ پڑی۔  
اور پھر چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔  
مارے گھر والے اکٹھے ہو گئے تھے۔ پھر جب مجھے ہوش آیا۔ تو آخر میرے  
ہاں بیٹھا ہوا تھا.....

میں نے اسے دیکھ کر منہ نفرت سے دوسری طرف پھیر لیا۔ میرا جی پٹا  
ہو گیا اس شخص کو زندگی بھر نہ دیکھوں۔  
یہ آخر میرا منگیتر جس کے ساتھ میری منگنی دو سال پہلے ہوئی تھی.....  
نیشن سے آخر کا بیاہ نہ ہو سکا تھا..... نیشن کی ماں نے شادی سے چار  
پہلے وہ طوفان کھڑا کیا تھا۔ کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔  
جب میں زادہ کی ڈائری پڑھنے کے بعد بے ہوش ہوئی تھی۔ تو وہ ڈائری  
میرا لکھی پڑی رہ گئی تھی..... اور میرے بے ہوش ہونے کے بعد  
والوں نے اسے پڑھ لیا تھا..... آخر نے بھی پڑھ لیا تھا.....

اور اب وہ مجرم بنا بیٹھا تھا.....  
 سب گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی کسی کو کیا کہے؟  
 اور یہ آخر ہی تھا... جو سینی ٹوریم میں جاتا رہا تھا..... مگر افسوس کہ  
 زاہدہ سے بات نہ کر سکا.....  
 کاش! زاہدہ ایک بار اس سے بات کر لیتی۔

---

ویران جہزیے

آج اس شہر کو میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔

کہاں جا رہا ہوں؟ یہ میں ابھی آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ میرا سامان یعنی چمڑے کا ایک تھیلیا جس میں میری کتابیں بند ہیں میرے پاس پنج پر رکھا ہے۔ میں پنج پر بیٹھا، کسی دوسرے مسافر کے بہت بڑے مزدوق پر پاؤں رکھے سگریٹ سلگائے کراچی جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔ میری جیب میں تھوڑا سا کاس کا ٹکٹ ہے۔ میرے دل میں اُن دوستوں کے زخم ہیں جو مجھے چھوڑنے نہیں آئے۔ یہ لاہور اسٹیشن کا ایک پلیٹ فارم ہے۔ میرے قریب ہی ایک بزرگ تشریف فرما ہیں۔ انھوں نے کوئی کتاب کھول رکھی ہے اور بڑے انہماک سے اس کا مطالعہ فرما رہے ہیں۔ میں اس کتاب کے اوپر سے نظریں اٹھائے اس خوبصورت لڑکی کو دیکھ رہا ہوں جو اپنے کنبے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ماہان کے ڈھیر کے پاس نقاب اٹھائے بیٹھی ہے۔ وہ بھی کبھی کبھی اپنے اچکن پوش باپ کی نظر بچا کر میری طرف دیکھ کر تھوڑا بہت شرمیلیتی ہے کیونکہ آپ جانتے ہیں شرم ہماری عورتوں میں کوٹ کوٹ کر لہری ہوتی ہے اور یہ شرم عورتیں تو موقع ملنے پر بہت ہی شرماتی ہیں۔

میرا خیال تھا کہ میں اس شہر کے گلی کوچوں سے اس دن رخصت ہوں گا جس دن موسلا دھار بارش ہو رہی ہوگی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بارش نے دیر کر دی اور میری جدائی کی گھڑی آن پہنچی۔ ویسے یہ بارش کے دن ہیں اور میں نے کل دیکھا تھا کہ مال روڈ پر ساواری باؤس کے باہر ایک آدمی سویٹ پیر اور گلاب کے ڈبک بزنس خوشبو دار پھول بیچ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ باغوں میں پیڑوں پر پھول کھل رہے ہوں گے۔ کالے مینور سے بھی منڈلا رہے ہوں گے اور لاہور کی خوبصورت لڑکیاں بھی گشت لگا

ارے اوشکاری!

چھاتیوں کے سوا میرے سارے جسم کا گوشت لے کر مجھے چھوڑ دے۔

اتنا رحم کر،

میرا بچہ جو ابھی گھاس نہیں کھاتا، میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔

(ایک گناہ منسکرت شاعر)

رہی ہوں گی۔

لیکن مجھے اس سے کیا؟ میں تو آج یہاں سے جا رہا ہوں۔ کچھ کچھ نہ آنے کے لیے میں نہ ہوں  
ہوتے ہوئے کسی سے ہاتھ نہیں ملایا۔ کسی نے مجھے سینے سے نہیں لگایا کسی نے میرے سر پر ہاتھ نہیں پل  
کسی نے کانپتے ہونٹوں سے محبت کے دبول نہیں کئے چچی کے گھر سے میں روز کی طرح آؤں اور گرد  
کرنے پھیلانے کے باہر نکلا اور سیدھا سیشن پر آگیا۔ یہ شام کا وقت ہے۔ سماوار ٹی ہاؤس میں میر  
سارے دوست جمع ہوں گے۔ چائے کی گرام گرم غسل جی ہوگی۔ خوشبو دار چائے کے جوش میں بے سہ  
باتیں ہو رہی ہوں گی۔ جو وہاں نہیں ہوگا اس کی مخالفت ہو رہی ہوگی۔ جو بیٹھے ہوں گے  
ایک دوسرے کی خوشامد کر رہے ہوں گے۔ تعریفوں کے پیل باندھ رہے ہوں گے۔

”بس شعر تو تم پر ختم ہے۔“

”تنقید میں تمہارا کما حقہ آخر ہے۔“

”تم اس دور میں افسانے کے پیش امام ہو۔“

”تمہاری پینٹنگ دیکھ کر تو مجھے گوگین سے نفرت ہو گئی ہے۔“

”اور تمہارے ویکی کا تازہ ادارہ پڑھ کر تو میں پاگل ہو گیا ہوں۔ کیا دور کی کوڑی لاتے

میں اس پر ضرور ایک نظم لکھوں گا۔“

”پرسوں سہارے کا لچ کی لڑکیاں بار بار مجھ سے تمہارے ناولوں کے فن پر روشنی ڈالنے کو

میں۔ یا تم لڑکیوں میں بڑے پاپولر ہو۔“

کوئی دوسرے کی تعریف کرتے ہوئے اس میں سے اپنی برتری اور شائستگی کا پہلو نکال رہا ہوں

کوئی دوسرے کی مداح کرتے ہوئے میرے کی غیبت کر رہا ہوگا۔ کوئی ان لڑکیوں کے ساتھ

معاشقوں کی داستانیں بیان کر رہا ہوگا جو اسے کبھی نہیں ملی ہوں گی۔ کوئی ان اچھی تری باتوں میں

نہ ہو کر اپنے آپ کو صلح پسند اور دوست نواز ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ میرے چائے

ٹرے اٹھائے ادھر سے ادھر گردش کر رہے ہوں گے میں ان لوگوں کو روز مٹا تھا لیکن ان میں

کسی کو بھی میرا انتظار نہ ہوگا۔ اس کا تجھے افسوس بھی نہیں۔ کیونکہ میں نے بھی ان میں سے کسی کا کبھی

نہیں کیا میں بھی انھیں — ان ہی کی سکھلائی ہوئی خود پرستی اور ظاہر واری سے متا رہا ہوں

میں ایک دوسرے سے اس طرح ملتے رہے ہیں جیسے ہم نے ایک دوسرے کے بغیر قیامت کی رات بسر کی ہو۔  
نہ ہوا ہو کہ اس طرح بھول جاتے رہے ہیں گویا زندگی میں ایک دوسرے سے ملاقات ہی نہ ہوئی ہو۔  
سماوار ٹی ہاؤس — شہر کی مشہور سڑک مال روڈ پر ایک چائے خانہ ہے بلکہ اسے ایک ادبی  
نہ خانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہاں بیٹھنے والے ادبی مائٹوں پر ان ڈاکوؤں کا گمان ہوتا ہے جو لوٹا  
ہوا مال چھپا کر وہاں سے ہوئے بیٹھے ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہوں۔ میں اب اس  
ٹی ہاؤس کو صرف سماوار ہی کہوں گا۔ یہ نام کسی بڑے ہی ستم ظریف نے رکھا ہے کیونکہ یہ ان لوگوں پر بڑا  
ہلک بیٹھا ہے۔ سماوار کی طرح یہ لوگ بھی اندر ہی اندر ایک دوسرے کے خلاف کھولتے رہتے ہیں پکتے  
رہتے ہیں، منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں مگر کیا حال جو باہر سے پتہ بھی چل جائے۔ یوں تیلیس کھول کھولیں  
لے کر طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔

میرا اپنا بھی طرز عمل یہی رہا ہے اور اب تو اسی کی عادت پر گئی ہے۔ یہاں تک کہ میں نے جس  
لڑکے سے محبت کی ہے اس پلیٹ فارم پر بیٹھا کسی وقت اس کے خلاف بھی دل ہی دل میں باتیں بنانے  
لگا ہوتا ہوں۔ یہ جیسا زری اور دیا کاری یا تو ہم لوگوں نے سماوار سے لی ہے اور یا اس ہونٹ کو ہم نے عطا  
کے۔ اس کے جراثیم یہاں سے نکل نکل کر مال روڈ پر پھیلے رہتے ہیں۔ میں نے اکثر ان سڑک پر  
الٹے کے بیمار دیکھے ہیں۔

میرے دوستوں اور لاہور شہر میں گزرے ہوئے دنوں کے احوال تو آپ آگے چل کر پڑھ ہی لیں  
میں پہلے میں اپنا تھوڑا سا تعارف کروا دوں۔ میرے ماں باپ نے میرا نام علم دین رکھا تھا۔ جوان ہو  
کر مجھے معلوم ہوا کہ میرے پاس نہ تو علم ہے اور نہ دین۔ چنانچہ میں نے اپنا نام بدل کر خیار رکھ لیا۔ پہلی بات  
ایسے کہ یہ درخت پہاڑیوں کی بلندیوں پر آگتا ہے۔ اور میں ہمارے گھائیوں کا معمولی پتھر مونے کی وجہ سے  
ہڈلی چوڑیوں سے پیار کرتا ہوں۔ دوسرے درخت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یہ ہندو کے گھر میں آگے  
ہے مسلمان کے گھر میں آگے یہ درخت ہی رہے گا۔ کالی داس یا کریم بخش نہیں بنے گا۔ انسان تاریخ  
اور ہندو کا دھوکا دیتا آیا ہے۔ کبھی ہندو بن کر کبھی بن مانس بن کر اور کبھی انسان بن کر۔ اور ابھی کیا کیا ہیں  
لڑکے دھوکے دے گا اور دیتا ہی چلا جائے گا۔ لیکن درخت ہمیشہ درخت رہا ہے۔ اور درخت ہی

رہے گا۔

میری ماں میری پیدائش کے صدمے کی تاب نہ لا کر مجھے جنم دیتے ہی اللہ کو بیماری ہو گئی تھی بابر  
 ذرا سخت جان قسم کا آدمی تھا وہ مجھے بڑھا کھاکر دنیا داری کے سارے کاروبار ہی گر سکھا کر یہ بتا کر  
 کہ کہاں جھوٹ کو بیچ کر دکھائے کہاں سچ کو جھوٹ میں بدل دینا ہے میری والدہ سے جا ملا ہم لوگ گھر پہنچے  
 شہر میں رہا کرتے تھے میرا باپ لاہور سے بریوں میں کتابیں بھر کر لاتا اور بہت بڑے منافع پر وہاں سے  
 میں فروخت کیا کرتا تھا۔ وہ مذہبی کتابیں ادھار پر بھی دے دیا کرتا۔ ایسی حالت میں منافع دوگنا کروا جاتا  
 تھا۔ اس شخص نے گورداسپور میں سات مکان بنوائے۔ ہر مکان کا گریہ وصول کرنے وہ میلا سا کٹ بین کڑ  
 جایا کرتا اور گریہ داروں سے بڑی سختی سے پیش آتا۔ میرا بڑا بھائی بڑا عیاش آدمی تھا۔ اس نے ایک شادی  
 ماں باپ کی مرضی سے کی۔ اور دوسری شادی اپنی مرضی سے۔ یہ دوسری عورت امرتسر کی ایک طوائف تھی پہلی  
 بیوی کو بی بی ہو گئی۔ جیسا کہ ہمارے ہاں دوسری بیوی کے آجانے پر پہلی بیوی کو عام طور پر ہوا کرتا  
 ہے۔ وہ مرگئی بھائی صاحب نے ایک اور شادی کر لی۔ اب طوائف نے تھکندے دکھنا شروع کر  
 دیئے۔ اور ایک روز وہ ٹوہیر سارا زیور لے کر فرار ہو گئی۔ بھائی صاحب نے ایک بار پھر شراب اور زلیکا  
 بازی شروع کر دی۔ باپ کی وفات کے بعد انھوں نے ایک ایک کمرے کے ساتوں کے ساتوں مکان شراب  
 اور زلیکا بازی کی نذر کر دیئے اور جب بالکل تلاش ہو گئے تو ایک دن شراب کی پوری بوتل چلوا  
 کر کٹوئیں میں چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی۔

کاروبار کا دیوالہ پٹ گیا۔ میں کالج میں پڑھ رہا تھا۔ مجبوراً پڑھائی کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور  
 اپنی خالہ کے ہاں اٹھ آیا۔ خالہ بڑی نیک عورت تھی۔ نماز روزے کی بے حد پابند۔ دالان کتب  
 بیچ میں بیٹھ کر دھوکا کرتی اور نماز پڑھتے ہوئے برابر دیکھتی رہتی کہ گھر میں کون آ رہا ہے کون با  
 رہا ہے۔ خالہ کی دو لڑکیاں تھیں ایک چھوٹی اور دوسری بڑی۔ بڑی لڑکی کا نام بلقیس تھا۔ ویسے آ  
 میں رشتہ داری کا رشتہ رکھتے ہوئے دونوں لڑکیوں سے محبت کی پنچیں بڑھا سکتا تھا مگر میں نے بلقیس  
 منتخب کر کے اسی سے عشق شروع کر دیا۔ گھر میں عشق بڑے مزے کے ہوتے ہیں اور یہ ہم سب کا پسند  
 نوجوانوں کے لیے تو اکیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں نہ ہینگ لگتی ہے نہ پھنگ لگتی اور رنگ بھی خوب ہوتا  
 بڑی سے عشق کرتا دیکھ کر چھوٹی جلنے لگی۔ اس نے ہمارے خلاف محاذ بنایا۔ میں بڑا گھبراہٹ  
 بھانڈا نہ چھوٹ جائے۔ چھوٹی کو بھی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ مگر وہ جھاک میری باتوں میں اتنی

ایک روز میں اور بلقیس باہر کمرہ رہے تھے کہ چھوٹی لڑکی خالہ کو لے کر وہاں آن موجود ہوئی۔ خالہ نے وہیں  
 ہم دونوں کو بیٹھا شروع کر دیا۔ شام کو مجھے وہاں سے دیں نکالا لے گیا۔ میں اپنی چچی کے گھر چلا گیا۔ خدا کا  
 شکر ہے کہ چچی کی کوئی لڑکی نہیں تھی۔ وگرنہ ایک دن اس گھر سے بھی ذلیل و خوار ہو کر نکلنا پڑتا۔ کیونکہ عشتی  
 اس خاکسار کی گھٹی میں پڑا ہے۔

چچا ریلوے میں میرے لیے ملازمت کا بندوبست کر دی رہے تھے کہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور ایک دن  
 ہر باب لوگوں کو وہاں سے کوچ کرنا پڑ گیا۔ بٹالے کے قریب ہمارے قافلے پر حملہ ہو گیا۔ چچی کو لوگ اٹھا کر لے گئے  
 چچا بھی ہو گئے۔ راستے میں ان کی حالت خراب ہو گئی اور وہ لگے باڈر پر پہنچ کر کچھ انتقال کر گئے۔ بڑے نیک  
 آدمی تھے پاکستان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ ان کی آخری خواہش تھی کہ ان کا دم پاکستانی سرحد پر اپنی  
 ہی ملکیت کا جھنڈا دیکھ کر نکلے۔ خدا نے ان کی یہ آرزو پوری کر دی۔

میں لاہور آ گیا۔

لاہور شہر میرے لیے نیا نہیں تھا ہاں یہاں کے حالات مزور نہ تھے۔ پہلے کچھ دن تو میں مساجد میں کھپ  
 رہا۔ کیونکہ یہاں جو ہمارے دور کے رشتہ دار رہا کرتے تھے وہ فسادات کے ہنگاموں سے گھر کر اپنے  
 ایک اور دور کے رشتہ دار کے پاس ایبٹ آباد گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ساری گرمیاں پہاڑ کے صحت افزا  
 مقام پر اور میں نے ہماجرین کیمپ کے غیر صحت مند ماحول میں گزاریں۔ وہ لوگ جب واپس آئے تو ان کی  
 صحت پہلے سے بھی خراب تھی۔ کیونکہ انھیں چیرھ کے ٹھنڈے سایوں والے جنگلوں اور چمکیلی برف کی وادیوں  
 کی بجائے اپنے کاروبار کی تباہی کا غم کھاتا رہا۔ میرا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا گیا۔ ایک ایک کمرے کبھی  
 (اوسے جوان لڑکیوں کے — صدافسوس) بنگلے ہوئے۔ ایک ایک کی خیریت دیاخت کی۔ میں یونیورسٹی  
 لٹ بتاتا رہا کہ فلاں کو دیکھ اپنے ساتھ لے گئے، فلاں نے میرے سامنے دم توڑا، فلاں کو جب میں نے نفی  
 برائے نامی دیکھا تو اس کا حال بڑا پتلا ہو رہا تھا۔ یہ سن کر ان لوگوں نے تو بڑا استغفار شروع کر دی اور دل میں  
 بنگا پر کون اور سلامتی کی حالت پر خدا کا شکر ادا کیا۔

یہ کتبہ شہر کے ایک پرانے مسلمانوں کے محلے میں آیا ہوا تھا۔ صاحب خانہ جن کا نام ڈاکٹر عبد الواحد تھا۔  
 انہیں بھی کئے ڈاکٹر تھے اور وہ بھرپور سیوہجرت والی دکان میں میٹھے مکھیاں مارا کرتے۔ بڑھا یا شروع  
 انہیں کھانے کے بڑے شوقین مزاج تھے۔ جوانی میں دوستوں کے مال پر عیاشیاں کی تھیں اور اب دو برسے لڑکوں

کے پیسوں پر اپنی جوانی کی روایت کو نباہ رہے تھے۔ ان کی عیاشی اب صرف اپنے بڑے لڑکوں کے گھسے گدھے سوٹ پہننے اور مرغن بچوان بچوانے تک ہی محدود تھی۔ مرجھایا ہوا چہرہ صفا چٹ تھا۔ سر کے بال سفید تھے اور جھکے ہوئے جسم کی ہڈیاں چلتے ہوئے کھڑکھڑاتی تھیں۔ ہزار بیماریاں انھیں خود گئی تھیں۔ دکان کی نعت دوانا وہ خود مضہم کر چکے تھے۔ سر پانچ منٹ بعد پانی کے ساتھ کوئی پڑیا یا ٹنگل جانا ان کا محبوب شغل تھا جوڑوں میں ان کے درد رہتا۔ گردے ان کے روگ تھے۔ آنکھوں سے ہر وقت پانی بہا کرتا۔ سر کے بال کھو بیس کے عین بیچ میں سے بالکل ہی اڑ گئے تھے۔ ویسے تو یہ صاحب بڑے بھولے بھالے بن کر بیٹھے رہتے اور بات میں بچوں کی طرح معصوم بننے کی کوشش کیا کرتے۔ لیکن حقیقت میں یہ بڑے مکار، مطلب پرست اور خطرناک تھے۔ اس جنگلی بے کی طرح جو جنگل میں درخت پر بیٹھا رہتا ہے اور اچانک آپ کے سر پر حملہ کر دیتا ہے۔ روپیہ ان کا ایمان تھا اور اسے وہ ہر حالت میں حاصل کر لیتے۔ غیرت یا بے غیرتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک لڑکی منگھری میں ایک زمیندار سے بیاہی ہوئی تھی۔ آپ حنینہ حنینہ بھرواں جا کر رہتے خوب مرغ اڑتے اور واپس آتے ہوئے لڑکی سے سو بچا پس رو پے بھی لے آتے۔

گھریں وہ جس آرام کرسی پر آرام فرمایا کرتے۔ کوئی ملنے والا آتا تو اس کے ساتھ گھنٹوں مختلف امور پر باتیں کرتے۔ ہر بات میں وہ یونان کے ایک پینا توس نامی فلسفی کا حوالہ ضرور دیتے۔

بہی حال ہی میں میں نے پینا توس کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ یونان کا بڑا مشہور فلسفی تھا۔ عقائد ان کا شاگرد تھا۔ اس نے تو اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ چودھویں صدی میں ایٹیم بم ضرور بنے گا۔

”کیا نام تھا اس کا کار توس؟“

”پینا توس بابا۔ کمال کرتے ہو تم بھی۔ اچھا یہ بتاؤ تم نے بزرگ چہرہ کی شاہ طلسمات پڑھی ہے؟“

”نہیں؟ ارے بھئی ایران کا بڑا نامی گرامی جادوگر تھا۔ پینا توس کے بعد تو۔۔۔۔۔“

نماز انھوں نے کبھی نہیں پڑھی تھی اور محلے کی نماز کیٹی کے ملز تھے روزہ بیماری کا بہانہ بنا کر گزار جاتے اور گھر میں ہر آنے والے سے پوچھ لیتے کہ اس نے روزہ بھی کبھی رکھا ہے یا نہیں؟ انھیں ان بے تکلف یار ڈاکٹر ہوسو کہا کرتے۔ ڈاکٹر ہوسو کو ہوسو بیٹھی سے عشق تھا۔ رات رات گئے تک گرم خور و تنہا ہوں کا مطالعہ کرتے رہا کرتے۔ انکی ہر ب لگا کر بڑی احتیاط سے کتاب کا بوسیدہ ورق لٹکتے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر پڑھنے لگتے۔ بیچ بیچ میں کسی وقت سر کو جھک کر بول اٹھتے۔

”بات ہوئی ناں۔ یہ جرمنی کی قوم بھی کیا قوم ہے۔“

انگریزی انھیں بالکل نہ آتی تھی۔ وہ تو اکثر کہا کرتے تھے۔

”بھئی میں نے اردو میں ایم بی بی ایس کیا ہے۔“

ان کی بیگم بھاری بھر کم دھڑلے کی عورت تھی۔ بچوان پکانے کا اسے بھی بہت شوق تھا۔ کھڑے کھڑے زرد لک دم کر دیتی۔ ڈاکٹر ہوسو کو ہر بات پر جھاڑ کر رکھ دینا اس عورت کا محبوب شغل تھا۔ دو بڑے لڑکے تیار کرتے تھے۔ جھوٹی لڑکی نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی اور بڑی لڑکی سکول کی پڑھائی ختم کرنے کے لیے موزوں عاشق کی تلاش میں تھی۔ اس لڑکی کا نام زلفی تھا دراصل نام تو کچھ اور تھا۔ لیکن پیشانی پر لکھی ہوئی زلف سدا لگی رہا کرتی۔ اس رعایت سے بی بی نے اپنے آپ ہی زلفی نام رکھ دیا تھا۔

لڑکی کا نام اختر تھا۔ ان کے ساتھ اپنے معاشقے اور کارناموں کا ذکر تو آپ کو آگے چل کر ملے گا۔

بی بی آپ کو اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ ملاؤں۔

اب میں صنف واحد متکلم میں بات کرنا بند کر رہا ہوں۔ اور اپنی اس شہر میں گزری ہوئی زندگی حالات اس کہانی کے کہنے والے کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ سے میری بالمشافہ گفتگو ناول کے اختتام ہوگی۔ جب آپ مجھے لاہور سے رخصت کرنے سٹیشن پر لائیں گے آپ اتنی دیر کے لیے میری زندگی اطلاع کریں اور میں پلیٹ فارم کے اس پنج پر بیٹھا سامنے بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکی کا مطالعہ کرتا ہوں لڑکی بھی کراچی جا رہی ہے تو سفر خوب کئے گا۔ ہاں بھولے گا نہیں۔ میرا نام چنا ہے۔ مجھے لڑکی کا گھمبیر، خود غرضیوں، دکھوں اور نوج کھسوٹ سے بھری ہوئی ہما بھی میں پہچان لیجئے گا۔

لکھنا میں بیان کرنے والے سے درخواست کروں گا کہ وہ میری لاہور والی زندگی کی داستان کا آغاز غدار سے والی پلنگ پارٹی سے کرے۔



ہم لم تہنگ بے دھنگے اور دہانے چورے ہیں۔ لڑکیوں کے لباس بھی چست ہیں۔ کمر سینہ اور کولہوں پر بنیں بری طرح پھنسی ہوئی ہیں۔ بال تقریباً کبھی لڑکیوں نے کٹوا رکھے ہیں۔ کسی کے بالوں کا فیشن ایسی ایکٹریس یا اردو سے تو کسی کا حکم ایران سے ملتا ہے۔ انھوں نے بھڑکیں تیکھی بنوا رکھی ہیں۔ ہونٹوں پر رنگ کی گہری تہہ چڑھی ہے اور کپڑوں پر عطر کی پوری کی پوری شیشی انڈیل رکھی ہیں۔ یہ آپس میں بڑی بے باکی سے باتیں کرتے ہیں اور کسی بات پر بھی شرماتے یا جھجکتے نہیں۔

رومی نے گراموفون پر کسی انگریزی دھن کا ریکارڈ لگوا دیا ہے۔ اب ایچی اور نچی کونسی کرتے گئے ہیں۔ اور عطر عمر کے آدمی نے انھیں روک دیا ہے۔

سب سے یہ شاہد رہے ہیں۔ یہاں لوگ جمع ہو جائیں گے۔ پلیز بے بی۔

بے بی منہ بنا کر امی سے الگ ہو گئی ہے۔ یہ سب لڑکے لڑکیاں انگریزی سکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ یہ مسلمان گھروں میں پیدا ہوئے ہیں لیکن کسی طرف سے بھی مسلمان معلوم نہیں ہو رہے۔ یہ آنکھیں بند کر کے زلفز انگریزی بولتے ہیں اور منہ کھولی کر اردو بولنے والے کو تھکنے زدہ جاتے ہیں۔ اردو زبان اور اردو لباس کو یہ مولویوں کا درد خیز خیال کرتے ہیں۔ انھیں اگیتھا کرسٹی، پیٹر جینی اور گھٹیا قلم کے امریکی فنی ادب جاسوسی ناولوں کے کھڑے کھڑے ازبیر ہیں۔ لیکن اقبال، غالب، کرشن چندر یا پریم چند کا نام سے بالکل نا آشنا ہیں۔

ایچی ایچی اس منٹلی میں ایک دبلا پتلا سانو جوان آیا ہے جس کا ان لوگوں نے بڑی گرم جوشی سے توجہ دیا ہے۔ اس نوجوان کا نام ویسے تو علم دین تھا۔ لیکن علم اور دین دونوں سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اس شخص نے نہایت ایمان داری سے اپنا نام چنار رکھ لیا ہے۔ چنار کو اس محفل کے لوگ مسٹر بکا کہا کرتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ہم بھی اب اس نوجوان کو چیری کے نام سے ہی یاد کریں گے۔ بکا کا عمر بیس سال کے لگ بھگ ہے۔ گہری سیاہ آنکھوں میں بڑی تیز چمک ہے۔ بال سیدھے ہیں اور بالکل پوزڈ اور ذرا سفید ہو گئے ہیں۔ آواز بھاری سنجیدہ اور بچال میں تساہل اور خود اعتمادی کا لطیف اختلاط ہے۔ ہڈیوں کی کشش کے ساتھ اس نے ورلڈ کی گرسے پتلون اور آسمانی رنگ کی نصف آستینوں والی شلوار پہنی رکھی ہے۔ چہرے پر چمک ہے اور کپڑوں سے فارول سینٹ کی جھینبی جھینبی خوشبو اٹھ رہی ہے۔ اور عطر عمر کے آدمی نے سکا رسکا کرتے ہوئے کہا۔

پکنک پارٹی والی وہ سہ پہر بہت ہی خوبصورت تھی۔

کچھ لڑکے اور لڑکیاں مقبرہ جہانگیر کے ایک عقبی پلاٹ میں درختوں کے درمیان گھاس پر تالی کا ایک ٹکڑا بچھائے بیٹھے تھے۔ کوئی انکی کریم اٹار رہا تھا کوئی اور سچ کی بوتل ہاتھ میں لیئے کسی لڑکی سے تالی کر رہا تھا۔ ایک اور عطر عمر کا آدمی اپنی بھول جیسی پیاری بچی کو گھاس پر لٹائی تھا مے چٹا سکھلا رہا تھا اور شرم چا رہا تھا۔ اگرچہ گرمیوں کا موسم تھا مگر فضا بڑی خوشنودار تھی۔ سورج کو بادلوں نے چھپا رکھا تھا۔ اور دریا نے لڑا کی طرف سے بڑی ٹھنڈی اور طوب ہوا کے جھونکے چلے آ رہے تھے جن میں دریائی سرکنڈوں اور دیگر والے درختوں کی گیلی گیلی مہک تھی۔

ایک کٹے ہوئے بالوں والی لڑکی باسکٹ میں سے تھروں نکال کر بیالوں میں گرم جائے انڈیل رہی تھی۔ ایک لڑکا پاس ہی بیٹھا اس کے جھجکے ہوئے خوبصورت جسم کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”روحی تمھیں شرم آئی چاہیے۔“

”نشی آئی تو یو۔“

”شٹ اپ۔“

رومی قہقہہ لگا کر ہنستا ہے۔ یہ ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کے کزن یعنی ایسے رشتے دار جو وقت بڑنے پر کہیں بھی رشتہ استوار کر سکتے ہیں۔ ان میں کوئی روحی ہے تو کوئی نشی۔ کوئی ایچی ہے تو کوئی نجی۔ کوئی آنٹی ہے تو کوئی سسر۔ کسی نے امریکی کاٹ بوائے کا لباس پہن رکھا ہے۔ کوئی ٹی شرٹ پہنے ہوئے ہے اور کسی نے جیت تیلون یعنی جینز زیب تن کر رکھی ہے۔

”چیری ہم تمہیں بس کر رہے تھے۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟“

”ہم نے سوار میں رنگ بھی کیا تھا۔“ نیلی آنکھوں والی نجی تے بڑے دل ربا انداز میں آنکھیں جھپکاتا کہا۔ وہ چیری کے خوبصورت کپڑوں، دلکش گہری سیاہ آنکھوں کی چمک اور اس کے بدن سے اٹھنے والی غارول کی ہلکی ہلکی ٹھنڈی خوشبو سے بہت متاثر تھی اور ان چیزوں کی وجہ سے چیری کو لائیک یعنی پسند کرنے لگی تھی۔ چیری بھی نجی کو اس کی نیلی آنکھوں، بھرے بھرے کونوں اور دلگداز بازوؤں کی وجہ سے بہت لائیک یعنی پسند کرتا تھا۔ وہ کبھی بار ایک دوسرے سے لکھا رحبت کر چکے تھے اور کبھی بار ایک دوسرے کا منہ چوم چکے تھے۔ نجی نے جب اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر دیر سے آنے کی وجہ پوچھ تو چیری مسکرایا۔

”میں راوی میں بوٹنگ کر رہا تھا۔“

نجی کو یہ بات بڑی بری لگی کہ وہ جس آدمی سے محبت کرتی ہے وہ پکنک میں اس کے ساتھ شامل ہونے کی بجائے اکیلا ہی راوی میں بوٹنگ یعنی کشتی رانی کرتا رہا تھا۔

”لیکن ہم یہاں تمہارا انتظار کر رہے تھے۔“

چیری ذرا سا مسکرایا۔ اس نے نجی کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور گھاس پر بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔

”ہائی چیری!“

اجی نے پیچھے سے آکر چیری کے شانے پر زور سے ہاتھ مارا۔

”ہائی امی!“

اتنا کہ چیری پھر سگریٹ بنانے میں مشغول ہو گیا اتنے میں نشی نے امی کو دور سے آواز دیا وہ گھاس پر رومی کے ساتھ دوڑ لگا رہی تھی۔ امی یا ہو کا نعرہ لگا کر نشی کی جانب بھاگ اٹھا۔ نجی کا ادھیڑ عمر کا باپ جو ریلوے میں انجینئر تھا ذرا پرے درخت سے ٹیک لگاٹے اپنی عیانی ہوا کے ساتھ بیٹھا اور نجی پیٹتے ہوئے رمی کھیل رہا تھا۔

”تم مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتے۔“ یو آر اے فول۔“

نجی نے اتنا کہ کہ منہ دوسری طرف کر لیا۔ چیری سگریٹ سلکا کر کش لگا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں سبزے کی ہلک، دریا کی طرف بے آنے والی ہوا اور دنیا کو کی خوشبو نے اسے ان لوگوں سے

نہ دور کر رکھا تھا۔ پھر بھی چونکہ آدمی بڑا ہوشیار تھا۔ نجی کی بات پر بولا۔

”دنیا میں صرف بیوقوف ہی محبت کر سکتے ہیں نجی۔ یہی وجہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“

”تم جھوٹے ہو۔ اگر محبت ہوتی تو دریا پر جانے کی بجائے سیدھے یہاں آتے۔“

”مجھے دریا سے بھی محبت ہے۔“

”شٹ آپ۔“

”ڈنڈر فل۔“

میں اب تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔ امی مجھ سے اتنی محبت کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے اسے صرف باری خاطر کبھی لفٹ نہیں دی۔ اور تم ہو کہ مجھے ہمیشہ تنگ کرتے ہو۔

”اگر تھوڑی سی امی کو بھی لفٹ دیدو تو آخر کیا حرج ہے؟ بڑا سمارٹ لڑکا ہے۔“

”اٹی سے شٹ آپ۔“

”مارے پرسوں تمہارا برقعہ ڈالے ہے۔؟“

”نہیں اس سے کیا؟“

”میں تمہارے لیے بہت اچھا پریذینٹ لاؤں گا۔“

کیلا ڈالے؟ نجی نے خوش ہو کر کہا۔

”میں خود آؤں گا۔“

بلیئر مذاق نہ کرو۔ بتاؤ تمہارا کیا پریذینٹ لاؤ گے؟“

”آپ پرسوں خود ہی دیکھ لینا۔“

اتنے میں درخت کے اوپر کوئل کی کوک سنائی دی۔ چیری کا دل اس کی آواز پر ایک استغابی خوشی سے لرزے ہو گیا۔ اس نے سگریٹ منہ میں لینے ہی لیے آنکھیں بند کر لیں اور چہرے پر گہری خاموشی اور اتھاک کا ماحول چھا گیا۔ نجی اس کی ان باتوں سے بری چڑھتی تھی۔ وہ غصے میں اٹھ کر چلی گئی اور سامنے والے پائیلن باکرہ چیری کو جلانے کے لیے امی کے ساتھ مل کر کھیلنے لگی۔ چیری نے ذرا آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کی دل میں ہنس پڑا۔ اسے یہ سب لوگ کٹھ پتلیاں سی لگیں جو کسی چھپے ہوئے ہاتھ کے اشاروں کے تحت اپنے آپ ہی ادھر ادھر حرکت کر رہی ہوں۔ اگر کسی وجہ سے ڈوری ٹوٹ جائے تو بے جان ہو کر

گر پڑی گی۔

نجی کی ساگوں پر بڑھی رونق لگی تھی۔

بچے سہل کمر ہی ہو نجی۔

کیسی بھکی بھکی باتیں کمر ہے ہو۔

کم اڑن ڈارنگ۔

اور چیری ایک بار پھر نجی سے لپٹ گیا۔ نجی کے بدن میں گرم خون نے اُن گنت پوشیدہ امنگوں  
اگر دیا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو کر تپنے لگے۔ لیکن جیسا کہ اس قسم کی لڑکیاں ہمیشہ اپنے جذبات  
پہن میں اور اتنی آسانی سے بہک نہیں جاتیں، نجی نے بھی فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور چیری کو ذرا  
دیکھ کر دیا۔

بلیز ڈارنگ۔

نو نو چیری۔ یو آراے فول۔

چیری نے بھی شیشیل آواز اور عاشقانہ لہجے میں نجی سے اظہار عشق شروع کر دیا۔

تم دنیا کی پہلی عورت ہو نجی۔ میں دنیا کا پہلا مرد ہوں۔ ہم دونوں پہلی بار اس جنگل کے  
رے میں مل رہے ہیں۔ تمہاری نیلی آنکھوں میں سمندر ہے اور میری کالی آنکھوں میں تاریک راتوں  
الہ آوازیں ہیں۔ بہرا ملاپ قدرت کا بہت بڑا منشا ہے۔ ہمیں قدرت نے آج کی رات ادا  
ہے۔ اگر تم نے اپنا حساب بے باقی نہ کیا تو کل دن کی روشنی میں ہم قدرت کو کیا جواب دیں گے؟  
نجی! میں تمہارا عاشق ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

نجی نے سر پیچھے ڈال رکھا تھا اور وہ اسے نیم جاں مچھلی کی طرح ادھر ادھر ہمارہی تھی۔ اس نے  
سے چیری کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نو نو چیری۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔

یہ محبت کی گھڑی ہے نجی۔ رات دوڑی چلی جا رہی ہے۔ آؤ! اس تاریک ویلے میں ایک  
لایے آرزوؤں کے چراغ روشن کہیں نجی۔ ڈارنگ۔۔۔۔۔

نجا ایک دم تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

پہلے مجھ سے شادی کرو۔

چیری نے ایک گہرا سانس لیا اور درخت سے لگ کر اندھیرے میں ہی سگریٹ بنانے لگا۔ اسے یوں

نجی کا گھر یعنی کوٹھی سے بیوگا روڈ کے عقب میں واقع تھی۔ چھوٹی سی کوٹھی تھی جس کی کھڑکیوں  
پر گلابی پھولوں والی ولایتی سیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ برآمدے کے ستونوں پر بجلی کے مقنوں کی رنگین  
لڑیاں جھنگا رہی تھیں۔ بڑے کمرے میں مہانوں کا جھوم تھا۔ فضا روشنیوں سے بھرپور تھی۔ قہرتم  
کے سینٹ کی خوشبوؤں سے ہوا بوجھل ہو رہی تھی۔ نجی نے بڑا عجیب رکھا اور جیت لباس پہن رکھا تھا۔ وہ اتنی  
خوبصورت اور صحت مند دکھائی دے رہی تھی نیلی نیلی آنکھوں میں ہلا کی چمک آگئی تھی۔ چیری اندر داخل  
ہوا تو اسے دیکھ کر نجی نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور دوسرے ہاتھ سے تجھے کا ڈبہ سنبھال لیا۔  
نجی نے فوراً ڈبہ کھول دیا۔ وہ سفید موتیوں کی مالا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

چیری تم کتنے سویت ہو۔

ایہی جو قریب ہی کھڑا تھا نجی کی اس بات پر جھل اٹھا۔ مگر کیا مجال جو اس کے چہرے کا سیکڑا  
میں ذرہ ہلکا بھی فرق آیا ہو۔ اس رات دوسرے مہانوں نے تو چائے اور سرد مشروبات نوش جان  
کیے مگر ایہی، نجی اور چیری نے دائن پی۔ جب ساگوں کا ہنگامہ ختم ہوا تو یہ لوگ ایسیری وائے کے سر  
میں سرشار تھے۔ ایہی فنی کو لے کر اور چیری نجی کو لے کر کوٹھی کے عقی باغ میں پہنچے تھے۔ یہاں اندھیرا  
چھایا ہوا تھا اور کھڑکیوں میں سے آنے والی روشنی صرف دور ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔ ایک بار  
یو کلیٹس کے درخت کے قریب سے گزرتے ہوئے نجی کو اندھیرے میں منہ چومنے کی آواز سنائی دی۔  
سمجھ گئی کہ ایہی اور فنی قریب ہی بیٹھے ہیں۔ چیری کو یہ آواز بے حد پیاری لگی۔ اس نے نجی کی کمر  
بازو ہٹ کر دیا اور اسے ایک دوسرے درخت کی اوٹ میں لے گیا۔ دونوں وائے کے سرور  
ڈوبے ہوئے تھے۔ دونوں کے دل خوشی کی آتھ اور شیریں لہروں پر بہن توارکتیوں کی طرح ڈوا  
رہے تھے۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے جذبات سے پوری طرح باخبر تھے اور ایک دوسرے  
کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔

(اندھیرے میں آتے ہی چیری اپنی محبوبہ یعنی نجی سے لپٹ گیا اور بار بار اس کا منہ چومنے لگا۔)

آپج۔ تم میرا ایک آپ سہل کمر رہے ہو چیری!

لگا جیسے پیرس کی ٹائٹ کلب میں بیٹھے بیٹھے وہ اچانک گوالمنڈی کی گلیوں میں آنکلا ہو کر یس کی لڑکیاں محبت کی تکمیل کے لیے شادی کا پاسپورٹ حاصل کرنا ضروری خیال کرتی ہیں۔ رومان لڑنے میں یورپ کا ایک برسوں کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں لیکن ایک خاص حد سے ذرا آگے بڑھتے تو فوراً مشرقی عورتوں کی طرف سٹ کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ساری یک یک محض اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ انہی سے محبت کرنے کا یہ بے باک انداز اپنی عیسائی ماں سے لیا ہے اور شادی کا دنیاوی تخیل اور عصمت کا تصور اس نے باپ سے پایا ہے۔ چیری کو اس بے ہنگم ملاپ پر سخت غصہ آنے لگا۔ گوالمنڈی اور کایہ امتزاج اسے عجیب مضحکہ خیز محسوس ہوا۔ آدمی یا تو گوالمنڈی میں رہے اور یا پیرس میں۔ یہ عجیب بات ہے کہ پیرس کا ڈزرسوٹ پہنے آدمی گوالمنڈی کی گلیوں میں گھوم رہا ہے اور گوالمنڈی کی پگڑی اور تھمد باندھے پیرس کی ٹائٹ کلب میں بیٹھا ہے۔

”تنی پڑھی کھی ہو کر بھی تم شادی سے پہلے کی شادی پر یقین نہیں رکھتیں؟ کتنی اچھا بات ہے کہ تم ایک ایسے شخص سے اپنا آپ چر کر رہی ہو جو تم سے محبت کرتا ہے اور ایک ایسے بیوقوف کے لیے اس کی حفاظت کر رہی ہو جس سے تم کبھی محبت نہیں کر سکو گی۔ جو تمہارے لیے بالکل اجنبی ہو گا۔ جو تم سے بالکل ایسا ہی سلوک کرے گا جو ایک بھوکا آدمی کھانے کی میز پر کرے گا۔ نجی ڈارلنگ! شادی اور یہ زمانہ جہالت کی دانشمندی پانہ ہو چکی ہیں۔ تم ایسی عورتوں کو کیا کوئی جو شادی کے روز تک با عصمت رہتی ہیں لیکن شادی کے بعد دوسرے مردوں سے محبت کی پیٹنگیں بڑھانا شروع کر دیتی ہیں؟ کیا ان سے وہ عورتیں بہتر نہیں ہیں جو شادی سے پہلے ہی بھر کر عشق بازی کرتی ہیں۔ لیکن شادی کے بعد صرف اپنے خاوند کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ نیچر کے ہاں ایسا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں اس کے اصولوں میں کہیں شادی کے جہلانہ بندھن کا سراغ ملتا ہے۔ وہ آزاد ہے اور ہر شے کو آزادی اور بے نیازی کا درس دیتی ہے۔ یہیں ان زنجیروں کو توڑ کر نیچرل فضا میں صرف محبت اور محبت کے لیے زندہ رہنا چاہیے۔ یہ کیا کوئی ہے کہ ایک عورت عمر بھر کے لیے ایک ہی مرد کی ہو کر رہ جائے خواہ وہ گنہگار ہو، گنہگار ہو، کانہ ہو، لنگڑا ہو۔ یہ زندگی کو نفی کرنے والا فعل ہے اور جو چیز زندگی

نفی کرے وہ غیر قدرتی ہے۔ تکلیف کا باعث ہے اور زندگی کے میدان میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے، کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ ہر مرد کی آواز ہے ہر خاوند کی آواز ہے لیکن ہم لوگ نام نہاد مجلس نظام کی اخلاقی زنجیروں میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ دل کی بات زبان پر نہیں لا سکتے۔ ہم نے اپنی ہر زنجیر پر سونے کا پتھر چڑھا کر اسے بڑے بڑے دلغیب نام دے رکھے ہیں۔ مثلاً شادی، اولاد کی محبت، بیوی کی محبت — میں ان سب باتوں سے آزاد ہو کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان تمام زنجیروں کو توڑ دیا ہے۔ میں تم لوگوں کے بنائے ہوئے کسی اخلاقی ضابطے کو تسلیم نہیں کرتا۔ تم سب لوگ ڈرپوک ہو۔ بزدل ہو۔ دوسروں سے نہیں لپنے آپ سے ڈرتے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے؟“

چیری نے آگے بڑھ کر نجی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نجی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ چیری نے اس کا ہاتھ جھٹک کر زور دیا۔ سگریٹ گھاس پر پھینک کر پاؤں تلے روندنا اور اپنے مخصوص انداز میں چلتا ہوا کوٹھی سے نکل گیا۔ نجی کو وہ اندھیرے میں تھوڑی دیر تک دکھائی دیا پھر وہ غائب ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد باہر ہرنگ پر رات کی خاموشی میں چیری کے جوتوں کی آواز سنائی دی اور پھر آہستہ آہستہ رات کے ستارے اُلم ہو گئی۔ نجی کچھ دیر تو چپ چاپ سی ہو کر کھڑی رہی۔ اس کے بعد اس نے اپنا لباس درست کیا۔ لاہر ہاتھ پھیرا و مال سے ہونٹوں کی لپ شک کو ٹھیک کیا اور اپنے کمرے کی طرف آگئی۔ وہ چیری کی داس سے مرعوب ضرور ہو گئی تھی اور اگر اس وقت وہ نجی کا ہاتھ نہ جھٹکتا تو شاید اسے اپنی آغوش بالکل بے بس پاتا۔ کیا عجیب انسان ہے اس کی باتوں میں کس بلا کی کشش ہے۔ نجی کا دل اس ایک ایک بات پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا ذہن اسے اس کی ہر بات کے خلاف برسر پیکار کر رہا۔ بس پونڈ ذہن! بہر حال وہ چیری کی باتوں کو احمقانہ سمجھتی تھی اور مشرقی روایات اور اخلاق کے ضابطوں قائم تھی اور اسی پر قائم رہنا چاہتی تھی۔

ہر زمانے میں گیت لکھا کرتے تھے بھاری بھر کم ہیں۔ مگر دن بیل کی مانند موٹی تازی ہے۔ سر پر پاؤں  
 نا چنگل اگلا ہے۔ عمر چالیس کے قریب ہے۔ بڑے کند ذہن، غبی، اور سنگ دل ہیں۔ بیوی کو طلاق  
 کر کے دو دنوں بڑے حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔  
 لڑی اور ایرانی ادب کے مصنفوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس طرح کوئی لوہا اپنے اوزاروں کا  
 کرتا ہے۔ عین غفل میں رومال ناک پر رکھ کر اس زور سے ناک صاف کریں گے کہ معلوم ہوگا کسی  
 باقی لاری کا بارن نکالنا ہے، میرا بائی، کبیر اور سلطان باہو کے اشعار بڑی رقت پیدا کر کے نکلیں  
 کر کے گنگنا لیں گے جس طرح کوئی ہٹا کٹا فقیر جھوٹ موٹ آنسو بھر کر حضرت امام حسین کی شہادت  
 نصیحت بیان کرے اور لوگوں سے پیسے بٹور لے۔

مشرقی کولائیں۔ آپ کھاتے پیتے گھراتے سے ہیں اور اسے خوب کھانی رہے ہیں۔ چال و حال  
 اتنی ہے لہجہ امریکیوں جیسا ہے چہرہ افریقیوں کی یاد دلاتا ہے اور تصویریں فرانسیسیوں کی نقلی  
 بناتے ہیں۔ سر پر کالے بال لہریا لے ہیں اور بناوٹی معلوم ہوتے ہیں۔ درمیان سے مانگ نکالتے  
 کار نہیں ہے لیکن کار کی باتیں بہت کرتے رہتے ہیں۔ اس ہنوس کے ہلاوے کے لیے چابیوں  
 پھلاتا تھا میں نے ہر وقت گھماتے رہتے ہیں۔ تصویریں روغنی بناتے ہیں اور جدید ترین آرٹ  
 کام لیتے ہیں جس میں صرف ہاتھ سے کام لیا جاتا ہے۔ دماغ سے پاکل نہیں۔ اگر اتفاق سے  
 نقل پڑتی بن جائے تو اس کے سر پر سینگ بنا کر نیچے لکھ دیتے ہیں۔ "سورت غسل خانے میں"  
 لاسر کے بال بڑھا لیتے ہیں کبھی ڈاڑھی رکھ لیتے ہیں اور پھر منڈوا دیتے ہیں۔ ویسی گھی اور ویسی فلموں  
 ، منت نفرت ہے صبح پیڑ کھاتے ہیں اور رات کو راک اینڈ رول کی امریکی فلمیں دیکھتے ہیں۔  
 دل پر لیلے اور نامی سٹیل آپ کے پسندیدہ گاسیک ہیں۔ مسٹر ابلق کے منہ سے میرا بائی یا کبیر داک  
 بھی سننا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ اگر کبھی کان میں ان کا کوئی دو ہاڑ جاسے تو دیاسلائی کان میں  
 لہر کر کان کا برا حال کر لیتے ہیں۔

ابلیق تم موچی دواڑے کے پہلوان ہو۔ تم لوگس ہو اور تمھارے یہ مسٹر بگت کبیر  
 اور مس میرا بائی دونوں لوگس ہیں۔  
 ابلیق میز پر سگارا کر رہا ہے۔

سامواری اڑیں کا شمار شہر کے بہترین چائے خانوں میں ہوتا ہے۔

پچھلا فرش، ڈسٹپر کی ہوئی دیواریں، عاقبت مسکھری میزیں، باوردی بیرے، خوشبو دار تازہ چکی ہلے  
 اور مناسب دام۔ لیکن یہاں بہت ہی کم ایسے گاہک آتے ہیں جو کہیں کام پر جاتے ہوئے یا کسی کام سے  
 واپس آتے ہوئے محض گھر لسی دو گھر لسی سستانے کی خاطر یہاں بیٹھ کر چائے سے لطف اندوز ہوں  
 حقیقت میں یہ جگہ عادی چائے پینے والوں باتیں کرنے والوں، شعر سنانے والوں، ادب کے تالاب  
 گوشتا کرنے والوں اور جی بھر کر بور کرنے والوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ لوگ ٹولوں  
 کی صورت میں یا ایک ایک دود کو کے سرخام آتے ہیں اور جب سماوار کا پیچر ہوٹل بند کرنے  
 لگتا ہے تو ہنسی یہ لوگ باہر نکلتے ہیں۔ ان میں شادی شدہ بھی ہیں، بیوی کی جستجو میں ٹھوکریں کھانے  
 والے بھی ہیں، کبھی نہ لی ہوئی محبوباؤں کی یادیں آئیں بھرنے والے بھی ہیں، ماں باپ کے سر پر سوار ہو کر  
 زندہ رہنے والے بھی۔ بہنوں کے گلے توڑ کر پیسے لانے والے بھی ہیں، کابل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہوشیار  
 بھی ہیں اور سینکڑوں۔ ہیں کہ ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ نقاد ہیں، شاعر ہیں، افادہ نگار ہیں، پیڑھی ہیں، لو  
 ہیں، بچوں کے باپ ہیں اور چند ایک محض سامعین ہیں۔ یہاں باتیں بنانے والے ہیں تو باتیں سننے  
 والے بھی ہیں۔ ان کا کام ہمہ تن گوش ہو کر محض باتیں سنتے چلے جانا ہے کچھ تپے پڑے یا نہ پڑے  
 اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو صرف تروید کرنا جانتے ہیں۔ ہزبات کی تروید کیا  
 گئے اور عجوبات سمجھ میں بالکل نہ آئے اس کی تروید تو یہاں بڑے زور شور سے کی جاتی ہے۔  
 مثلاً مسٹر ابلق ہیں، ایک کالج میں اردو پڑھاتے ہیں۔ انگریزی، فارسی اور اردو ادب سے بڑا کھانا

”تم دل آدمی ہو سینیکی ہو تمہیں اپنے کچھری، اپنی پڑوسی کی کیا خبر؟ تم پیر کھاؤ اور راک  
اینڈ رول کرو۔“

مستر جی کو لاکھ شکل کو کو لاکھ بوتل سے بڑی ملتی جلتی ہے۔ لیکن جی کو لاکھ کو کو لاکھ بالکل نہیں۔ گرمیوں میں وہ بیہوش کی ایک بوتل پی کر کپڑے اتار دیتا ہے اور کمرہ بند کر کے سٹول پر بیٹھ کر تصویر بنانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اس طرح سکون ملتا ہے۔ ابلق کا خیال ہے کہ اگر وہ گرمیوں  
ننگا رہنے کے بجائے بازار میں بھی آجائے تو اس سے بہتر تصویریں بنا سکتا ہے۔

اس منڈی کے شاعر کا نام مسٹر بورکی ہے۔ مسٹر بورکی غزل کے شاعر ہیں۔ چہرے سے بے رہن  
معلوم ہوتے ہیں۔ موٹے اور بھدے خدو خال۔ کچھوے ایسی جال، چھوٹے بازو، کچھ سے بچھے ہاتھ، چوڑا  
رومال چھوٹے سے ٹوے میں رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا سر صرف قراقری کی ٹوپی پہننے کے لیے اور انھیں  
صرف عینک لگانے کے لیے بنائی ہیں۔ ذہن کا غبی بن ان کے چہرے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے شاعر  
کی پوری ٹولی بنا رکھی ہے جو انھیں ہوٹل میں آتا دیکھ کر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک لڑکی  
سے پاک محبت کرتے تھے لڑکی ایک ناپاک محبت کرنے والے کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی یادیں پورے  
چھ غزلیں کہیں اور چھ ہزار بار لوگوں کو سنائیں اور ابھی تک سن رہے ہیں۔ کمری پر دہلاؤ کی طرز  
جم کر بیٹھتے ہیں۔ کیا مجال جو ذرا بھی ہل ہلا جائیں۔ دور سے بالکل مینڈک دکھائی دیتے ہیں۔ غزل  
مزاج نہیں پایا مگر عرصہ بارہ سال سے غزل کہہ رہے ہیں شعر سناتے وقت آپ انھیں کہیں یا نہ کہیں  
وہ ہر شعر کو دو بار ضرور سنائیں گے اور اگر آپ نے کہیں جھوٹے سے بہت خوب ”کہہ دیا تو پھر سناؤ  
بکس کی سوٹی اسی ایک شعر پر انگ جائے گی۔

مستر چاکلیہ ہیں، چوڑے بیڑے، فراخ ختنے، گول سر، ناماقدہ۔ باگڑے کی طرح ہاتھ  
ساوا رہوٹل میں داخل ہوتے ہیں اور اپنی نشست پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ کتابیں میز کے ایک طرف  
کر دو نوں ہاتھ ملتے ہیں اور ادھر ادھر آنکھیں بچا کر پوچھتے ہیں۔

”کچھ سنا دوستو؟“

”کیا؟“

”مہمانانے بس گالگی سے شادی کر لی۔“

سب کا منہ کھلا رہ جاتا ہے۔ ابلق ناک کا بارن بجا کر کہتا ہے۔  
”مگر اتنی جلدی؟ ابھی تو ان کا رومان ہی شروع ہوا تھا۔“

جی ہاں۔ مگر یہ ایٹم کا زمانہ ہے باباجی۔ اور پھر عورت مرے دار ملے تو  
کون صبر کرتا ہے۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

چاکلیہ عورت کا ذکر ہمیشہ سوتیانہ انداز میں کرتا ہے۔ اس کے منہ سے عورت کا ذکر سن کر عورت سے  
لازمت سی ہو جاتی ہے۔ مہمانانے منڈی کے ایک خاموش رکن ہیں جو کالج میں ایم اے اقتصادیات کے  
ٹوڈنٹ ہیں۔ آپ بہت کم گو ہیں۔ اکثر خاموش رہتے ہیں۔ چلنے کی دوسری بجالی پینے کے بعد سر کو تمام  
بٹنے ہیں اور ناک سے دو تینک سون سون کرتے رہتے ہیں۔ مس گالگی جو ہمیشہ آنکھوں پر سیاہ چشمہ جوڑے  
رہتے ہیں ان کی ہم جماعت ہے۔ دونوں کے رومان کا کالج میں بڑا چرچا ہے۔ یہ لڑکی مہمانانے کی  
راہ سوکھی ساکھی اور چرخ سی ہے۔ جسم پر گھائے لڑیوں اور کپڑوں کے اور کچھ نہیں۔ زیادہ دیکھتی  
لے تو منہ خشک ہو جاتا ہے۔ سانس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور ہونٹوں کے کنارے جھاگ سے  
بڑھاتے ہیں، شاید آسے مہمانانے کی خاموشی سے محبت ہو گئی ہے وہ سواوار کے اوپر والے کین میں مٹی جڑ  
بائی کیے جاتی ہے اور مہمانانے اس کے سامنے چپ چاپ بیٹھا سر کو تھا مے ناک سے سون سون کرتا رہتا  
ہے جس دن چاکلیہ نے یہ سکینڈل جھوڑا اسی دن یہ خبر سب متعلقہ لوگوں کو معلوم ہو گئی۔ بعد میں تپہ چلا کر  
ٹادی دادی بالکل نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی چاکلیہ نے سینٹر لڈل لیا اور ایک ایک سے مل کر  
رشتہ کا اظہار کرتا۔

”یار لوگ بھی کیسی کیسی ہوا بیاں چلاتے ہیں۔“

چاکلیہ بہت بڑا سکینڈل باز ہے۔ سکینڈل اس کا من بھاتا کھا جاتا ہے۔ جب تک وہ دن میں دو تین  
سکینڈل نہ چھوڑے تو اس کا دل چاہیے ہیچ نہیں رہتا۔ اس کے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ یہ حرکتیں وہ قصداً نہیں  
کرتا بلکہ اس کا رشتہ ہے۔ کسی سے ذاتی دشمنی نہیں اور نہ ہی کسی سے ذاتی محبت ہے۔ وہ تو بس اپنی جبلت  
کے مطابق اسی فعل کو سرا انجام دیتا ہے۔ آپ افسانہ نویس ہیں اور پی۔ ڈیوڈ ویس کے محکمہ میں سینئر  
لکڑ ہیں شادی شدہ ہیں اور چار بچوں کے باپ ہیں۔

مستر سپر کرٹس سے بھی ملے۔

آپ پہلے اشتراک کی تھے اور آج کل اسلام کے طرفدار ہیں، پہلے اسلام کے خلاف دھواں دھار تفریق پر کیا کرتے تھے اور آج کل اسلامی سماجی نظام پر ہر اعتبار سے برتر اور اعلیٰ ترین ثابت کہہ دیکھنے میں مطلب اللہ ان رہتے ہیں۔ آپ اس موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے سماویں بیٹھے بیٹھے ایک دن اعلان کر دیا تھا کہ کتاب چودہ سو صفحہ پر مشتمل ہوگی۔

ہیوکرٹس نے بڑی گرم جوشی سے سگریٹ چائے کی پیالی میں مسل گرجی کو لا کر دکھایا۔  
”جی تم سبکی ہو تمہیں نہ اشتراکیت کا کچھ تیر ہے نہ اسلام کا۔ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو علم اور جہالت دونوں سے محروم کر رکھا ہے“

ویسے ہیوکرٹس بڑا زمانہ ساز آدمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُسے خود نہ اشتراکیت کا پرورام ہے اور نہ اسلام سے واقفیت ہے۔ یہ ایک نیشن ایبل سیاسی موقع پرست ہے جسے قوم کے نام پر لوگوں کو درغلانے اور ان کے پیسے کھانے کا چمکے پڑ گیا ہے۔ اشتراک کی پارٹی سے یہ نظریاتی اختلاف کی وجہ سے الگ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اسے ان لوگوں نے خود نکال باہر کیا تھا۔ کیونکہ یہ ایک دیہاتی علاقے میں چندہ جمع کرنے گیا اور سارا چندہ ہضم کر گیا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ دیہات والوں میں اسلامی نظریات کا بڑا زور ہے اور یہ لوگ صرف مسلمان ہیں اور اسلام ہی کو پسند کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف ایک جملہ بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ چنانچہ جب پارٹی نے اسے باہر نکال دیا تو یہ فوراً ایک مذہبی جماعت میں شامل ہو گیا۔ پور کی اس کی خوب خبر لیا کرتا ہے۔

”دیکھتے تو موقع پرست ہے۔ تو نے اس مذہبی جماعت کو بھی بدنام کر رکھا ہے۔“

”تم بھو اس کرتے ہو۔ تم دوسرے کو بھی اپنے اوپر تیاہی کرتے ہو۔ پاکستان کو بھی ایسا سماجی کارکن بھی نہیں مل سکتا۔ میں اس ملک کی خوشحالی کا طلبگار ہوں۔ تم لوگ محض شاعر ہو۔ محض وقت ضائع کرنے والے ہو۔ قوم کو شعاعوں کی نہیں مجھ لیسے خاموشی کی ضرورت ہے۔ میں زندہ اور کام کرنے والوں تکے ہوں۔ تم مردہ اور بے حس لوگوں میں سے ہو۔ سماجی کارکن زندہ باد۔“

”ٹٹ آپ“ جی ادھر سے آواز دیتا، اگر تم میرے سٹوڈیو میں آؤ تو میں تمہاری ایک تصویر بناؤں۔ لیڈر شریک تصویر بناؤں۔ میں ایک چمکاؤ کو بھیر کی پشت سے چلتا ہوا

دکھاؤں اور نیچے تھا لانا لکھ دوں۔“

”تم لوگ میری سوشل حیثیت سے حسد کرتے ہو اور کچھ نہیں۔“

”واہ رے میرے نیولین بونا پارٹ“ جی طنز کے انداز میں کہتا۔

”اچھا یہ بتاؤ چائے کون منگوا رہا ہے؟“ ہیوکرٹس کی اس بات پر تھوہہ لگا کر سب

ہنس پڑتے اور مسٹر ابلق فوراً کسی نہ کسی انگریزی یا فرانسیسی طنز نگار کے حوالے سے کوئی

جملہ جڑ دیتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ سیاستدان قوم کے جسم پر چڑھی ہوئی چیونٹیاں

ہیں اور پھر رومال ناک پر رکھ کر زور سے ہارن بجاتا۔

آپ مسٹر سندھو میں ساپ لاہور ہی کے رہنے والے ہیں، عمر چونتیس کے قریب ہے۔ ہمیشہ سیل لے کر مسٹر کی تیلوں اور دو گھوٹا بوسکی کی قمیض پہنتے ہیں۔ لاہور کی ایک مشہور کاروباری سرگ پر جوتوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جہاں دوپہر کے بعد استراحت کے لیے پلنگ بچھا رکھا ہے۔ دکان پر جو لڑکی بھی آتی ہے اُسے بھانسنے کی ضرورت کو شش کرتے ہیں۔ تین ہار لڑکیوں سے معاشرت جمل ہے۔ ہر گاہک لڑکی سے بڑی بجا جت اور انتہائی شیریں لہجے میں نظریں جگا کرتا رہتا ہے۔ کیا جمال جوڑا بھی آنکھ اٹھا کر اسے دیکھ لیں۔ یہ ظاہر داری کی شرافت اور بھی چالچی اصل میں وہ زبردست جال ہے جس میں جب ایک بار کوئی لڑکی پھنس جاتی ہے تو پھر ساری عمر نہیں نکل سکتی۔ مسٹر سندھو خدا کا نام لے کر اسے جال سمیت اٹھا کر عقی کرے میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ

بلی کی طرح بس تڑپتی ہی رہ جاتی ہے۔ جوتوں میں یا ٹھہ فیصد تک منافع کماتے ہیں اور دن میں نہ بانے نکتنے یا بھجوت بولی کر گاہکوں کو یقین دلاتے ہیں کہ انھیں اس مال میں روپے میں صرف ایک پیسے کی بہت ہمواری ہے۔ اپنے دونوں بچوں کو انگریزی سکول میں داخل کروا رکھا ہے۔ یہ بچے گھر میں صبح کر پڑھ کر مال باندھ کر مولوی صاحب سے عربی کا درس لیتے ہیں اور اسکول میں نیلی جیکٹ پہن کر بابا بیک شیب کی گردن کرتے ہیں۔ اسکول میں جب وہ اپنی حیثیاتی استانیوں سے عربی کے بارے میں لڑکی بات کرتے ہیں تو وہ انھیں ڈانٹتی ہیں اور گھر میں جب وہ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں تو ماں ان کو زرخش کرتی ہے۔ ماں انھیں اچھی جان کتا سکھلا رہی ہیں اور باپ ڈیڈی کھلائے جانے پر زور دیتا ہے۔ مسٹر سندھو کو پاکستان سے بے حد عقیدت ہے۔ اگر کوئی دوست کسی دوسرے ملک کی

تعاریف کر دے تو آپ اس سے لڑائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ جناح کیپ پہنتے ہیں۔ ہمارے ہیر و مسٹر چار کا خیال ہے کہ پاکستان کو بدنام کرنے میں ان لوگوں کا زیادہ ہاتھ ہے۔

”سندھو راقم قیض دو گھوڑا بوسکی کی پہنتے ہو لیکن ذماغ میں عقل ایک گھوڑے جتنی بھی نہیں رکھتے۔ تم پاکستان کے نادان دوست ہو۔ خدا اس ملک کو تم ایسے لوگوں سے پاک کر دے۔“  
سندھو نے چار کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ چار ہنستا رہا اور سگریٹ بناتا رہا جس طرح تیز ہوا چلے تو چار کے درخت کے پتے تالیاں بھانا شروع کر دیتے ہیں۔

یادنی بھیر ڈاکٹر برومیو کا گھر شہر کے اندر ایک پرانے محلے میں تھا۔

پرانا محلہ ہم نے اس لیے کہا ہے کہ وہاں تقریباً سبھی مکان سکھوں کے عہد کی بدکاریں تھیں ڈاکٹر برومیو کے مکان کی دیوڑھی ٹھنڈی، اندھیری اور لمبی تھی مگر مکان اندر سے کافی بڑا تھا۔ کمروں کی چھتیں نیچی تھیں مگر وہ کافی فراخ تھے، ہمارے ہیر و چار کو اس سہ منزلہ مکان کی سب سے پہلی منزل میں نشست گاہ کے ساتھ والا چھوٹا سا کمرہ ملا ہوا تھا۔ اسی کمرے میں ایک پنگ، تپائی، دو کرسیاں اور ایک چمت کا جالاصاف کرنے والا بانس تھا۔ ایک مدت سے بیکار پڑا رہنے کے باعث اس بانس کے برتن پر مکڑیوں نے جالاجن رکھا تھا۔ ڈاکٹر برومیو کے گھر میں ادب اور آرٹ کا بڑا چہرہ جاتا یعنی خود ڈاکٹر برومیو لیٹان کے ملا سفر نپتا تو اس اور ایرن کے بڑے چہرے کا عاشق تھا۔ بیگم چائے کی پیالی سے کھینچ جاتے اور اپنا سلسلہ نسب کشمیر کے ایک پرانے شاعر سے ملا دیتی جس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر ہائے دانی اس کے ساتھ ہی دفن کی جائے۔ بڑا لڑکا جاسوسی ناولوں کا عاشق تھا۔ چھوٹے بڑے کے پر اسلامی تاریخ کی ناولوں نے حملہ کر رکھا تھا۔ نویں جماعت والی لڑکی اختر رومانوی ادیبوں کی کتابیں سرائے رکھ کر سوتی اور بڑی لڑکی زلیخا عرف زلفی بھول پتوں سے اتنی واقفیت جتاتی کہ کوئی الٹی بھی کیا بتائے گا۔ اسے شاعروں سے بڑی محبت تھی۔ بعد میں چار کو پتہ چلا کہ ایک شاعر کی محبت مددگار ہو کر وہ لاہور کے ایک نیشنل ایمل مجام کی دکان کے عقبی کمرے میں اسے ملنے جایا کرتی تھی۔ چار نے جب گھر میں علم و ادب کی یہ فراوانی دیکھی تو سمجھ گیا کہ اس گھر میں اور چہرے یا گھر میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ پہلے ہی روز جب شام کو وہ سب کے ساتھ مل کر چائے پیے کمرے میں آیا تو



زلفی نے کئی ہوئی زلف ماتھے پر لہرا کر موتی کے چند ایک پھول چپکے سے چہرے کے ہاتھیں تھما دیئے۔ محبت کرنے کا یہ رومانوی اور دور شجاعت کا سا انداز اسے بے حد مرغوب تھا لیکن یہاں وہ اسے بالکل نہ چھا۔ اس کا وہیں ماتھا ٹھنکا کہ یہ لڑکی محض فراڈ ہے اور دکھاوے کی رومانوی بن رہی ہے۔ بعد میں یہ بات ثابت بھی ہو گئی کہ زلفی کو محض رومانوی بننے کے شوق میں ہی پھولوں سے انس تھا۔ پھولوں کی خوشبو اور اس خوشبو کے انسانی ذہن پر رد عمل سے اسے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو حیران ہو گیا کہ جو لڑکی چنے کی دال کا آدھا دیکھ کر چاولوں کی تھالی پر ڈال کر چپٹ کر جاتی ہے۔ وہ پھولوں سے بھی پیار کرتی ہے۔ پھر کئی بار ایسا ہوا کہ زلفی نے پھول منگتے ہوئے یا کسی شاعر کی نظم سناتے ہوئے اتنے زور سے دُکارا کہ تپائی پر پڑ پڑی جائے کی پیاپی تک کا نپ لگتی۔ بخوبی کو جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ چہرہ کسی زمانے میں افسانے بھی لکھتا رہا ہے اور آج کل وہ سما و راجی ہوئی میں شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ وہ اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ وہ بڑی بن سنو کر چہرے کے سامنے بیٹھا کرتی۔ بالوں کی لٹ ماتھے پر ہوتی۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ ہوتا۔ آنکھیں مسکا مسکا کر بات کرتی۔ کبھی منہ تک آئے ہوئے بے ہنگم تھقے کو اندر ہی اندر دبا کر چھوٹی سی مسکراہٹ بنا دیتی اور کبھی خاموش رہنے والی بات پر یونہی اولے مسکرا دیتی۔

چہرہ کو پہلے ہی روز اس بے معنی لڑکی سے نفرت ہو گئی تھی اس لیے کہ اس نے اس پھولوں کی شیدائی عورت کے بغل میں آیا ہوا پسینہ دیکھ لیا تھا جس نے قمیض کو استیغون تک تھرا کر رکھ رکھا تھا چہرہ کو زلفی سے انتہائی کراہت محسوس ہوئی۔ اس کے باوجود چہرہ نے زلفی سے محبت شروع کر دی یعنی رومان لڑنا شروع کر دیا۔ کیونکہ چہرہ راہی خواہشات کا تابعدار تھا۔ بڑا ہوس پرست اور دل چسپک عاشق تھا۔ ہر لڑکی پر عاشق ہو جاتا اور پھر اسے اپنی جنوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا اس کی فطرت میں داخل تھا۔ وہ زلفی سے عشق بھی کرتا رہا۔ اور نفرت بھی کرتا رہا۔

نفرت کی گھڑی آتی تو زلفی سے پیٹ پیٹ جاتا۔ اپنا چہرہ اس کے بازوؤں میں چھپا دیتا تاکہ اس کی شکل نہ دکھائی دے سکے عشق کا کچھ آتا تو اس کی چھوٹی ہنر اختر سے آنکھیں لڑائی تھرونا کر دیتا۔ اختر اگرچہ چھوٹی تھی مگر بڑی سنجیدہ اور متین قسم کی لڑکی تھی۔ یعنی اس قسم کی لڑکیوں میں سے جن کے معاشرے عام طور پر شادی کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ جن کو محلے کے اور محلے

سکھانک بچھا کرنے والے ایک ایک لڑکے کی پوری پوری خبر ہوتی ہے لیکن جو کسی کی طرف آنکھ اٹھا بھی نہیں دیکھتیں لیکن اگر کہیں کسی کے جال میں آجائیں تو پھر تمام ناکہ و گناہوں کے بدلے چکا دیتی ہیں۔ چہرے دو ایک بار اختر سے آنکھیں لڑنے کے جن کیے مگر اس کی دال نہ لگی۔ اور وہ اسے بالکل ہی بھلا بیٹھا۔ گویا اس گھر میں اختر نامی کسی لڑکی کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ زلفی سے اس کی جھوٹی محبت بدستور جاری رہی۔ ایک رات کیا ہوا کہ گھر میں سوائے زلفی کی ماں اور ایک عدد بڑے بھائی کے اور کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر ہو یا صاحب مرغ اڑانے اختر اور بڑے لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی بیٹی کے ہاں منگمری گئے ہوئے تھے چہرہ رات گئے گسٹا وار ہوئی سے واپس آیا۔ کھانا اس نے وہیں کھا لیا تھا۔ پورا کھانا نہیں۔ یہی ایک عدد باپ اور گیارہ سلاٹس یعنی ڈبل روٹی کے کچھ بچے۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے کپڑے بدلے۔ بدلے کیا۔ بس کپڑے اتار دیئے۔ محاف میں گھس کر پلنگ کی پٹی سے چٹا ہوا بلب جلایا اور ریلوے ٹائم ٹیبل لائبریری مطالعہ شروع کر دیا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ وہ رات کو ہمیشہ برہنہ سوتا اور ریلوے ٹائم ٹیبل لائبریری مطالعہ ضرور کرتا، کبھی خیبر میل میں اور کبھی پٹنہ میں بیٹھ کر ایک ایک سٹیشن کا نام بڑے غور سے پڑھا پھرا اس بات کا بھی حساب رکھنا چلا جاتا کہ وہ کتنے میل کی مسافت طے کر آیا ہے اور ابھی کتنا سفر باقی ہے اسی طرح پڑھتے پڑھتے گاڑی میں دھچکے کھاتے کھاتے جب اسے نیند آ جاتی تو وہ سو جاتا۔ اگر ٹھان کے سٹیشن پر نیند آتی تو وہ گاڑی وہی ٹھہرا دیتا اور اگلے روز پھر وہیں سے سفر کرتا۔

آج وہ نندو آدم سے روانہ ہوا تھا اور ابھی نندو جگمگ ہی پہنچا تھا کہ دروازے کا کڑکنا ہستہ سے کھلا اور زلفی ماتھے پر کٹی ہوئی زلف ڈالے اندر آ گئی۔

”زلفی تم؟“

”جی ہاں۔“

”اس وقت؟“

”نہیں بڑے صوفیادوں کو تو آپ میری بات نہیں سنتے۔ اب رات کو ہی ملا جائے۔“

چہرہ نے ریلوے ٹائم ٹیبل ایک طرف رکھ دیا اور محاف کو اچھی طرح بدن کے گرد لپیٹ کر پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ زلفی بھی اس کے قریب ہی آکر پٹی پر بیٹھ گئی۔

”رسالہ نموش پڑھ رہے ہیں؟“

”نہیں ٹائم ٹیل ہے۔“

”ارے؟ یکس لیے پڑھ رہے ہیں بھتیجی تم کس لیے آئی ہو؟

زلفی نے بڑی گہری نظروں سے پلکیں جھپکا کر چنار کو دیکھا اور سر جھکا کر بولی۔

”کیا آپ نہیں جانتے؟“

”اچھا — سمجھ گیا — تو تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟“

”اپنے دل سے پوچھئے۔“

چنار نے جلدی سے اپنا ہاتھ زلفی کے دل پر رکھ دیا۔

”تمہارے دل سے کیوں نہ پوچھوں؟“

زلفی نے تڑپ کر چنار کا ہاتھ پرے کر دیا اور خود آگے ہو بیٹھی۔ اب وہ اتنی قریب آ گئی تھی کہ چنار کو اس کے سینے کی بوسہ محسوس ہونے لگی تھی۔ اگرچہ سردیوں کا موسم تھا مگر زلفی کے خون میں ہلا کا جوش تھا۔ چنار کو زلفی سے وہی پرانی کراہت یعنی نفرت کا احساس ہوا اور اس نے اپنا سر زلفی کے بازوؤں میں دے دیا۔ زلفی اس حرکت پر بہت خوش ہوئی۔ اور وہ چنار کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

”مجھ سے اب تمہارے بغیر ایک بل بھی نہیں رہا جانا میرے چنار۔ تم باہر چلے جاتے ہو اور اتنی رات گئے واپس آتے ہو۔

رہتی ہوں تو تم بڑے سنگدل ہو۔ تمہیں ذرا میرا خیال نہیں ہے۔“

”میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں زلفی۔ میں بھی تمہاری جدائی میں تڑپتا رہتا ہوں۔“

ایک بل کے لیے تمہاری صورت نہ دیکھوں تو بے چین ہو جاتا ہوں۔“

”میرے چنار — میری طرف دیکھو! اپنا چہرہ میرے سانسے لاؤ۔“

زلفی چنار کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور چنار

اپنا سر جھبہ ماتما۔

”نہیں نہیں زلفی میں تمہارے حسن کی تاب نہیں لاسکتا۔ میں سورج سے آنکھیں چاؤ

نہیں کر سکتا۔“

چنار کو اچھی طرح معلوم تھا کہ زلفی کو قریب سے دیکھتے ہی اس کا یہ گھڑی دو گھڑی کا جسمانی عشق بجاپ ہوا کر اڑ جائے گا۔ لیکن زلفی بھلا کب پیچھے ہٹنے والی تھی۔ اس نے چنار کا منہ اوپر کھینچ لیا۔ چنار کے سامنے اب چوڑے نتھوں والی ناک تھی۔ لمبے کان تھے اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

”آہ میری آنکھیں چکا چوند ہوئی جا رہی ہیں۔ میں اس نظارے کی تاب نہیں لاسکتا۔ میں

تمہاری خوبصورتی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”آؤ میرے پیارے ہم چھت پر چل کر محبت کی باتیں کرتے ہیں۔ یہاں کسی نے دیکھ

لیا تو مصیبت آجائے گی۔“

چنار نے سوچا کہ مصیبت تو آگئی ہے۔ وہ محاف سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ محاف میں سمٹ گیا۔

”نہیں نہیں زلفی ہم یہیں بیٹھ کر محبت کریں گے۔ میں بتی گل کیسے دیتا ہوں۔“

اور چنار نے فوراً بتی بجھا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

”ارے تم تو کانپ رہی ہو۔ لو یہ محاف اوڑھ لو۔“

چنار نے زلفی کو اپنے محاف میں چھپا لیا۔ زلفی کی چیخ سنی نکل گئی۔

”کیا آپ؟“

”ہاں زلفی — میرے پاس ہی ایک سلپنگ سوٹ ہے۔ تم بھی سلپنگ سوٹ پہن لو۔“

”چنار — کیا مجھ سے شادی کرو گے؟“

”روہ کیا ہوتی ہے؟“

”شادی کیا ہوتی ہے؟ کبھی شادی یعنی بیاہ۔“

”روہ تو میں ابھی کر رہا ہوں۔“

”ابھی کیسے؟ یہاں تو کوئی نکاح پڑھانے والا بھی نہیں۔“

”اس کا بندوبست پھر کبھی ہو جائے گا۔“

”نہیں میری جان — ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جب تک پہلے نکاح نہیں ہو گا میری

اس میں کوئی شک نہیں کہ چنار زلفی سے نفرت کرتا تھا مگر وہ اس کے جسم میں بڑی  
بہش محسوس کرتا تھا۔ جب زلفی اس کے کمرے سے باہر جانے لگی تو اس کی کٹی ہوئی  
نہ بکھر کر ماتھے پر جھالہ سی بنا رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی چنار نے لحاف کو سمیٹ  
پر کیا۔ پتنگ سے ٹیک لگائی اور ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ شروع کر دیا۔

سے شادی نہیں ہو سکتی۔

”تو پھر سیاں کیا لینے آئی ہو؟“

”محبت کرنے۔“

”وہ کیا بلا ہوتی ہے۔“

”دودلوں کا ملاپ کشش۔“

”ہم صرف ایک ہی کشش کو جانتا ہوں اور وہ کشش ثقل ہے۔ اگر مجھ سے محبت کرتی ہو تو  
میلنگ سوٹ کو پہن کر چپ چاپ سو جاؤ۔ اور اگر شکاں پڑھو نا چاہتی ہو تو کمرے میں جا کر اپنی  
مان کے ساتھ سو جاؤ۔“

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو چنار؟ میں تم سے پاک محبت کرتی ہوں۔“

”یعنی پاکستانی محبت۔“

”ہاں پاک محبت۔ جس میں صرف دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے جس میں جسم بہت نیچے

رہ جاتے ہیں۔ آسمانی محبت۔“

زمین پر رہ کر میں آسمانی محبت نہیں کر سکتا۔ مجھے تم سے کبھی محبت نہ ہوتی اگر میں تمہیں نہ  
دیکھتا اور میں تمہیں کبھی نہ دیکھ سکتا اگر تمہارا جسم نہ ہوتا۔ تم اپنا جسم بھی ہو اور جسم کی روح  
بھی۔ روح بغیر جسم کے بے معنی ہے اور جسم بغیر روح کے مردہ ہے۔ ہم اتنی بڑی  
حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟“

”نہیں نہیں چنار۔ ایک بار جسم کے ملاپ سے محبت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی

ہے۔“

”جو محبت جسم کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے وہ اسی قابل ہوتی ہے حقیقی محبت جسم  
سے جلا حاصل کرتی ہے جسم اس محبت کی تکمیل کرتا ہے۔ جسم کو بھلا کر کوئی انسان روح  
کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتا۔ اور روح کو پس پشت ڈال کر جسم کا معراج نصیب نہیں  
ہو سکتا۔ آج روح اور جسم کے ملاپ کی رات ہے زلفی!

آؤ! میرے اور قریب آ جاؤ۔“

سے زندہ رہے گا۔“

”بھئی، خدا سے جاننا، میں غیب کا علم نہیں رکھتا، میں تو نہ رکھتا۔“

”کیا مطلب؟“ چانکیہ نے چونک کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ غزل اصل شاعری ہے۔“

”لیکن اس وقت اسی قسم کی شاعری کی ضرورت تھی۔“

”تم جاہل آدمی ہو تم ان باتوں میں دخل نہ دیا کرو۔“

”میں اتنا جانتا ہوں کہ میری جہالت نے مجھ سے ہمیشہ سیدھی اور کھری بات کہلائی

ہے۔ میں تم پر سب کچھوں والی ریاکاری اور تصنع سے بہت دور ہوں۔“

”تم بھول کر کہتے ہو۔ سندھو اور اہلیق نے ہم زبان ہو کر کہا۔ اتنے میں جی کو لایا چایاں گھاتے ہوئے تشریف لے آئے اور فوراً بحث میں شریک ہو گئے۔“

”بائی دی دے دوستو! یہ سڑحالی کون تھے؟“

بورکی نے مینڈک کی طرح ٹرا کر کہا۔

”لو۔ یہ چار کے ایک اور ساتھی آگئے ہیں۔“

اب جو دیکھتے ہیں تو سیاسی چیکے پائے سڑھو کر بیٹھ بھی بھاؤ کی طرح شانے ہلاتے تشریف لارہے ہیں۔ پوری منڈی جم گئی اور گرامر بحث شروع ہو گئی۔ ادب سے بات سیاسیات میں آنکلی ہو کر گھٹنے نالے ہاتھ بلند کر کے کہا۔

”اس قوم کو صرف ایک مضبوط کرک کی ضرورت ہے۔“

”اور تمہیں اگر کسی شے کی ضرورت ہے تو وہ قوم کے چندے میں۔“

چنار نے مسکرا کر کہا۔ سپو کرٹس گرم ہو گیا۔

”تم بھول کر ہو تمہیں سیاست کے امر اور موز کی کیا خبر تم ایک نراجی ہو تمہارا انتقام نہ

دورخ میں ہے اور نہ جنت میں۔ کیونکہ یہ ہر دو مقامات ایک خاص نظام کے تحت چل رہے ہیں۔“

”اگر تم اپنی دورخ میں جانے والی روش پر ہی قائم رہتے تو میں تمہاری بڑی عزت کرتا

مگر تم سپو کرٹ ہو۔ تم جس خیال کی تبلیغ کرتے ہو اس پر تم خود ہی یقین نہیں رکھتے۔ اشتراکیوں

میں رہ کر تم نے اشتراکیت کو نقصان پہنچایا اور اب مسلمانوں کے لاپ میں شامل ہو کر اسلام

کا علم لگا رہے ہو۔“ چانکیہ نے سر جھجک دیا اور کہنے لگا۔

”لیکن تم بھی تو لوگوں کو دھوکا دیتے ہو۔“

”میں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ بلکہ میں مکان کے باہر بیٹھ کر دھوکا دینے والے

کا انتظار کرتا ہوں۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔ ہمارا بار الٹی کتا ہے کہ تم ایک لڑکی کو محبت کے سبز باغ دکھا رہے

ہو۔ حالانکہ جیسا تم کہتے ہو تم محبت میں بالکل یقین نہیں رکھتے۔“

”میں نے کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی اور نہ کر سکتا ہوں۔ جس لڑکی کا تم نے بُری مکاری

سے اور اپنی فطرت کے عین مطابق اظہار کیا ہے وہ خود مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

”ایک ہی بات ہے۔“

”نہیں یہ دوسری بات ہے۔ محبت کرنے اور محبت کرانے میں بڑا فرق ہے۔ محبت

کرنے میں انسان اپنی آدمی شخصیت دوسرے کے قدموں پر رکھ دیتا ہے اور دوسری حالت

میں وہ دوسرے کی پوری شخصیت کو مہضم کر جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اس لڑکی کو خراب کر رہے ہو تم اسے صاف صاف کیوں

نہیں کہہ دیتے کہ وہ تم سے نہ ملا کرے۔“

یہ بات جوتوں والے سندھو نے کہی تھی۔ چنار فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ

سندھو صاحب بھی نجی پر ڈوے ڈال رہے ہیں۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ میرے نزدیک دنیا کی کوئی لڑکی کبھی بھی اس حالت میں

نہیں ہوتی کہ اسے خراب کیا جاسکے۔ یہ تمہارا اپنا مجرم ضمیر ہے جو تمہیں خرابی کا احساس

دلاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں اسے یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ مجھے نہ ملا کرے لیکن

یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تم سے ملنا شروع کر دے۔“

سندھو بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔

”تم مجھ پر الزم لگا رہے ہو۔ میں نے کبھی کسی کی بیٹی کے متعلق ایسا نہیں سوچا۔“

”اس لیے کہ تم جس شریف باپ کی بیٹی کے بارے میں ایسا سوچتے ہو اسے تم

حاصل کر لیتے ہو۔ شاید یہ پہلی لڑکی ہے جس کے بارے میں تم ایسا نہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہو۔“

اس بحث کے دوران مسٹر بورکی پر اچانک شاعری کے موڈ نے حملہ کر دیا تھا اور وہ کسی کی پشت سے ٹیک لگا کر غنائے پر نیپل سے منزل کا مطلع کہنے میں مشغول تھے۔  
جی کو لا چائے کے پرانے بل کی پشت پر چیار کا پوٹریٹ بنا رہا تھا۔ پوٹریٹ تیار کر کے اس نے نعرہ لگایا۔

”ہائی فوکس! یہ رہے چنار دی گریٹ۔“

سب نے تصویر دیکھی۔ وہاں نیپل کی چنار ایک آرٹسٹریجی ٹیکروں میں ایک بچہ کا ہوا خانی گلڈن بناتا تھا۔ جس کے منیدے پر ایک آنکھ پوری کھلی ہوئی تھی۔ بورکی نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔  
”دوستو! بڑے معرکے کا مطلع ہو گیا ہے۔ عرض کیا ہے۔۔۔“ پروفیسر اہلق نے گردن جھٹکا کر کہا۔

”تم اپنے احمقانہ شعروں سے ہیں بور کرنے کی بجائے میرا بائی کا ایک بھجن سنو اور اگر تمہاری گردن پر سر رہے تو اسے دھنو۔“

اس کے بعد پروفیسر اہلق نے معرے پر زور ڈال کر گردن کی گیم پھٹا کر بکسے ایسی آواز میں رک رک کر میرا بائی کا یہ بھجن گانا شروع کر دیا۔

ہے سی میں تو پریم دیوانی  
کسی بدھ سونا ہو  
کسی بدھ ملنا ہو  
میرا درد نہ جانے کو  
یا جن گھائل ہو  
یا جن جواہر ہو  
میرا درد نہ جانے کو  
وید نہ ملیں کو  
وید سا نور یا سو  
میرا درد نہ جانے کو

گھائل کی گت گھائل جانے  
جواہر کی گت جواہر جانے

درد کی ماری بن بن ڈولوں  
میرا کے پہنچو پیر مٹے جب

میرا درد نہ جانے کو

چنار کو یہ بڑی مضحکہ خیز سی بات لگی کہ پروفیسر اہلق ایسا بھاری بھر کم تو نڈیل آدمی درد کے مارے اپنے واسے کرتا جنگل میں ادھر ادھر ڈول رہا ہے۔ اسے ایک ایسے ساند کا خیال آگیا جو پیٹ کے درد کے مارے زمین پر اسٹالینا ٹانگیں پھلا رہا ہو۔  
ہیو کوٹیس نے کہا۔

”اس گیت میں ہیں اس دور کی لوٹر کلاس کی معاشی بد حالی کا سراغ ملتا ہے۔“

میرا بائی اس دور کی بہت بڑی انقلابی شاعرہ تھی۔“

چنار سگریٹ بناتے ہوئے زیر لب مسکراتا رہا۔ جی کو لا نے کہا۔

”میرا بائی اگر ماڈرن ایج میں پیدا ہوتی تو بڑے فنڈر فل علمی گیت کہتی۔“

سندھو صاحب بولے۔

”اس تمام گیت میں سوائے خدا کی محبت کے اور کچھ نہیں۔“

چنار نے ہنس کر کہا۔

”اس لیے کہ تمہیں بھی اس دنیا میں اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“

بورکی بولا۔

”کیا خوب مصرعے کے بعد مصرعہ آیا ہے اس کا کوئی دیوان نہیں چھپایا؟“

”وہ مسودہ لے کر ایک پبلشر کے پاس گئی تو ضرور تھا مگر رائٹس پر بات نہیں ہو سکی۔“

چنار کی اس بات پر سندھو صاحب کو ٹیس مہقرہ لگا کر سنس پڑے۔ اہلق نے ایک اور بھجن سنانے کا ارادہ کیا تو چنار نے کہا۔

”تم اب معاف ہی کرو تو اچھا ہے۔ ایک تو تم بھجن سنا تے ہو اور پھر کا کر سنا تے حقیقت یہ ہے کہ تمہیں بھجن گاتے کن کر مجھے اور میرا بائی دونوں کو صدمہ پہنچا ہے۔ تم تو صبح اٹھ کر ڈنٹر پیلا کرو۔ ڈنڈ لگایا کرو لیکن بھجن مت گایا کرو۔ زیادہ سے زیادہ کبھی ہو گیا تو

توانی کر لیا کرو۔“

چانچہ نے چمک کر کہا۔

”یار تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ لیکن اگر تمہاری شادی ہو گئی تو میرا خیال ہے ہمارا

پروفیسر ابلق قوائی مزدور کرے گا۔  
پروفیسر ابلق نے طنز کیا۔

”ارے ایسے نگھروں کی بھی بھلا شادی ہو سکتی ہے۔  
چنار نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

”لیکن بیانیہ نے ایک بار شادی کرنی تو پھر سے طلاق دے کر اس پر مقدمہ دائر  
نہیں کروں گا۔“

پروفیسر ابلق ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”تجھیں میری ذاتیات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔“

”ہم اپنے ہر اس جرم کو جس پر لوگ انگلی اٹھا سکیں ذاتی کہہ کر گھرنی پھلی کوٹھری میں چھپا  
دیتے ہیں۔ جب ہماری ذات کسی دوسرے کی ذات سے متعلق ہو جاتی ہے تو پھر ہمارا ہر  
فعل غیر ذاتی ہو جاتا ہے۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم ایک لڑکی کی زندگی برباد  
کر کے یہاں بیٹھ کر بھی گاتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ اپنے گھر بیٹھی آف بھی نہ کرے اور  
پھر تم اپنے اس جرم کو ذاتی مجبوریوں کے نام سے یاد کر کے اپنی کمینگی کا ثبوت بھی دیتے  
ہو۔ یا تو یہ کہو کہ تم نے یہ کام محض اپنی تلون مزاحمتی وجہ سے کیا ہے اس لیے کہ اس  
عورت سے تمھارا جی بھر گیا تھا۔ تم کسی نئی عورت کی آغوشیں چاہتے تھے۔“

پروفیسر ابلق ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”حضرات میں احتیاجیاں سے واک آؤٹ کرتا ہوں۔“

جب پروفیسر ابلق چلا گیا تو میز پر کچھ دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد پوکٹیں  
ادر جی کو لبا بھی اٹھ کر چلے گئے۔ اب وہاں صرف چنار، چانکیہ اور ڈور کی رہ گئے تھے۔ چانکیہ کو چنار  
کا یہ طرز عمل بڑا ناگوار لگتا تھا۔ اس نے کہا۔

”تم نے اچھی بات نہیں کی۔“

”دنیا میں کوئی بات اچھی بری نہیں ہوتی۔ بات یا تو سچی ہو جاتی ہے اور یا جھوٹی۔“

”اس کا مطلب یہ ہو کہ تم اخلاق کے کسی ضابطے کو تسلیم نہیں کرتے۔“

”میرے اپنے ضابطے ہیں اور میں ان پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں۔“

”لیکن پھر ہمارے معاشرے میں تمہیں اس قسم کی خرافات پھیلانے کا کیا حق ہے؟“ یہ بات  
سندھو نے کہی تھی۔

”ہر باگلی خانے میں ایک ڈاکٹر ضرور ہوتا ہے۔“

اتنا کہہ کر چنار نے بکسٹ ڈیش ٹرے میں مسلا اور اٹھ کر ٹرے اطمینان سے باہر نکل گیا۔

عین اس وقت اسی ہوٹل کے اوپر گیلری والے کہیں میں اقتصادیات کے طالب علم مہاتما صاحب اپنی  
اقتصادیات کی طالبہ مس کاگل کے پہلو میں بیٹھے اس سے عشق کا اظہار فرما رہے تھے جس کا گل خلاف عادت خاموش  
تھی اور مہاتما خلاف عادت بولے جا رہے تھے۔ کہیں کے آگے پردہ گرا ہوا تھا۔ مہاتما نے مس کاگل کا خشک  
پیکسا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور اسے کئی بار عینک اتار کر اپنی آنکھوں سے لگا چکے تھے۔

”میں نہیں سمجھتی عورت کا ہاتھ چومنے سے کیا ہوتا ہے۔“

”اس میں میرے دل کی خوشی پوشیدہ ہے مس کاگل۔“

”لیکن مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اچھا سنو۔ تم نے آج کے لیکچر کے نوٹس لیے

ہیں؟ ذرا دکھانا تو۔“

مہاتما نے مس کاگل کا ہاتھ چھوڑ کر میز پر رکھ دیا۔ عینک آنکھوں پر جمائی اور کاپی کھول کر اس کی ورق  
لڑائی کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے بل ادا کیا اور گیلری سے نیچے اتر کر ہوٹل کے عقبی دروازے  
سے باہر نکل آئے۔ مال روڈ پر وہ کالج کے لائن تک پیدل ہی چلتے رہے۔ کالج کی پرانی دھج کی پشت کو  
گارت کے ٹھنڈے برآمدوں میں سے گذر کر وہ کالج کے پھوڑے والے لان میں آ کر بیچ پر بیٹھ گئے۔

بہار کی اس خوبصورت شام کا سورج مغرب کی جانب آسمان کے بلند پیرٹوں کے عقب میں غروب  
ہو رہا تھا۔ باغ میں سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ سوپٹ پیر کی جھالوں  
ملائنگ رنگ پھول کھل رہے تھے جن کی خوشبو ہوا آڑائے لیے جا رہی تھی کہیں کہیں رنگین پردوں والی  
نئیلاں چمک رہی تھیں سرسبز ترشی ہوئی گھاس پر نہرے ہرے بڑے اچک رہے تھے جس کا گل نے  
اقتصادیات کی ایک موٹی سی کتاب بغل میں دے رکھی تھی تھوڑی دیر وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔  
ان کے بعد اچانک مس کاگل ابھی اور اتنا کہہ کر مجھے اب چلنا چاہیے۔“ وہاں سے چل دی۔ مہاتما

چپ چاپ وہاں بیٹھ بیٹھا اپنی معاشی مسائل کی نظریاتی الجھنوں میں گھنسی ہوئی محبوبہ کو لکھڑائی چال میں پٹنا دیکھتا رہا۔ آم کے درختوں میں اس کا مختصر سا سوکھا سا کھانسیا عجیب بے ہنگم لگ رہا تھا بارگ کی ایک روش گھوم کر وہ لگا ہوں سے اوجھل ہو گئی۔ مہاتما نے عینک کے شیشے رد مال سے ماف کیے۔ اسے دوبارہ لگایا اور اپنی کاپی کھول کر کالج کے سبق کا مطالعہ شروع کر دیا۔

ایک ایک اسے اپنے پیچھے کسی کے بوجھل قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے گون پھیر کر دیکھ کر دیکھا۔ اس کے عقب میں آلوچے کے ایک چھریے پیر کے پاس کھڑا ایک شاخ پر کھلے ہوئے آلوچے کے کانہ پھولوں کو ہاتھ سے چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم یہاں کب سے کھڑے ہو؟ اوہ یہاں بیٹھ جاؤ۔“

چنار آہستہ سے چل کر اس کے پاس آکر بیٹھ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”جب سے آلوچے کے یہ پھول کھلے ہیں میں یہیں کھڑا ہوں۔“

مہاتما ہنس پڑا۔

”تم بھی عجیب ہو لیکن پیارے تمہیں یہاں سوائے میرے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔“

”پہلے تم اپنی محبوبہ کو تو سمجھ لو۔“

”بڑی پیاری لڑکی ہے۔“

”اس سے شادی کر لو۔ اقتصادیات کے تمام یکپہلو خود بخود سمجھ میں آجائیں گے۔“

”اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔ میں تمہیں یہ بتانا بھول ہی گیا، کلکتے سے سچتر آئی ہوئی ہے۔ تم اسے جانتے ہو ناں۔ وہی خوبصورت سیاہ آنکھوں والی نیگالی لڑکی جو ہمارے

کالج میں پڑھاتی تھی۔“

”اگے کہو۔“

”کل مجھے مرنیوں میں مل گئی۔ تمہارا پوچھ رہی تھی۔“

چنار بیچ پر پاؤں رکھے، دیں کھڑے کھڑے سگریٹ بنانا لگا۔ سگریٹ بنا کر اس نے لگا ہاتھ جھارے۔ آلوچے کے پیر کے پاس جا کر پھولوں کا ایک گچھا توڑا اور وہاں سے چل دیا۔

”کہاں چلے؟“

”سچتر کے پاس۔“

”اس کا پتہ معلوم ہے کیا؟“

”میں اسے دھونڈ لوں گا۔“

چنار کو کسی زمانے میں اس لڑکی سے محبت رہی تھی۔ سب سے پہلے اس نے سچتر کو اسی سا دار پہل

اپنے دوستوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ کالی کالی آنکھیں، بھرے بھرے ہونٹ اور چہرے پر ایک گہری

ہلکی کیر جو مسکراتے ہوئے زیادہ نمایاں ہو جاتی۔ چنار اب ہر ہفتے گورداسپور سے لاہور آتا اور سچتر سے

پہچان کر سچتر سے دیکھتی ہوئی تھی۔ لیکن چنار نے اس سے کبھی اظہار محبت نہ کیا۔ بس اس سے ملنا

دار یا مرنیوں میں بیٹھ کر چائے، کافی وغیرہ پیتے۔ کلکتے، بردوان اور چند زنگر کی باتیں کرتے اور پھر

انچارہ لیتے۔ سچتر ماڈل ٹاؤن میں اپنی موسی کے ہاں رہا کرتی تھی۔ تقسیم کے ہنگاموں میں

لکھنؤ چلی گئی اور دو تین سال بعد اسے ایک مختصر سا خط بلا جس میں سچتر نے لکھا تھا کہ یہاں اسی

نادی ہو گئی۔



پچھلی رات کو اب بھی کوئی لڑکی بیٹنے پر ہاتھ رکھے، سانس روکے، ناریل کے درختوں میں سے  
گزر کر سیالین کو جاتی ہے؟ کیا درگاہ کا پوجا کی شام کو اب بھی کتوری لڑکیاں مندری لگے تنگے پاؤں  
سے چل کر مندروں کو جاتی ہیں؟ کیا مسجدِ ناخذ کے بلند میناروں سے اب بھی صبح دم مؤذن  
کی صلا بلند ہوتی ہے؟ کیا حضور پور گارڈن میں اب بھی عید کا میل لگتا ہے؟ کیا کوٹوالا سٹریٹ  
اور زکریا سٹریٹ کے مکانوں میں تلاوتِ کلامِ الہی کی مقدس آواز سنائی دیتی ہے؟ کیا  
مسجدوں میں شربِ معراج کو اگر تبیاں سلگتی ہیں اور گلاب کے پھولوں کی بارش ہوتی ہے؟  
مجھے بتاؤ سچتر کیا بنگال ویسا ہی ہے جیسا میں چھوڑ آیا تھا۔ کیا وہ بھی تمہاری طرح  
توڑا سا کزور تو نہیں ہو گیا؟ دہلا تو نہیں ہو گیا؟ اس کے چہرے کی اداسی میں بھی تو زیادہ  
گرائی اور ویلنی نہیں آگئی۔؟

سچتر خاموش تھی۔ وہ سر جھکائے اس کے ساتھ ساتھ شالامار کی ایک پھولوں بھری روٹی پر چل رہی  
ہارنے ایک جگہ گلاب کا انتہائی خوبصورت پودا دکھلا ہوا پھول توڑ کر سچتر کو دیا۔ اس نے پھول کو  
رہے میں لگا لیا۔ چار نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مانی تے انھیں نہیں دیکھا تھا۔ وگرنہ بنگال کے جنگلوں  
اور کے حسین باغوں کا سارا رومان خاک میں مل جاتا۔

”یہ لاہور ہے سچتر! تمہارا پرانا شہر اور میرا وطن، لاہور مجھے اس شہر سے ہمیشہ محبت  
رہی ہے۔ تمہارے بعد اگر میں نے کسی سے محبت کی ہے تو صرف لاہور سے۔ یہ بڑا گندہ  
اور بڑا دلفریب شہر ہے۔ یہاں ملاں حسین حوالائی کی رہتی ہے، خلیفے کے کباب ہیں، بارغ  
خارج کے دلکش اور پر سکون گنج ہیں، مشرق کا سب سے بڑا سٹیڈیم ہے، موچی دروازہ  
کے روغنی نان اور بھائی دروازے کی پڑا سرار گلیاں ہیں، صوبہ خاں کی کمر توڑ دکان ہے۔  
لاہور انش کے ذمہ دار شکر پان ہیں۔ کنال بینک کے لیے لیے یو کے پیس کے درخت ہیں  
درگاہ منڈی کے ہوٹلوں کا شور ہے، میکو ڈورڈ کی جگمگاتی روشنیاں ہیں، اور  
نارنگ پٹری کی ٹھنڈی ہول ہے اور شاہ باغ کے آسموں کے جھنڈ ہیں، آلوچے کے  
انڈ ہیں اور ناشپاتیوں کے سفید سفید پھولوں سے لہرے ہوئے درخت ہیں، میں  
مارے ملک کے ہر شہر سے پیار کرتا ہوں۔ وہاں کے لوگوں سے، ان کے اسکول جاتے

سچتر گان روڈ پر اپنے پتا جی کے ایک دوست کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔  
وہی گہری سیاہ بڑی بڑی آنکھیں چہرے پر ایک دل گداز سی، چپ چاپ سی اداسی، لمبے سیاہ  
مانگ میں سیندھور، پتیانی پرنک، نارنجی باڈروالی سفید سلک کی سارھی، کلائیوں میں سرخ چوڑیاں۔  
وہ چنار کو دیکھ کر مسکرائی اور ہاتھ جوڑ کر نسا کر کیا۔ وہ اسے دیکھ گیا ہ سالوں کے بعد دیکھ رہا تھا۔  
میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہ آیا تھا کہ وہ پہلے سے ذرا لمبی ہو گئی تھی اور چہرے کی اداسی بڑی  
گرائی اور تانت آگئی تھی۔ چنار کو یوں لگا جیسے بنگال کے گنجان جنگلوں میں ساگوان اور ناریل کے تارک  
جھنڈوں میں موسلا دھار بارش کے بعد چاکلہ منہر اسورج نکل آیا ہو اور ساگوان کے گیلے تنوں پر پور  
چکنے لگا ہو۔ جیسے وقت کے بیٹنے پر سے گیارہ سالوں کے بھاری پتھروں کی سیلیں ایک ایک کر کے آ  
گئی ہوں اور جیسے کسی نے دونوں ملکوں کی بیوہ سرحد کی دیوار مانگ میں محبت، خوبصورتی، اور  
مستون کا سیندھور بھر دیا ہو۔ جیسے شانتی نکتین کے سب کو دھکھل گئے ہوں اور سفید و براق خوشی  
پرندے خدا کی الوہیت اور انسان کی عظمت کے گیت گاتے چاندی ایسی دھوپ میں پرواز کرنے  
ہوں۔

سچتر اتم کلکتے کا ذکر کر کے میرے دل پر تیر چلا اور میں لاہور کی باتیں سن کر تمہاری  
یادوں کو آواز دیتا ہوں۔ کہو! کیا وہاں اب بھی بارش ہوتی ہے؟ کیا چندر گم سے بڑا  
جانے والے راستے پر اب بھی کوئی دیو داس۔ اپنی پارٹی سے ملے جاتا ہے؟ کیا اب بھی  
کوئی نیگور شانتی نکتین کی کھلی نغماں میں بیٹھ کر انسانی محبت اور خوبصورتی کا درس دیتا ہے؟ کیا

بچوں سے اور ان کے پھول ایسے ترمازہ سکراتے ہوئے معصوم چہروں سے بیکر کرنا ہوں۔  
مجھے تمہارے لیڈروں سے کوئی سروکار نہیں۔ اس لیے کہ وہ متعصب ہیں، تنگدل ہیں، الزامی کے  
متلاشی ہیں اور ایسے دیوانے بھی ہیں جنہوں نے ابھی تک ہمارے ملک کو تسلیم نہیں کیا۔ میں  
بیگم کا پرستار ہوں اور گوتم بدھ سے محبت کرنے والا ہوں اور سب سے بڑھ کر روشنیوں  
کی روشنی، سچائی، عقلمندی کی عظمت، اور پیغمبروں کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم  
کے قافلے میں سے ہوں۔ میں امن اور ملاپ کا نغمہ گدھوں۔ لیکن اگر کبھی تمہارے سر پر  
لیڈروں نے جنگ کا اعلان کر دیا تو پھر ایک مٹین گن میرے ہاتھ میں بھی ہوگی جس کا منہ  
تمہارے امیر، سربا، س، بردوان اور کلکتہ کی طرف ہوگا۔ پھر میں تیرے لیے ہر چاہتا ہوں،  
ارجن کی طرح، چمکپاؤں گا نہیں۔ پھر بدھ ہوگا، جنگ ہوگی، امن کے لیے، محبت کے لیے،  
بتا کے لیے، نشوونما کے لیے اور عزت کے لیے۔ اس لیے کہ مجھے لاہور کی سڑکیں  
پراسکول کی طرف جانے والی بچیوں سے کبھی پیار ہے۔ تم سن رہی ہونا سچتر۔“

مگر سچتر خاموش تھی۔ وہ سر جھکائے چل جا رہی تھی اور گلاب کا بل سا کھلا ہوا پھول اس کے باہ  
جوڑے میں جھک رہا تھا اور ایک بسنتی پروں والی تتلی اس کی کھلی ہوئی پنکھڑیوں پر بیٹھنے کی کوشش کر  
رہی تھی۔

اگلے روز چنار نے سچتر کو مرینو ہوٹل میں کافی بلائی۔

اس دن سچتر نے سنہرے باؤر والی ہلکے جامنی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی جو اس کے کندھے  
پر بڑی پھب رہی تھی۔ وہ دونوں مرینو کی گیلری میں اگلی قطاروں والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔  
انہیں نیچے بال کا سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دائیں پر بینڈ بجانے والوں نے بال کی چھت  
اٹھا رکھی تھی۔ ان کا میوزک بالکل ٹکرس میوزک معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ہاتھیوں کو نچلنے  
کے لیے بینڈ بجا رہے ہوں۔ بینڈ باجوں کے شور میں لوگ اونچی آوازوں میں باتیں کرتے اور جیم  
بند ہوتا تو وہ پھر آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیتے۔ چنار کو یاد آگیا کہ بحرن سے آئے ہوئے  
کے ایک باؤق دوست نے ان لوگوں کو بینڈ بجاتے اور پھل کود مچاتے دیکھ کر کہا تھا۔

”معلوم ہوتا ہے میوزک کا کارخانہ چل رہا ہے۔“

خدا کر کے میوزک کا یہ کارخانہ بند ہوا اور چنار اور سچتر نے اطمینان کا سانس لیا۔ سچتر جب  
اتھ ہال میں بسے گذری تھی تو عورتیں اور مرد اسے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ ان  
کی اعلیٰ کوٹھیوں میں رہنے والی خواتین نے سچتر کو کبھی بھی آنکھوں سے دیکھا جنہیں  
نیتی سارھیاں میسٹریں لیکن پہننے کا سلیقہ اور ذوق نصیب نہ ہوا تھا۔ ہال میں بیٹھے  
اب بھی کسی وقت سر اٹھا کر گیلری کی جانب ان دو دوستوں کی طرف دیکھ لیتے تھے۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ سچتر نے چنار کی پیالی میں کافی اڈ لیتے ہوئے پوچھا۔  
”ایک اخبار میں کام کر رہا ہوں۔“

”شادی نہیں کی ابھی؟“ سچتر نے نظریں نیچی ہی نیچی کیے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”تم نے شادی کر کے کیا پایا ہے؟“

”اپنا بچہ دیو۔ پیارے بچے۔ ایک چھوٹا سا گھر۔ رسوئی۔ ماں کی ماننا، سنی

پیار۔ جب وہ دفتر جانے لگتے ہیں تو میں ان کے لیے چلے بناتی ہوں اس کے

دبچوں کو کپڑے پہنا کر نوکر کے ساتھ سکول روانہ کرتی ہوں۔ پھر گھر بھر کو ٹھیک ٹھاک

دکھ ہوں۔ پڑانے کپڑوں کی مرمت کرتی ہوں۔ رات کو بچوں کو اپنے ساتھ لٹا کر انہیں

بیل کی کہانیاں اور مٹھی مٹھی پوریاں سناتی ہوں۔ پھر وہ میرے ساتھ لگ کر سو جاتے ہیں۔

دیریری ساری تنکھن اتر جاتی ہے اسارے فکر دور ہو جاتے ہیں۔ میں منہ اندھیرے

لگا ہوں۔ نہادھو کر ٹانگ میں سینہ دھو رہتی ہوں۔ تلمی کے پودے کو پانی دیتی ہوں۔ ٹانگ

لپڑیوں کے لیے چاول کھیرتی ہوں۔ رتن جو کے پھول توڑ کر درگا دیوی کے چہروں میں

دکھائی دے گا اور بگوان سے اپنے تہی دیو اور بچوں کی سلامتی کی دعا مانگتی ہوں۔ اس سے

بازہ مجھے اور کیا چاہیئے۔“

”کیا تم اپنے خاوند سے کبھی پور نہیں ہوتیں؟“

چنار نے پٹری اور اس کے موتیوں ایسے دانت چمک لٹھے۔

”مارے یہ تم کیا کہنے لگے۔ بھلا کوئی تپنی اپنے تپ سے بوری بھی ہوئی ہے؟ وہ تو میرے  
گھر کی روشنی ہیں۔ میرے نانک کا سہاگ ہے۔“  
”کیا تم اپنے خاندان سے محبت کرتی ہو؟“

”محبت، میاں بیوی کے لیے بڑا چھوٹا لفظ ہے۔ محبت سے بھی بڑھ کر میں تو ان کی پڑا  
کرتی ہوں۔ انھوں نے مجھے میرے پیارے بچے دیئے ہیں۔ میرے گھر کا سکھ دیا ہے۔ میرے  
کیلئے میں ماں کی ماتا کو جگایا ہے۔ وہ تو میرے لیے بھگون سماں ہیں۔“

”کبھی میں بھی تم سے محبت کرتا تھا سچتر۔“  
”اچھا؟ مجھے یاد نہیں۔ سنو امیری چھوٹی بچی کا نام ایراوتی ہے۔ اسے بھگن گانے  
کا بڑا شوق ہے۔“

”میں کالج کے دروازے پر گھنٹوں تمھاری راہ دیکھا کرتا تھا۔“  
”سچ؟ مجھے تم نے بتایا کیوں نہیں؟ اور سنو تو۔ ایک دن ایراوتی نے کیا کیا  
۔۔۔ میرے سنگار میز پر سے تیل اٹھا کر ساری بوتل اپنے بالوں میں انڈیل لی۔ میرا تو  
مارے ہنسی کے۔۔۔۔۔“

”تمہیں کالج کے میوزک کنسرٹ کی وہ رات یاد ہے؟ اس رات تم نے سرخ ساڑھی  
پہن رکھی تھی اور تمھارے کانوں میں سیاہ پتھر کے چیلے بندے جگمگا رہے تھے۔ تم شعلہ بنی  
یٹھ پڑی تھی گارہی تھیں۔“  
”میں تو اب بھی گاتی ہوں، مگر صرف گھر میں اور اپنے تپ دیو کے سامنے تمہیں ایک

گیت سنائوں؟“  
اور سچتر نے دھیمی دھیمی آواز میں ننگال کے ایک مشہور لوک گیت کے دو کیرے گنگائے

”نہ دیکھی لام تار چند رموکھ

نہ کمی لام سینہ ہر سیر کرتھارے

کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے!

”نہ جی بھر کر دودھ پلایا اپنے بچے کو

نہ جی بھر کر دیکھ بائی اس کا چاند سا گھڑا  
نہ جی بھر کر اس سے پیار کی باتیں کر پائی  
کیسے تیکھے تیرے گھائل کر دیا تو نے  
او بھائی تیر انداز!

”بھگن ششمو مور کھڑے چلے

کاندی بے ماں ماں بے

تار ڈاک دیوتا۔ بوکے شچیمہ باجی بے رے

کی شیل ماری لی بھائی تیر انداز رے

”جب میرا بچ بھوک سے تڑپ اٹھے گا

ماں! ماں! کہہ کر روئے گا

اس کی پکار دیوتاؤں کے دلوں میں گونج اٹھے گی

کیسے تیکھے تیرے گھائل کر دیا تو نے

او بھائی تیر انداز!

سچتر! آواز کچھ بوجھل سی ہو گئی اور آنکھوں میں نمی سی جھلک اٹھی۔ شاید اسے اپنے بچے یاد آ گئے  
لگتے ہیں تھے، اگرچہ اب وہ ماں کا دودھ نہیں پیتے، لیکن ماں تو اپنے بچے کو عمر بھر دودھ پلاتی  
رہی کے اس گیت میں دکھ بھری انسانیت کی پکار تھی۔ مجبور اور بے بس انسان کے دکھوں کی بپتا  
کا انسان اس زخمی ہر نی سے کتا ملتا جلتا ہے وہ بھی گھائل ہے اور ان دیکھے شکاری کے  
بھینس لیے جنگل کی خون آلود زمین پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ اسے ایک ایک کر کے اپنے مارے بچے  
بھرے، سارے سکھ، ساری خوشیاں یاد آ رہی ہیں۔ وہ شکاری کے ظلم کا شکار ہے مگر بھڑکی  
اٹا تیر انداز کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ کیا زخمی ہر نی کی پکار کبھی نہ سنی جائے گی؟ پتار کے دل پرس  
بلا تھ ہوا تھا۔ مگر وہ خاموش رہا۔

”اور کافی سچتر!“

”نہیں۔ تمہیں گیت پسند آیا؟“

”بہت۔ یہ جنگل کی سہرنی کی پکار تھی میں تمہیں خانہ بدوش دریائی مانجھی کا ایک گیت سناتا ہوں۔ یہ گیت میں نے دھاکہ سے سلٹ جاتے ہوئے نڈان گنج میں دریائے منگینا کی لہروں پر ایک مانجھی سے سنا تھا۔ مجھے جنگلی گیت یاد نہیں رہا۔ ہاں اس کا ترجمہ ضرور یاد ہے۔“

چخار نے سگریٹ بنا کر سگایا۔ ایک ہلکا سا کش لے کر آنکھیں بند کیں۔ اس کی پکیں سلگ رہی تھیں۔ آنکھیں کھول کر اس نے سچتر کو دیکھا جو اپنی بڑی بڑی پکیں اٹھائے بڑے نمکین انداز میں اسے تنک رہی تھی اور ہمہ تن گوش تھی۔ چخار نے گیت کا ترجمہ سنا شروع کیا۔

”الوداع! امیرے دوستو! الوداع!“

میرا گھر دریا سے پدما میں ہے۔

ہم جانوروں کو پکڑنے والے لوگ ہیں

ہم ان جانوروں کو بیچ کر اپنی روزی کاتے ہیں

ہماری خوشی کی کوئی حد نہیں ہے

ہم ان قیمتی پتھروں کا بھی کاروبار کرتے ہیں

جو ہم جان کی بازی لگا کر

زہریلے سانپوں کے بلوں سے نکال باہر لاتے ہیں

ہم دریا کے ایک کنارے پر موٹے چادل پکاتے ہیں

اور دریا کے دوسرے کنارے پر جا کر انھیں کھاتے ہیں

ہمارا کوئی گھر نہیں

ساری دنیا ہمارا گھر ہے

دنیا کے سارے لوگ ہمارے بھائی ہیں

ہم اپنے لوگوں کی تلاش میں

ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک چلے جاتے ہیں۔“

اچانک ہوٹل کے ہال میں داس پر میوزک کا کارخانہ چلنا شروع ہو گیا اور فضائیں گھلنے لگیں۔

پکارا اور نڈان گنج کے خانہ بدوش کا پڑا اثر آزاد گیت گم ہو کر رہ گئے۔ اب ان دونوں کے لیے ہاں ہاں ممکن ہو گیا تھا۔ وہ آٹھے اور ہوٹل مریٹو کے بڑے آئینہ دار دروازے سے نکل کر باہر مال روڈ گئے۔ باہر سچتر کے پتاجی کے گات روڈ والے رشتہ دار کی چھوٹی سی کالی کار کھڑی تھی۔ ڈرائیور دروازہ کھولا۔

”کیا میرے ساتھ گھر تک نہ چلو گے؟“

”میں تمہارے ساتھ جنگل تک جانا چاہتا ہوں سچترا۔“

”تو پھر کبھی ملنے وہاں آ جاؤ ناں۔“

”اگر زندگی نے وفا کی تو دیو داس اپنی پارٹی سے ملنے ایک بار بروہان مزدور آئے گا۔ اچھا نمسکار۔“

”نمسکار۔“

سچترا ہاتھ جوڑے کھڑی بی رہ گئی اور چخار اس سے جدا ہو گیا شاید ہمیشہ کے لیے۔ سچترا ذرا سا باہری۔ اس مسکراہٹ سے اس کے دل آویز چہرے کی اداسی کو زیادہ گہرا سنگین اور درد انگیز بنا دیا۔ سادھی تنہا لٹی کار کی پچھی سیٹ پر بیٹھ گئی اور کار رات کی روشنیوں اور اندھیروں میں مال پر سے لڑائی کا گات روڈ کی جانب بھاگنے لگی۔

چخار کا دل آج شام بڑا اداس تھا۔ وہ گھر جانے کی بجائے اس کلب کی جانب چل دیا جہاں اسے ہاتھ لگنے والے ڈیڑی یا می کے ساتھ ضرور بیٹھی ہوگی۔ وہ کلب کے ہال میں آ گیا مگر یہاں اور بھی لوگ تھے صرف نمی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

”ہائی چیری!“

جی کو لانے نیچے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

”ریار چیری! آج تو کوئی بھی بے بی دکھائی نہیں دے رہی۔ سب بوڑھی گھوڑیاں

بیٹھی ہیں۔“

اسنے میں دروازے کے باہر ایک کار آکر رکی۔ جی کو لا فوراً اس طرف پکا۔ چخار نے نمی کی گاڑی ہال میں لے کر دروازے پر سے ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کار کا دروازہ کھلا اور اندر سے نمی اپنی می کے ساتھ باہر نکلی۔ لا کولنے بڑے مخصوص سفارقی عہدیداروں والے انداز میں ان دونوں کا خیر مقدم کیا اور نمی سے

بیچ بنگال کی طرف سے آتے والی ہواؤں میں جھوٹا کرتے ہیں۔ مدت ہوئی اس کچے راستے سے ایک بیل گاڑی گزر رہی تھی۔ اس بیل گاڑی میں ایک قریب المرگ نوجوان بیٹھا تھا جو اپنی محبوبہ کے آخری درشنوں کو اس کے گھر جا رہا تھا۔ اس نوجوان کا نام دیو دیا تھا۔

زلفی کے چہرے پر چمک آگئی۔

دیو دیو داس؟ ہاں ہاں اس کی تو فلم بھی لگی تھی۔ وہ گانا اسی فلم کا تھا۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں

تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا  
سوئے ہوئے مرنے کو جگایا۔  
پناہ سہرا بکھڑایا۔

باتیں کرتا اس کے ساتھ کلب کے ہال کی طرف آگیا۔ یہاں چار کھڑا تھا۔ نجی اسے دیکھ کر ذرا ٹھٹھکیا مگر فوراً ہی مسکرائی اور ہائی چیری، ”کہہ کر چار کی خیریت پوچھی۔ چار خاموش رہا۔ جی کو لائے چار کو بھی اپنے ساتھ کافی کی ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی مگر وہ شکریہ ادا کر کے کلب کے بار روم میں آگیا وہاں سے ٹیکل کرتا گئے میں بیٹھا اور سیدھا گھر آگیا۔

گھر میں ڈاکٹر ہومیو نے خاص طور پر بھینس کے پائے پکوار کھے تھے اور پٹنگ پر اُلتی پالتی ادا سامنے ایک بڑا سا پایہ رکھے وہ اسے مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ زلفی باورچی خانے میں زلف مانتے پر ڈالے روٹیاں پکا رہی تھی۔ نویں جماعت والی تنک مزاج اختر دوسری انگلیٹھی پر چائے کے لیے پانی کو خوش دے رہی تھی۔ چنار نے ان لوگوں کو ہمیشہ ناپسند کیا تھا۔ آج تو اسے یہ لوگ زہر لگ رہے تھے زلفی کے ماتھے کی لٹ لٹے یوں لگی جیسے اس نے کالا پتھر اچھا کر کھا ہو۔ اختر کی تنک مزاجی اسے غصہ طوائف کا خنجر معلوم ہوئی اور ڈاکٹر ہومیو ایسے لگا جیسے کسی مردہ سانڈ کی ٹانگ چبا رہا ہو۔ اگر نے نفرت کی ایک جلتی ہوئی بھر پور نگاہ ان لوگوں پر ڈالی اور کچھ کھائے پئے بغیر اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ رات گئے تک بحاف میں لیٹا آنکھیں ریلے ٹائم میبل پر بجائے سچتر کے منظر سوتھا رہا۔ کوئی بارہ بجے کے بعد دروازہ آہستہ سے کھلا اور زلفی پلیٹ میں چاول اور پیاز کی زبان رکھے اندر داخل ہوئی۔

”آپ نے تو کچھ کھا یا ہی نہیں۔ آخر کیا ناراضگی ہو گئی؟“

”اس تھالی میں کیا لائی ہو؟“

”بھینس کی زبان۔“

”لاؤ۔ میں زبان کھاتا ہوں تم اتنی دیر میرے کان کھاؤ۔“

”آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ کوئی بات بھی تو ہو۔“

”زلفی تم نے کبھی بردوان کا نام سنا ہے؟“

”یہ کون آدمی تھا؟“

”آدمی نہیں ایک سٹیشن کا نام ہے جہاں سے ایک کچی ٹرک کھیتوں کھیت گزرتی کسی زمیندار کی پرانی حویلی کو جاتی ہے۔ یہاں دونوں جانب چھالیہ اور تاریل کے پٹر

نہ بیٹھی تھی۔ ہر عورت نے بہترین سارھی اور جی بھر کر سونا پین رکھا تھا۔ ایک لڑکی انتہائی حسین تھی۔  
 لڑکیں کیلے کی شکل۔ چہرے پر ایک من موٹی مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔ آنکھیں بڑا دن تھیں اور اسی  
 کی سارھی پین رھی تھی۔ چنا کو وہ اس لیے بھی پیاری لگی کہ وہ کسی بات میں خواہ مخواہ دخل نہیں  
 دے رہی تھی۔ دوسری عورتوں کی طرح بڑھ چڑھ کر پھیکے لطیفے نہیں سن رہی تھی جس پر مہمان محض  
 رکھنے کے لیے جی بھر کر سن رہے تھے۔ ایک عورت نے جس کا بے بی نوکرانی باہر لان میں  
 بیٹھی تھی، ہارمونیم پر نغمہ کی غزل سنائی۔ سرکاری افسر لوگ جہائیاں لینے لگے۔ دوسری عورت  
 تانگیشکر کا گایا ہوا ایک فلمی گیت سنایا۔ ایک نوجوان افسر نے کسی پھیٹیچر شاعر کی بڑے ہی بھونڈے  
 لڑیں شعر سنانے کی نقل اتاری اور رات کے ۲ بجے یہ انتہائی بور محفل ختم ہو گئی جس کا  
 لے چار کے ہر آدمی نے پیٹ بھر کر لطف اٹھایا۔

دوسری شام کو چنا راکھیا ہی چٹا گانگ کے بازاروں میں گھومتا پھرا۔ کھلے کھلے کشادہ بازار پہلی  
 اور دھنوں میں لقمہ نور بنے ہوئے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر قدرے رونق تھی اور دکاندار نہیں  
 دکانوں سے بات کر رہے تھے۔ چنا نے ایک کتابوں کی دکان میں داخل ہو کر تصویروں والے کچھ  
 گزری رسالے دیکھنے شروع کر دیئے۔ پھر وہ یہاں سے نکل کر پرتا سامان فروخت کرنے والے  
 یکا باریے کی دکان میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر تک مختلف چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ ہر چیز  
 قیمت پوچھی اور بغیر کچھ لیے دکان کی غضب ناک نگاہوں کا لطف اٹھاتا آگے چل پڑا۔ ایک جگہ  
 اپنا ایک اسے نینگالی گانے کی آواز سنائی دی۔ وہ رگ گیا۔ قریب ہی گراموفون ریکارڈوں کی  
 دکان تھی جہاں کسی عورت کا نینگالی ریکارڈ بچ رہا تھا۔ چنا اس دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اور  
 بڑے سکون سے کاؤنٹر کے ساتھ لگ کر گیت سنتا رہا۔

گیت کی لے اس قدر اتر اٹھی اور طرز اس قدر پراثر تھی کہ چنا مسخوڑ سا ہو کر رہ گیا۔ جب  
 گیت ختم ہو گیا تو اس نے دکاندار سے جو نوجوان نینگالی تھا گانے والی کا نام پوچھا۔

”آر پلا سین“

”اس گیت کا مطلب کیا تھا؟“

ینگالی دکاندار نے ذرا مسکراتے اور ذرا شرماتے ہوئے گیت کا ترجمہ کیا۔

تین دن بعد سچتر اوپس کلکتے چلی گئی۔  
 چنا اس کے بعد اسے بالکل نہیں ملا اور نہ اسے ٹیشن تک چھوڑنے گیا۔ لیکن اتنا مزہ رہا  
 کہ اس کی روانگی کے بعد چنا رکاوٹ نگیں ہو گیا اور لاہور کی سڑکوں، ہوٹلوں، دوستوں اور  
 گلی کوچوں سے اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ پہلی تاریخ کو جب اسے دفتر سے تنخواہ ملی تو اس  
 نے اپنی بہن کی شادی کا بہانہ بنا کر ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی لی اور کراچی سے بحری جہاز میں سوار  
 ہو کر ایک روز چٹا گانگ کی بندرگاہ پہنچ گیا۔ جیٹی پر اچھی خاصی رونق تھی۔ رنگوں سے ایک  
 جہاز ابھی ابھی اگر دوسری گودی پر لنگر انداز ہوا تھا۔ اس جہاز کا نام PYIDAWN YUN تھا  
 یہ جہاز رنگوں سے چل کر یہاں جا کر دن میں پہنچا تھا۔ چنا نے کراچی سے روانہ ہوتے ہوئے اپنے  
 ایک دوست کو تار دے دیا تھا جو اسے لینے کے لیے بندرگاہ پر موجود تھا۔ اس دوست کا نام  
 مرزا حیدر بیگ تھا۔ یہ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوا تھا اور ایک زمانے سے چٹا گانگ میں کاغذ  
 کا بیوپار کر رہا تھا۔ اسی شام وہ چنا کو اپنے ایک دوست کے ہاں دعوت پر لے گیا۔ یہ کوٹھی  
 ایک چھوٹے سے ٹیرس پر واقع تھی جہاں پہنچنے کے لیے ایک اڈہ پر چڑھتی ہوئی گول سڑک کا چکر  
 کاٹنا پڑتا تھا۔ رات بڑی خوبصورت تھی۔ چٹا گانگ کی خوبصورت عمارتیں ادھر ادھر ٹیلوں اور درختوں  
 کے جھنڈوں میں کھڑی جگمگا رہی تھیں۔ فروری کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈی اور نرم ہوا چل رہی تھی۔ جس  
 کی وجہ سے فضا میں شکر پیدا ہو گئی تھی۔

کوٹھی کی لمبی سی نشست گاہ میں چٹا گانگ کی جیتی ہوئی خوبصورت خوش لباس اور کندہ

”یہ تو کو تم کتنی دیر اور پردیس میں رہو گے؟“

”کیا تمہیں رات کو نیند آ جاتی ہے؟“

”کھیت سوکھے پڑے ہیں۔“

”کالے بادلوں موسلا دھار مینہ برساؤ“

”سفید بادل آتے ہیں“

”اور سفید نہیں اتر جاتے ہیں۔“

”تم کب تک چٹھا بادبان کھولے“

”پرہادریا کی لہروں پر گھومتے رہو گے؟“

”کیا تمہیں رات کو نیند آ جاتی ہے؟“

”بنگالی دکاندار نے ریکارڈ ٹھانے میں ڈالنا چاہا۔ اس کا خیال تھا کہ گاہک کو یہ گانا پسند آیا ہے تو وہ اسے ضرور خرید کر رہے گا۔ اسے کیا خبر تھی کہ عام طور پر اچھے گانوں کے ریکارڈ ہی لوگ خرید سکتے جو موسیقی سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ چنار کان لپیٹ کر باہر نکل آیا اور دوکاندار سے آرپلا سین کے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔“

یہ چٹا گانگ کار یا ض الدین بازار تھا کتنے خوبصورت بازار کا کس قدر غیر دماغی نام رکھ چڑا تھا ان لوگوں نے۔ چنار کو عجیب و غریب قسم کا ذہنی تجربہ ہو رہا تھا کبھی کسی مکان کی طرف سے کسی بہت ہی پرانے گیت کی صدا آ جاتی اور کبھی کسی لڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے خفا تیز خوشبو محسوس ہوتی۔ اسے ان پرانے اور تاریخ کی گرائیوں میں ڈوبے ہوئے جنگلوں کا خیال آ رہا تھا جہاں کالی آنکھوں والی دیو داسیاں بالوں میں ترناری کے پھول سجائے، جموں پر تپوں کی جھالیں لٹکائے انسانی محبت، وحشت اور بربریت کے گیت گایا کرتی ہیں جہاں زرد آنکھوں والے خونخوار چیتے دن دہارے انسانی خون کی بوبا کر اٹھیں اٹھائے جاتے ہیں اور جہاں گہری کالی زرد جھیلوں میں کھلے ہوئے کنول کے سفید پھول ان براق کیوتروں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو جھیل پر پھیر رہے ہیں۔“

”کر گے ہوں اور گرتے ہی پھیرا گئے ہوں۔“

”اوپر سے آنے والی ہوا میں جھوم ہے تھے۔ چنار ایک جگہ پان کھانے کے لیے رک گیا۔ پان بیچنے۔“

”لاؤ غم لڑکا تھا جس کی کالی آنکھیں بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ چنار نے پوچھا۔“

”کیوں یار! تمہارا نام کیا ہے؟“

”جی محمود عالم۔“

”اچھا یار پان کھلاؤ۔“

”تیری پان یا بنگلہ پان یا بو؟“

”بنگلہ پان دوست! محمود یار تمہارا شہر بڑا پیارا ہے۔ کیا تم پڑھتے ہو؟“

”جی ہاں۔“

”تھوڑی تھوڑی محبت بھی کیا کہ محمود عالم۔“

”اتنے میں ایک خوبصورت لڑکی قریب سے گزری۔ اس کے ماتھے پر تنک تھا جو بڑے میں چپا کلی

یہ سفید پھول تھے۔ آنکھوں میں منہ زور آنکھوں کا سرنگیں خمار تھا۔ چنار اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور

پان دے سے آنکھ مار کر بولا۔“

”تھوڑی تھوڑی محبت بھی کیا کہ محمود عالم۔“

رات کو چنار کے دوست مرزا بیگ نے اپنی بوٹ پر دو سنتوں کو پارٹی دی۔ خوش اندام نازک

بگلی لڑکیاں اپنے بھائیوں اور خاندانوں کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھیں۔ آسمان پر شام ہی سے بادل

جگمگاتے تھے اور بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی باقی سب مہمان بوٹ کے لائونج میں بیٹھے کافی پی رہے

تھے اور ایک دوسرے سے کاروبار کی سرکاری ترقیوں کی، محکموں کی تجدید نو کی، چٹا گانگ کے بدلتے

ہونے موسم کی باتیں کر رہے تھے۔ چنار اور مرزا نے ایک کین میں جاکہ مشروب سے جی بھلایا۔ آنکھوں

میں لٹکتا ہوا گہرا خمار لیے باہر ڈیک پر آ کر جھجکے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ دریا کے گدے

بانی میں بوٹ کی روشنیوں کا عکس پڑ رہا تھا اور بندرگاہ کی طرف روشنیوں کی جھللاتی قطاریں

دکھائی دے رہی تھیں۔ تیز ہوا میں چنار اپنے تئیں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

مرزا نے ڈیک پر چنار کا تعارف اپنی ایک گرل فرینڈ سے کر دیا۔ کیم۔ یہ اس بگلی لڑکی

کا نام تھا رنگ گندمی تھا جو شام کے بعد چنار کو سنہری دکھائی دے رہا تھا۔ سفید سکی ساڑھی پر سیاہ

بجولوں کی پٹھریاں جی ہوئی تھیں۔ سیکھے ناک کے سرے سے ایک عجیب ویران سی کبیر ہونٹوں

”یہ کہہ رہا تھا۔ دریا کی لہرو! میں تمہارے سینے پر ہزار ہا سالوں کے کشتی کے رہا ہوں۔ لیکن میرے سینے کی آگ تمہارے دل کی بجائے میری سرور میں کر سکا۔ ہمارا واس پھر نہیں! ہم کل سمندر کی موجوں سے ہم کن رہیں گے۔“

چنار نے کسم کے ہاتھ پراپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کسم کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا اور کانپ رہا تھا۔ دریا لہروں کی مانند اس ماہی گیر کے دل کی مانند۔!

اگلے روز چنار گاڑی میں بیٹھا چنار کا گنگ سے دھاکہ کی طرف جا رہا تھا۔

ہرے بھرے بانس کے سرسبز بھنڈ۔ چھالیہ کے درختوں کے ذخیرے، کیلے کے درختوں کی قطاریں اور دھان کے گہرے سبز لہلہاتے کھیت گذرتے چلے جا رہے تھے۔ وقت کی ہر خوبصورت یاد دہانی کی سمت، ماضی کی طرف، اندھیرے کی طرف بھاگی جا رہی تھی اور گاڑی آگے ہی آگے اڑتی جا رہی تھی۔ سورج کی طرف، روشنیوں کی طرف مستقبل کی طرف، دھاکہ کی طرف! آم اور کیلے کے گھنے باغوں کے بیچوں بیچ جانے والی پگڈنڈیوں پر سفید سبز اور سرخ دھوتیوں والی دو تین کالسی کی گاڑیاں اٹھائے تالابوں کی جانب پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ ننگ و مڑنگ، مٹی میں سے ہوئے کالے کالے معصوم بنگالی بچے گاڑی کا تماشا کرنے کھیتوں میں بھاگتے ہوئے آتے اور پھر دوڑ کھڑے ہو کر ہاتھ ہانا شروع کر دیتے۔ بان کے چاروں طرف سے ڈھکے ہوئے کھیتوں میں مزدور کام کر رہے تھے۔ گاڑی دریا کے کنارے گزرتی تو پانی کی پرسکون نیلی سطح پر کشتیوں کی قطاریں رواں دواں دکھائی دیتیں۔ بانس کی کھیریل والی دھلوان چھتوں والے مکانوں کے اوپر کیلے کے جوڑے جوڑے پتوں والے درخت ہو ایسے سرسبز رہے تھے۔ جھونپڑوں کی ڈھلانی چھتوں کے کنارے نیچے کو اکر اندر کو مڑ گئے تھے۔

پھول باڑی، فینسی، فریڈ پور، کو میلا۔ پرانے مکانوں کی بارش زدہ کالی کالی دیواریں۔ جھوٹے چھوٹے ننگ دروازے، لمبوتری کھڑکیاں، زمردیں، قرمز، کالسی اور کتھی دھوتیوں والی کمان عورتیں، نیم عریاں جن کا کش نیگا کھیت مزدور، کھیتوں سے بلند ہو کر غریب استیوں کی جھونپڑوں میں گم ہوتی ہوئی پگڈنڈیاں، جھونپڑوں کی چھتوں پر چڑھی ہوئی کدو کی سفید پھولوں والی بلیں گندے اور کالے لگے تالابوں میں اترتی ہوئی پتھولی سیریاں جن کی درازوں میں گھاس آگ آئی تھی۔

کے کنارے تک چلی گئی تھی۔ سیاہ لمبے بالوں کی ایک چوٹی اس کے اکھیرے ہوئے سینے پر پڑی تھی۔ جب وہ مسکرائی تو اس کے خوبصورت دانت چمک اٹھے۔ چنار کی آنکھیں شدت سے درد سے بوجھل سی ہونے لگیں۔

اے دل! اب عمر نہیں بھر ہو۔ کیا جانے پھر کب اس لڑکی سے ملاقات ہو؟ پھر کب یہ صورت دیکھی نصیب ہو؟ وقت کی جھولی میں سے یہ ایک ان مول لمحے کا موتی اچھل کر تمہارے دامن میں آگیا ہے اے اپنے سینے سے لگا کر اسی دریا میں چھلاگ لگا دے اور پھر کبھی پلٹ کر نہ سمجھے نہ دیکھے!

مرزا ان دونوں کو دیک پر اکیلا چھوڑ کر اندر مہانوں کی خیر گیری کو بلا گیا۔ چنار اس لڑکی کے قریب آگیا۔ وہ دونوں دریا کی طرف منہ کر کے جنگل پر جھک کر کھڑے ہو گئے۔ تیز ہوا میں کسم کے سیاہ بال اس کے ماتھے پر اُڑ رہے تھے۔

”کسم! کیا تم سے پھر بھی کبھی ملاقات ہوگی؟“

کسم نے دریا کے دوسرے کنارے پر ٹٹماتی ہوئی روشنیوں پر نظریں جما کر کہا۔

”شاید۔ کبھی نہیں۔“

”کیوں؟“

چنار نے سرگوشی میں کہا۔ اسے اپنی آواز پر کسی دوسرے کی آواز کا شبہ ہوا۔ دریا کی تیز ہوائ نے اپنے دل کے کھنڈروں میں بین کرتی سنائی دی۔

”کیوں کسم؟ کیوں؟ کیا یہ جادو کی رات ہماری آخری رات ہے؟ کیا تم رات کی رات

اس خواب کی کشتی پر مل کر ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاؤ گی؟“

کسم کچھ نہ بولی اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے سے تھے۔ آنکھوں میں گہری محویت کی پراسرار چمک تھی اور ہمتا ہوا جسم چپا کلی کی دیوانی خوشبو اڑا رہا تھا۔ ایک چھپر اپنی چھوٹی سی کشتی کو کھیت موابٹ کے پیچھے سے گذرا۔ پانی میں چھپک چھپک کی آواز پیدا ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے گلے جا رہا تھا۔ جب وہ گذر گیا تو کسم نے گہرا سانس لیا اور خواب ناک آواز میں بولی۔

”جانتے ہو یہ ماہی گیر کیا کارہا تھا؟“

”نہیں کسم۔ میں کچھ بھی سنس جانتا۔“



فینی سے گاڑی چل کر ذرا باہر نکلی تو لائن کنارے والی آبادی میں ایک بچہ نے آنگن والے پیر کی ٹنٹی جھکا کر سنٹی بھول توڑے اور اُسچلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اندر یقیناً ایک دیوان خانہ ہوگا۔ شریفانہ نشست گاہ۔ ایک تخت ہوگا جس پر چادر بچھی ہوگی۔ بچہ سنٹی بھول گلدان میں لگا دے گی۔ رسوئی سے کسی عورت کی آواز آئے گی۔

”آئی دیدی“

اور وہ بچی اتنا کہہ کر دوسری طرف نکل جائے گی اور وہ کمرہ ویران رہ جائے گا۔ لیکن اس کی ویرانی میں بھی ایک بھر پورا آبادی ہوگی۔ ایک سرخ ملک والی لڑکی اپنے مکان کی کھڑکی کا آدھا پٹ کھولے گذرتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہی تھی۔ چارنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے منسکار کیا۔ لڑکی نہ شرانے اور نہ پیچھے ہٹی۔ بڑی حیرانی سے اسے دیکھتی چلی گئی۔ مگر بانس کے پٹ والی کھڑکی گاڑی کے ساتھ ساتھ نہیں آسکتی۔ شاید اس لڑکی کی نگاہیں دھماکہ تک گاڑی کے ساتھ ساتھ آئی ہوں۔ چارنے سگریٹ بنا کر سلگایا۔

اب اس لڑکی کو پھر کبھی دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ اب دوبارہ اور شن نہیں ہوں گے۔ اس اٹھا ہنذر میں ایک خوبصورت چہرہ پل بھر کے لیے ابھر کر ڈوب جاتا ہے اور پھر کبھی دکھائی نہیں دیتا۔ شاید سالہا سال بعد کبھی بڑھاپے میں زندگی کے کسی دور پر ملقات ہو جائے۔ لیکن پھر ایک دوسرے کو کوئی بھی پہچان نہ سکے گا۔ نظر کمزور ہو چکی ہوگی۔ یادیں محو ہو چکی ہوں گی۔ جوانی کا ہیجان بڑھاپے کے ٹھنڈے سے حس سکون میں تبدیل ہو گیا ہوگا۔ پھر کسی کو یہ خیال نہیں آئے گا کہ وہ قریب آکر کھوئی ہوئی محبت کی سرگوشی میں کسے:

”میں نے تمہیں کبھی میں سے ایک بار دیکھا تھا میں نے آج تک وہ کھڑکی بند نہیں کی“

چار نہیں پڑا۔ بھلا کون کسی کے لیے گھر کی گھر کی عمر بھر کھلی رکھتا ہے۔ یہ رومانی خیالات بھی عجیب پھر قریب ہوتے ہیں۔ شام کو وہ دھماکہ پہنچ گیا۔ دھماکہ میں مرزا بیگ کے ایک دوست کے نام اس کا خط چنار کے پاس موجود تھا۔ مرزا کا وہ دوست چنار کو لینے وہاں موجود تھا۔ پیشوں بھی جوان ہی تھا اور آنکھوں کے گہرے سائے اس کی شب بیداریوں اور میخواریوں کا بھاندا پھوڑے تھے۔

چنار اپنے دھماکہ والے سے میزبان کے ساتھ شاہ باغ ہوٹل کے لائن میں بیٹھا تھا۔ وہ دونوں باتیں بھی کر رہے تھے اور کبھی کبھی کافی کے ایک دو گھونٹ بھی لے لیتے تھے۔ اس نے میزبان کا نام صالح تھا۔ صالح مشرقی پاکستان کا باشندہ تھا اور یہیں اپنے باپ کے ساتھ پٹ سن اکار دہلا کر رہتا تھا۔ صالح کہنے کو تو کاروباری تھا لیکن طبیعت بڑی رنگین پائی تھی۔ نیگالی لڑیچہ سے لگا سے بڑا لگاؤ تھا۔ قاضی نذرا لا سلام، سیکور، سرت چند، جمیم الدین، بارہوی، صدی سیبوی کے نام سے دیواروں پر تھکرے پرستار گم نام دیہاتی شاعر کبیتاؤں کے لافانی ٹکڑے اسے زبانی یاد تھے۔

”کبیتاؤں کی جنم بھومی اگلا تھی۔ اسی گاؤں کے ڈاک خانے میں ملازم تھا اسی بڑی کی عمر میں وفات پائی اور اس دوران میں شاید ہی کبھی شہر کا منہ دیکھا۔ وہ رومی کاغذوں کی پشت پر نظمیں لکھا کرتا جسے اس کی بیوی بعد میں کاپی پر نقل کر دیا کرتی۔ دفتر سے فارغ ہو کر اپنی بیوی کے ساتھ دھان کے کھیتوں میں پھیرا کرتا۔ کسانوں اور ماہی گیروں سے اس کا ٹرا یا رز تھا کیا تھا رے ہاں کے شاعر بھی ایسا کرتے ہیں؟ چنار نے کافی کا گھونٹ بڑی شکل سے نگل کر کہا۔

”اول تو ہمارے ہاں کے شاعر بہت کم کوئی کام کرتے ہیں۔ اگر کام کرتے ہیں تو شعر نہیں کہتے۔ اگر شعر کہتے ہیں تو صرف دوستوں کو سننے کے لیے کہتے ہیں۔ وہ ہوٹلوں میں بیٹھ کر کسانوں کے متعلق سوچتے ہیں اور کسانوں میں پہنچ کر انہیں ہوٹلوں کی یاد دلاتی ہے۔ وہ مرق عشقیہ بغلیں لکھتے ہیں اور مصیبت یہ ہے

کا کر دیا سلائی پھینکتے ہوئے کہا۔

”تم نے ابھی مشرقی نیگال نہیں دیکھا۔ یہ شہر نیگال نہیں ہے۔ یہ شہر ہے۔ جہاں مشرق بعید کے دوسرے شہروں کی طرح سوائے عزت، افلاس، گندگی اور شور کے اور کچھ نہیں۔ ہاں کہیں کہیں رضا قسم کی آبادیوں کے جزیرے منور مل جاتے ہیں۔ اصل نیگال یہاں سے گزر جانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ غربت اور افلاس تمہیں وہاں بھی ملے گا۔ لیکن یہ کہاں نہیں ہے؟ تو اب دنیا کا مقصوم ہو کر رہ گیا ہے۔ اپنے اپنے انداز میں ہر ملک میں یہ دونوں چیزیں ہمیں مل جائیں گی۔ میں یورپ کا چتہ چتہ گھوم آیا ہوں۔ میں نے وہاں بھی لوگوں کو روٹی یا شراب کے لیے چوری کرتے دیکھا ہے۔ یہاں کے لوگ موٹے چاول، ہاسی دال کھا کر کھینوں میں جفاکشی سے کام کرتے ہیں۔ ماہی گیر منہ اندھیرے جال لے کر اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی لہروں پر نکل جاتے ہیں اور رات گئے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ ان کی کمائی کا اسی فیصد دلال اور ایجنٹ لے جاتے ہیں اپنی محنت دوسروں کو سونپ کر یہ پیدائشی محنت کش لوگ الاؤ جلا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر کوئی بانسری پر بھٹیلا چھیڑتا ہے اور ایک تڑپتا ہوا زخمی نغمہ فریاد بن کر کسی نہ کسی کے لبوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ ان کے ہر گیت میں ان کے اپنے دکھوں اور مصیبتوں کی پیتا ہوتی ہے جو بات یہ دوسروں کے منہ پر نہیں کہہ سکتے اسے یہ اپنے گیتوں میں بڑی صاف گوئی سے بیان کر جاتے ہیں۔“

”کیا تمہیں ان لوگوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے؟“

”ہم شہر والے لوگ ان لوگوں میں جا کر نہیں رہ سکتے شہر کی اپنی تہذیب ہے۔ اپنی فردیات ہیں، اپنی جموریاں ہیں۔ یہاں جو ہمیں زنجیریں پڑی ہیں وہ ہمیں یہاں سے ایک اپنا نہیں ہٹنے دیتیں۔ پھر بھی میں کبھی کبھی ان زنجیروں کو اپنے ساتھ ہی لے کر دریاؤں، میدانوں، اور کھیتوں کی آوارہ گردیوں کو نکل جا یا کرتا ہوں۔ میں تمہیں ایک بڑا دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ یہ دلچسپ بھی ہے اور کچھ درد انگیز بھی۔ پھول ہارٹی سے لگے ایک گاؤں ہے۔ میں اپنی آوارہ گردیوں کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا۔ میں رات کو

کہ انھیں عشق کرنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔“

ان کی میز کی دائیں جانب دیوار والے قہقروں کے نیچے ایک میز پر کچھ لوگ بیٹھے مشروب پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک موٹا سا مہڈا امریکی تھا۔ ایک چوڑے ماتھے، باریک ہونٹوں اور چمکیلے آنکھوں والی دہلی پتلی سا بڑھی پوشش لڑکی تھی اور میسر معمولی چہرے سے مرے کا ایک عام نوجوان تھا جس کے گھنگھریالے بال خوب چمک رہے تھے۔ لڑکی سگریٹ پھونک رہی تھی اور ساتھ ساتھ کافی کی چٹکی بھی لگا لیتی تھی۔ سمجھنا بد وضع امریکی بھگ گیا تھا اور اب لڑکی کی طرف جھک کر باتیں کر رہا تھا۔ دوسرا شخص خالی خالی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ موٹا امریکی یا سگریٹ سگاتے ہوئے ہر بار لڑکی کو بھی پیش کرتا۔ وہ مجبوراً لے کر اپنا اور اس کا سگریٹ سگاتا دیتی۔ اس کے سگریٹ پینے کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے تمباکو نوشی کی عادت نہیں ہے لیکن کسی خاص مجبوری کی وجہ سے ایسا کر رہی ہے۔ مشروب بھی اس کے لیے اجنبی ہی تھا۔ مارچ نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

”اس طرف دیکھنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں۔ یہ عورت اس گھنگھریالے بالوں والے نوجوان کی بیوی ہے۔ اگر تم چاہو تو کل یہ تمہارے پہلو میں بھی بیٹھ سکتی ہے۔ ان کا نو وطنہ ہی یہی ہے۔ خاوند کو منشیات کی کٹ پڑ گئی ہے اور اپنی اس عادت کو پورا کرنے کے لیے اس نے بیوی کو کئی ایک عادتیں ڈال دی ہیں۔“

اتنے میں بیرل لے آیا۔ خاوند نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ بیوی نے مسکرتا ہوا چہرہ موٹے امریکی کی طرف کر لیا۔ امریکی نے آہستہ سے اس کے گالوں کو تھپتھپایا اور بیرل پے کر دیا۔ چار آنکھ کھڑا ہوا۔

”چلو چلیں — یہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتا۔“

باہرات بڑی خوشگوار تھی۔ آسمان مشرق بعید کے چمکیلے ستاروں سے اُٹا پڑا تھا۔ وہ دونوں ٹہلتے ٹہلتے دُعا کے خوبصورت اور خاموش ترین علاقے رتنا کی طرف نکل گئے۔ یکے کے چہرے میں گناہ درختوں کے جھنڈوں کی طرف سے آنے والی ہوا انھیں کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈی لگ رہی تھی۔ ادھر باغوں کے بیچ میں بنی ہوئی پرانی وضع کی کوٹھیلوں میں روشنیاں سو رہی تھیں۔ مارچ نے سگریٹ

سٹیشن ماسٹر کے کوارٹر کی چھت پر سوتا اور دن کو رو کر دے دیاتوں میں کئی کئی میل کے چکر لگانے نکل جایا کرتا۔ ایک دن روز کے مطابق میں چائے پی کر باہر جانے ہی لگا تھا کہ پارتنی پور کی جانب سے ایک گاڑی آکر وہاں رکی۔ میں مسافروں کو اترتے ہڑتے دیکھنے کے لیے وہاں پہل کھڑ کو ٹھہر گیا۔ ایک ڈبے میں سے کچھ میرا گی لوگ اترے۔ پہلے تھیں یہ بتا دوں کہ ہمارے ہاں بیراگی کون لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آوارہ گرد یا خانہ بدوش گوئیے ہوتے ہیں جو ٹولیوں کی صورت میں دیہاتوں میں پھیرا کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہیاہ شادی یا دوسرے خوشی کے موقعوں پر اپنے آپ ہی لوگوں کے گھروں میں جا کر اپنی فصل جماریتے ہیں اور پھر جو مل جائے لے کر آگے چل دیتے ہیں۔ عام طور پر ان لوگوں کے گیت بڑے درد انگیز اور پھرسوز ہوتے ہیں اور یہاں کے دیہاتی ان کے گیتوں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔

اب وہ دونوں رما کے علاقے سے نکلا کر دھاکہ کی ایک پرانی سڑک پر سے گذر رہے تھے یہ سڑک برقی قمتوں سے روشن تھی اور سیدھی شاہ باغ ہوٹل کی طرف نکلی تھی۔ صبح بڑے مزے لے لے کر اپنا رہمانی حادثہ سنارہا تھا اور چار سکرٹ سیکائے بڑی دلچسپی سے اسے سن رہا تھا۔ اسے یہ لوگ اور ان لوگوں کی باتیں لاہور کے نام نہاد دانش وران اور ان کی بے مغز باتوں کے مقابلے میں بڑی گہری اور دل میں اتر جانے والی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں قدم قدم چل رہے تھے اور انھیں ان گاڑیوں کا مطلق احساس نہیں ہو رہا تھا جو ٹیڑھوں کی بو اور انجن کا ہکا بھکا شور چھڑتی قریب سے گذر جاتیں۔

”میں تھیں کہہ رہا تھا کہ پارتنی پور والی گاڑی میں سے کچھ بیراگی اترے جن میں سے کسی نے اک تارا اور کسی نے ڈھلی اٹھا رکھی تھی۔ ان بیراگیوں کے ساتھ ہی ایک بیراگن بھی گاڑی سے اترے۔ اس کے ہاتھ میں اک تارا تھا۔ اس نے گہرے رنگ کی سارنگی پر رکھی تھی۔ پاؤں سے شنگی تھی۔ بال کھلے تھے اور شانوں پر بیکھرے ہوئے تھے۔ وہ جوان تھی اور جسم کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ ماتھے پر تھمک لگا تھا اور گلے میں سبز منگوں کی مالا پڑی تھی۔ اتنی حسین اور سادہ عورت میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کی

خوبصورتی دیکھ کر سارا سٹیشن رنگ رہ گیا۔ جو کوئی اس کی طرف آنکھیں اٹھاتا۔ پھرتا نہیں۔ یہ جھپک سکتا۔ عورت کا حسن واقعی بہت بڑی حقیقت ہے۔ حسین عورت آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ شہروں میں تو ہمیں سوائے میک آپ اور منڈی ہوئی بھونڈوں کے اور کچھ نہیں ملتا۔

میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اس عورت یعنی بیراگن کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں بھی اس کی جانب نظریں اٹھا کر پھر اپنی پکیں نہ جھپک سکا۔ وہ بیراگن ایک شعلہ تھی جس نے گاڑی سے باہر نکل کر سارے سٹیشن میں آگ لگا دی تھی۔ ہر شے جل رہی تھی، سنگ رہی تھی، روشن ہو گئی تھی۔ بیراگن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سٹیشن سے باہر نکل کر ایک گاڑی کی طرف چل دی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بانس کے درختوں کے جھنڈوں میں غائب ہو گئی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میں اس عورت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے سٹیشن ماسٹر سے پوچھا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟ اس نے بتایا کہ ساتھ والے گاؤں میں ایک شادی پر گائے۔ بجانے جا رہے ہیں اور یہ محفل رات کو لگے گی۔ میں بھی رات کو اس گاؤں میں جا پہنچا۔ شادی والا گھر ڈھونڈنے میں مجھے کوئی بھی وقت نہ اٹھانی پڑی۔ جب میں اس گھر کے باہر پہنچا تو گائے کی محفل شروع ہونے ہی والی تھی۔ بڑے سے پمیل کے درخت کے نیچے گیس روشن تھا۔ دریاں بھی تھیں۔ لوگ بیٹھے آپس میں ہنس بول رہے تھے وہی بیراگن لوگوں میں پان تقسیم کر رہی تھی اور لوگ اسے مذاق کر رہے تھے جس کا جواب وہ صرف مسکرا کر دے رہی تھی۔ مجھے لوگوں کے مذاق اور بیراگن کی مسکراہٹ پر بڑا غصہ آیا۔ گھبریں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ دوسرے بیراگی درمی پر ٹولی بنا کر بیٹھے اکتاہ کُن رہے تھے۔ پان تقسیم کرنے کے بعد بیراگن سامنے آکر درمی پر بیٹھ گئی۔ بیراگیوں نے اکتاہ چھیرا گھنٹی ڈنکی اور بانسری کی ملی جلی خوش آہنگ صداں بلند ہوئیں اور بیراگن نے ہاتھ باندھ کر آنکھیں بند کر کے گانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز بڑی ہی سریلی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سنہری دھوپ اور کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبو نے مست ہو کر کوئی ٹپکٹل نغمہ سرا رہے۔ کچھ دیر وہ گاتی رہی پھر اس کا ساتھ دوسرے بیراگی بھی

بنی میرے سامنے تالاب کی میڑھیوں پر کھڑی تھی اور میں اپنے دل پر ہاتھ رکھے اس کے خوبصورت جسم کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دوسری ساڑھی بدلی۔ بالوں کو پچوڑ کر جھبکا اور واپس چل دی۔ میرے قریب ہی گل مہر کا ایک سرخ پھول لگا ہوا تھا۔ میں نے وہ پھول توڑ لیا اور دوسری طرف سے ہو کر اس کے رستے میں اُن کھڑا ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی، پھر مسکرائی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر نہسکا کر کیا دیہ لوگ ہندو تھے اور گل مہر کا پھول پیش کیا۔

خوبصورتی اور سنگیت کی دیوی کے قدموں میں،  
اس نے مسکراتے ہوئے پھول لے کر اپنے بالوں میں لگا لیا۔

”کیا دیوی کے پھر بھی درشن ہوں گے؟“

”ہم بیراگی لوگ ہیں بابو۔ ہم کہیں بھی ایک رات سے زیادہ نہیں ٹھہرتے۔“  
”میں ہر رات دیوی کے ساتھ سفر کروں گا۔“

”تو پھر بیراگی بن جاؤ۔“

اب تم سے کیا چھپاؤں۔ مجھے بیراگن سے محبت ضرور ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی خاطر میں اپنا پیٹ سن کا کاروبار، موزس گاڑی، تیج گاؤں والی چھوٹی سی کوٹھی اور ہوٹل شاہ باغ کا لاڈلے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ میرا مطلب صرف اتنا تھا کہ وہ کبھی کبھی جب میں دیہاتوں کی آوارہ گردی کو اڑوں تو مجھے مل لیا کرے۔ یا اگر وہ راضی ہو جائے تو کچھ دنوں کے لیے شہر میرے ساتھ چلی چلے ہم شہر والوں کی محبت تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ بھائی ہم تو ڈرامیگ روم میں بیٹھ کر محبت کر سکتے ہیں۔ عشق میں جنگلوں کی خاک ہم سے نہیں چھانی جاتی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میں تم سے پریم کرتا ہوں دیوی۔ میں تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”بیراگن میری اس بات پر قہقہہ لگا کر ہنس دی۔“

”ہم تو بیراگی ہیں بابو۔ ہم نہ پریم کرتے ہیں نہ بیاہ۔ ہم تو صرف بیراگ لیتے ہیں اور گاتے ہیں، رقص کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں تم بھی ہمارے ساتھ آ جاؤ۔“

دینے لگے۔ اب یہ ہوتا کہ ایک مصرعہ بیراگی دہراتے اور دوسرا مصرعہ بیراگن گاتی۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھی اور اُس نے بڑے ہی خواب انگیز انداز میں رقص کرنا شروع کر دیا۔ اس رقص میں جسم کی تھرکن کم اور گیت کے دریا کی زلیجے کے نرمت زیادہ تھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بیراگیوں کے منہ سے نکلے ہوئے بول بیراگن کے وجود میں آکر رقص کر رہے ہیں اور رقص ان کے لبوں تک جا کر نغمے میں ڈھل رہا ہے۔ گیت کی دھن کے ساتھ ساتھ رقص کی گردشیں بھی تیز ہو گئی۔ اب وہاں رقص اور نغمے کا طوفان اُٹھ آیا تھا۔ ایک بول بیراگی کہتے اور دوسرا بیراگن گاتی۔ اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے ماتھے سے پسینہ بہنے لگا تھا۔ کبھی وہ عجیب ادا سے کسی اُن دیکھے پر تیم کو دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی اور کبھی ایک دم یوں اداں ہو جاتی گویا پھر کبھی ویدرا نصیب نہ ہو گا۔ رقص، نغمے میں اور نغمہ گیت میں ڈھل گیا تھا۔ لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ گاتے گاتے، ناچتے ناچتے بیراگن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اب جو میں نے دیکھا تو مفنٹن بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔ گیت جو بیراگن گا رہی تھی بڑا ہی دل ہلا دینے والا تھا۔ تم سنو گے؟

”مجھے بتاؤ میں کب تک آگ کھاتی رہوں؟ کب تک اپنے سینے کے اندر

انگارے دہاتے رکھوں؟ میرے پریم! اچھے محبت کا سانپ ایک بار ڈس جاتا ہے

پھر وہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ پھر اُسے سوائے محبوب کے رس بھرے ہونٹوں کے

دنیا کا کوئی نمر زندہ نہیں کر سکتا۔“

مغل ختم ہو گئی۔ میں نے رات اسی گاؤں میں بسر کی دوسرے روز منہ اندھیرے ہی گاؤں کے تالاب پر جا کر چھپ گیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ اسی طرف ضرور آئے گی۔ میں بال کے درختوں میں چھپ کر بیٹھا رہا۔ ابھی سورج نہیں نکلنا تھا کہ بیراگن نمودار ہوئی۔ اُس کے بال اسی طرح کھلے تھے۔ اُس نے ایک ہاتھ میں دوسری ساڑھی تمام رکھی تھی تالاب پر آکر وہ سبھی اُن کے اُتر گئی اور پانی میں ڈبکیاں لگانی شروع کر دیں۔ جب وہ نہا کر باہر نکلی تو باریک دھوئی اس کے کندنی جسم سے چپک گئی تھی۔ وہ تنگ مرم کی مورتی

میں خاموش رہا۔ میں اس کے ساتھ نہیں جاسکتا تھا۔ کیوں کہ میں اصلی خانہ بدوش نہیں تھا۔  
میں نے تو  
لیے خانہ بدوشی کو اپنا رکھا تھا۔ اسی دن وہ بیراگن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوسرے گاؤں  
کو چل دی۔ جب وہ گاؤں سے جا رہی تھی تو میں اسی پرانے پیل کے درخت تلے کھڑا  
تھا۔ اس نے میری طرف آخری بار مسکرا کر دیکھا اور آگے نکل گئی۔ اس کے سیاہ بالوں میں  
سرخ گل مہر کا پھول اسی طرح لگا تھا میری تمام محبت کی آخری نشانی! میں اس  
نشانی کو دھڑکنے دیکھتا رہا جو اس کے سیاہ بالوں میں آگ کا انگار بنی دھک رہی  
تھی۔ مجھے بیراگن کے گیت کا وہ بول یاد آگیا۔ ”مجھے بتاؤ میں کب تک اپنی چھاتیوں  
میں انگارے دبائے رکھوں؟“

صارح اپنی داستان محبت سن کر خاموش ہو گیا اب شاہ باغ ہوئی بالکل سامنے ہی تھا۔ وہ  
دونوں خاموشی سے اس کے لائق میں آکر بیٹھ گئے۔ انھوں نے کافی منگوا کر اس کی دو ایک چسکیاں لیں۔  
دونوں بیراگن والے واقعے سے بڑے متاثر ہوئے تھے۔ صارح اس کو سن کر اور چار سے سن کر  
چنار نے پوچھا۔

”کیا پھر اس بیراگن سے ملاقات ہوئی کبھی؟“

”نہیں۔۔۔ بیراگنوں کے ٹھکانے کی بھلا کسی کو کیا خبر ہو سکتی ہے؟“

”تم نے کوشش بھی نہیں کی؟“

”میری آوارہ گردی کا وقت ختم ہو گیا تھا اور اب مجھے ڈھاکرہ اور دفتر کا کام سنبھالنا  
پڑتا۔۔۔“

”جب آدمی محبت پر پٹ سن کی گانٹھ کو ترجیح دے تو اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔“

”لیکن بھائی پٹ سن کی گانٹھ نہ ہو تو ہم محبت بھی نہیں کر سکتے۔“

چنار خاموشی سے کافی کا آخری گھونٹ پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو اب چلیں۔“

”تھوڑی دیر تک جاؤ۔ شاید وہ گھنگھریالے بالوں والا اپنی بیوی کو لے کر پھر یہاں

آجائے۔“

”بیوی نہ کو صراح۔ میں بیویوں کا احترام کرتا ہوں۔ اور میں کسی کی بیوی سے عشق  
بازی کر بھی نہیں سکتا۔“

”لیکن وہ تو اس کا دلال ہے۔ بھائی تم کہاں کی بات کہاں جا مل رہے ہو۔“

”کچھ بھی ہو تمہیں ایسی باتیں زبان پر نہیں لانی چاہئیں۔ میں حیران ہوں کہ ایک بیراگن سے  
عشق کرنے والا ایک بے بس عورت کی جبری عشق بازیوں پر طعنہ زنی کر رہا ہے۔ محبت  
کرنے والے تو بڑی عزت کرنے والے ہوتے ہیں۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا۔ تم  
بھی سچے ہو۔ یہاں تمہاری پٹ سن کی گانٹھیں بول رہی ہیں۔ چلو اب چلیں۔“

صارح قلعہ مار کر نہیں پڑا اور چنار کے ساتھ ہوئی شاہ باغ سے باہر نکل آیا۔ گاڑی میں بیٹھ  
گاؤں کا لڑکا جاتے ہوئے صارح نے بتایا کہ وہ کل اسے ایک اسکول ماسٹر کے گھر لے جائے گا جس کی  
لڑکی بہت اچھا لگتی ہے۔

”کیا وہ بھی کسی کی بیوی ہے؟“

”ارے نہیں بھائی۔ وہ تو بڑے شریف لوگ ہیں تم خود جا کر دیکھ لینا۔“

ایکایں تھیں جنہوں نے سفید ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں اور ماتھے پر بنگلہ لگا رکھے تھے۔ ماسٹر صاحب نے بیوی کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا اور خود اندر سے جا کر ہارمونیم اٹھا لائے۔ چند لمحوں کے بعد دونوں بیاباں بھی اندر آ گئیں اور ماسٹر صاحب کے پاس آ کر درمی پر بیٹھ گئیں۔ ماسٹر صاحب نے بنگلہ زبان ناچی لڑکی سے کچھ کہا اور وہ شرماتی ہوئی اٹھ کر ذرا آگے ہو کر درمی پر بیٹھ گئی۔ ماسٹر صاحب نے یہ سلی سلی پاکٹ بک کھول کر ہارمونیم کے اوپر رکھ دی اور اس پر غور سے جھانکے ہارمونیم کے ساتھ مائیک کا مشرک کر دیا۔ ان کی بڑی لڑکی نے بھی سر اٹھایا اور نظریں زمین پر گاڑے بڑی تکیہ اور بالی آواز میں گانے لگی۔ اس دوران میں اسی نے ایک لمحے کے لیے بھی نظریں اٹھا کر اوپر نہ دیکھا۔ بنگلہ گیت خدا کی عظمت کے بارے میں تھا۔ اور اسی میں اسی کی صفات کو بڑے مؤثر اور دلپذیر انداز میں گنایا تھا۔

گیت کے بعد اس لڑکی نے مشرقی پاکستان کے ایک کسان کی روزمرہ زندگی کو بیلے کی صورت میں پیش کیا۔ وہ رقص کی دھیمی گردنوں اور تکیہ نرت سے گیت گاتے ہوئے اس کا مغموم بھی ادا کر رہی تھی۔ کبھی وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بارش کی دھماکتی کبھی بازوؤں اور انگلیوں کی تیز حرکات سے برستی بارش کا سماں پیش کرتی۔ کبھی زمین پر جھک کر دھان کی پیڑی بڑی بڑی کبھی دھماکتے کھیتوں کے مناظر دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگتی۔ پھر تالی کی تال پر دھان کی کٹائی میں لگ جاتی۔ پھر فصل کاٹا بارش کا اس کے بارگاہ رقص کرنے لگی۔ پھر ایک دم سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ کیونکہ ساہوکار اور زمیندار اور برہار اپنا اپنا حصہ لینے وہاں آن موجود ہوئے تھے۔ کبھی اس بچے کو سنبھالتی کبھی اس بچے کو سنبھالتی کبھی اس بچے کو گود میں اٹھاتی۔ پھر ساری فصل ہاتھ سے ٹھک لگتی۔ سارا پسینہ پانی بن کر مٹی میں بہہ جا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیئے۔ ایک بار پھر مرسلا دھار بارش کے لیے جوائے اُن کے کھیتوں اور جھونپڑوں کو بہا کر لے جاتے۔

بیلے ختم ہوا تو جرجان ساہوکر رہ گیا۔ ماسٹر صاحب کی دہلی تیلی مزدوری لڑکی نے اسی چابکدستی اور تھائی ڈنکا رات ملا خیتوں کے ساتھ ایک عام کسان کی حید و جہد بھری زندگی کا نقشہ پیش کیا تھا۔ گھر کے کسی شاعر یا ادیب کو زندگی اور فن کا یہ معراج شاید ہی کبھی نصیب ہو سکے۔ دونوں رات گئے وہاں سے واپس ہوئے۔ رات بھر خیابان ماسٹر صاحب کی لڑکی کے فن کی سادگی اور پھول باڑی والی ہیرا لگی

سکول ماسٹر کا چھوٹا سا اک منزلہ مکان شہر سے باہر ایک پرانے تالاب کے بائیں کنارے واقع تھا۔ تالاب بڑا گندہ تھا جس کے کنارے کی دلدل میں ایک کشتی آدھی چھنی ہوئی تھی۔ مکان کی دو میڑھیاں پڑھ کر ایک برآمدہ آنا جس کے ساتھ ہی دو چھوٹے کمرے اور بیچ میں ایک کھلا کمرہ تھا۔ پرلی جانب رسوئی اور چھوٹا سا آنگن تھا جس کی دیوار کے ساتھ کیلے اور سیتا پیل کے پیر کھڑے تھے۔ صالغ کے ماسٹر صاحب سے بڑے دیرینہ تعلقات تھے۔ ماسٹر صاحب نے عینک لگا رکھی تھی۔ ادھیڑ عرصے مرچیاں مرغ سے بٹے پتلے آدمی تھے۔ جھک کر ملے اور اندر لے گئے۔ فرش پر درمی بھی تھی اور دین آرام کرسیاں ایک نوٹ اور دیوار کے ساتھ بنگلہ لگا تھا جس کی پٹی پر کسی بچی کا میلا سا فرک پڑا تھا۔

رات کا کھانا انہوں نے ماسٹر صاحب کے ہاں کھایا۔ صالغ اپنے ساتھ ہوٹل خیاباں سے ایک چیرغہ اور پھلوں کی ٹوکری لیتا گیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب لوگ آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے اور سکرپٹ وغیرہ پڑھنے لگے۔ ماسٹر صاحب کی خالص بنگالی بیوی نے فرنی اپنے ہاتھ سے بنائی تھی جس پر میوے لگے ہوئے تھے۔ ماسٹر صاحب کی بڑی لڑکی اپنی موسیٰ کے ہاں پڑھنے لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو ادھر روانہ کر دیا۔ چھوٹی لڑکی نے مہمانوں کے گلے میں زن جو کے سفید بھولوں کے منفر ہار پہنائے۔ یہ بچی پانچ سال کی ہو گئی۔ بڑی بیاری اور معصوم تھی۔ سفید فرک میں بالکل گڑبا ملوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب کی بڑی لڑکی بھی آ گئی اس کے ہمراہ خالہ کی لڑکی بھی تھی۔ دونوں لڑکیوں نے جھک کر سلام کیا اور اندر چلی گئیں۔

دونوں کی عمریں سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھیں۔ دہلی تیلی اور نرم و نازک سی شرمیلی بنگالی

کے بارے میں وحشی گیت اور پرمانندی کی لہروں، ایسی آزاد اور بیکریں محبت کے بارے میں سہارا ہوا۔ اپنے ایک ہی ملک کے دوسرے حصے میں تھا۔ مگر لاہور کی زندگی سے اپنے آپ کو گروڑوں سیلا وہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اسے لاہور کی گلیاں، شاہ بازار کے آموں کے چھند، صبح صبح سکول کو جانے لڑکیاں، نجی کی نیلی آنکھیں، اسی رات کلب کے ہال میں اس کی بے اعتنائی، باغ جناح کی صاف ستھری ریزر اور ملاں حسین کی دہی کی لسی بہت یاد آ رہی تھی۔ دوسرے ہی دن وہ اس قدر اداں ہو گیا کہ اس نے صانع سے پیسے لے کر ہوائی جہاز میں اگلے روز کی سیٹ حاصل کر لی۔ صانع نے اسے بہت مجبور کیا کہ وہ کچھ روز تو اور رگ جائے۔ کم از کم مشرقی پاکستان کے دیہات کی آوارہ گردی اور طوفان خیز دریاؤں کی سیر نہ کرے۔ مگر چار کو اب ڈھاکہ کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد لاہور پہنچنا چاہتا تھا۔

چنانچہ دوسرے دن وہ صبح سویرے ہی ائیر پورٹ پر پہنچ کر ہوائی جہاز میں سوار ہو گیا۔ ٹیکہ چھ بج کر دس منٹ پر جہاز نے ایک آف کیا اور لاہور کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیا۔ لاہور پہنچ کر جب جہاز نے نیچے اترنے کے لیے جھک کر پرواز کی تو چار ماڈل ٹاؤن، اگلبرگ کینال بینک اور گڑھی شاہو کے مکانوں کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوئے۔ گما۔

تفصیل کتد سے پر ڈالے وہ گھر میں داخل ہوا تو ڈاکٹر ہو میو بکر سے کپے پائے چٹ کرنے کے بعد پیٹ پر گرم پانی کی بوتل رکھے پانی سے کسی دوائی کا سفوف کھا رہے تھے۔ چار کو وہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”کمال ہے بھئی نہ تم اچانک ہی غائب ہو گئے اور اب اچانک ظاہر ہو گئے ہو، کہاں چلے گئے تھے؟“

”زلفی پانی کا گلاس بیسے ان کے پاس ہی کھڑی تھی اس کے چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار تھے۔“

”تم نے یاد نہیں بڑا پریشان کیا۔ ڈھاکہ گئے تھے تو کم از کم ہمیں بتا تو جاتے۔ مجھے تو طرح طرح کے خیالات آنے لگے تھے۔ پانی دو بیٹی۔“

چار چپکے سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا کمرہ صاف ستھرا تھا۔ ہر

یہ اپنی جگہ پر سلیقے سے رکھی ہوئی تھی اور گرد و نشان تک نہ تھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ سب کارستانی کی مجلس محبوب یعنی زلفی بیگم کی ہے لیکن وہ پریشان سی کیوں لگ رہی تھی؟ اس نے جلدی جلدی منہ تھوڑا کر کے بدلتے بدلتے اور سیدھا اپنے دفتر جا کر حاضری کی رپورٹ دی۔ شام کو دفتر سے نکل کر ہیدھا ساداری ہاؤس گیا۔ اپنے سارے دوستوں سے ملا۔ کسی کا مذاق اڑایا، کسی کے شعر کو کجواں ہا۔ انہیں بڑے جوشیلے انداز میں مشرقی پاکستان جا کر وہاں کے شاعروں کے آگے زانوئے تلمذتہ بننے کی تلقین کی۔

ابن سے کہا

”تم صبح اٹھ کر بھجن گانے کی بجائے دوڑ لگایا کرو۔ کیونکہ تم گندہ بن ہو، شاید دوڑ سے تمہارے دماغ میں کچھ حرکت پیدا ہو۔“

شاعر بور کی سے کہا

”تم شاعری چھوڑ کر سب سے پہلے اپنی ٹوپی سر سے اتارو اور پھر لالے تو سے کے کسی کاؤں میں جا کر گلاس کھونے کا دھندا شروع کر دو۔ اس طرح تمہیں وہاں کے لوگوں کے ساتھ رہنے کا موقع ہی نہیں ملے گا بلکہ تمہارے دماغ میں لگے ہوئے ساداری ہاؤس کے جالے بھی کھلی ہو ایں آئندہ جائیں گے۔“

جی کو لا اور چانکیہ وہاں نہیں تھے اگر وہ موجود ہوتے تو چار انہیں بھی کوئی نہ کوئی نصیحت لٹا۔ وہ ہول سے باہر نکل رہا تھا کہ دروازے میں مہتما سے ملاقات ہو گئی۔

”ارے تم؟ کہاں چلے گئے تھے؟“

چار نے مہتما کے گلے میں بازو ڈال کر اسے اپنے ساتھ لے لیا۔

”مشرقی بینکال گیا ہوا تھا، کیسا ملک ہے۔ کیا لوگ ہیں۔ غربت اور محبت کا حیرت انگیز ملاپ نظر آیا ہے۔ مہتما تم وہاں جا کر آباد ہو جاؤ۔ تمہارے لیے وہ جگہ بڑی موزوں ہے۔ بالکل تمہاری ہی طرح کے کم زبان اور چپ چاپ دکھ سننے اور خوش رہنے والے لوگ ہیں۔“

مہتما ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”میں اس شہر سے باہر نہیں جاسکتا میری کچھ مجبوریاں ہیں۔“

”مجبوری کوئی شے نہیں ہوتی۔ آدمی کو ہر کام کرنا چاہیے۔ زندگی میں انقلاب پیدا کرو۔ ایک خوبصورت اور خوش آئند انقلاب۔“

”انقلاب، زندگی، خوبصورتی۔ یہ سب میرے لیے دوران کار کی باتیں ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے دن میں کالج میں پڑھنا اور رات کو اپنی بوڑھی ماں اور بہنوئی کے لیے ایک فرم میں کام کرنا پڑتا ہے۔ مجھے بس کے لیے گھنٹہ گھنٹہ بھرا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ سبکی کے بل ہیں، دودھ والے، پیساری، سبزی والے اور اخبار والے کے بل ہیں۔ مکان کا کرایہ ہے، راشن کارڈ ہے۔ بہنوئی کی شادیوں کا فکر ہے۔ بس گاگل کا عشق ہے۔ پانی ملا دودھ، موبل آئیل ملا گھی، پتھر ملی مرچیں اور ریت ملا آٹا ہے۔“

چنار نے اپنے سرگرمی کا ایک گمراہ لگا یا اور سرگرمی کے کنارے چھینک دیا۔ وہ پیر تلخ اور کڑوا محسوس ہوا۔

”اچھا ہاتھ، میں چلتا ہوں۔“

اُس نے ہاتھ سے ہاتھ ملایا اور جلدی سے سڑک پار کر کے سامنے والے فٹ پاتھ پر ایک طرف گھومنا ہو گیا۔ وہ نجی کوٹنے اس کی نیلی آنکھوں اور سورج کی سنہری کرنوں ایسے ریشمی ٹانگوں کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ جس وقت وہ نجی کی کوٹھی کے گیٹ پر پہنچا تو سورج دیکھنے کے درختوں کے اوپر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور نیلی فضاؤں میں سفید کبوتر پرواز کر رہے تھے دروازے پر چھکی ہوئی سفید گلاب کی بیل کے اندر چڑیوں کی چمکائیں گونج رہی تھیں۔ وہ اندر داخل ہوا تو لان میں لیموں کے درختوں تلے بیٹھی ہوئی نجی کی چھوٹی بہن نشی اور اس کی سہیلی نیکی نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

”ہائی چیری۔“

”ہائی نشی۔“

وہ کرسی پہنچ کر ان کے پاس ہو بیٹھا۔ ان میں سے کسی نے بھی نہ پوچھا کہ وہ اتنے دن کہاں رہا۔ شاید انھیں خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ وہ مشرقی پاکستان گیا ہوا تھا۔ یا شاید انھیں محسوس ہی نہیں ہوا کہ ان کا کوئی

ت ان سے اتنے دن دور رہا ہے۔ دونوں لڑکیاں ڈیڈنگ کارڈ پڑھ رہی تھیں۔ چنار نے بھر ایک شادی کارڈ اٹھا کر دیکھا۔

”کس کی شادی ہو رہی ہے؟“

”ارے تمہیں پتہ نہیں۔ نجی کی شادی ہے ناں اگلے ہفتے۔“

چنار کو یوں لگا جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا ہو۔ وہ ایک دم سنبھل گیا۔ نے شادی والا کارڈ میز پر رکھ دیا اور تبا کو کی تھپی نکال کر سرگرمی بنانے لگا۔ وہ محض اس لمحے ان کے ساتھ نہیں ہنس کر باتیں کرنے لگ گیا کہ کہیں وہ اس کے چہرے سے کسی بات ڈازہ نہ کر لیں۔

اچانک برآمدے والے کمرے کی جانب سے نجی کی آواز آئی وہ باہر آ رہی تھی۔ چنار آہستہ سے باور کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ اس نے آخری بار دروازے پر چھکی ہوئی گلاب کے سفید ریلوں سے لدی ہوئی بیل کو دیکھا۔ وہ پھر اس کوٹھی میں کبھی نہیں آئے گا۔ وہ صرف نجی کی نیلی میں دیکھنے آیا تھا اور یہاں آکر اس نے نجی کے خاندن کو اپنی بیوی کے ساتھ جملہ عروسی داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور وہ بیویوں کا بڑا احترام کرتا تھا۔

چنار رات کو کافی دیر سے گھر آیا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے کپڑے بدلے۔ کبیل اور کھڑک ٹیبل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ریلوے ٹائم ٹیبل کا مطالعہ شروع کر دیا۔ آج اسے ہر اسٹیشن پران دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کوئی گاڑی نہ کھڑی تھی کہیں کوئی مسافر نہ دکھائی دے رہا تھا۔ بل کوئی آواز نہ تھی۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور چنار سمجھ گیا کہ کون اندر آیا ہے۔ اس نے ٹائم ٹیبل سے نظر سبک کر لیا۔ زلفی بوجھل قدم اٹھا کر پلنگ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی چنار ٹاں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ زلفی چپکے سے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ چنار بستر مطالعے میں یا لٹا کے خیال میں منہمک رہا۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ ہچکیاں لے رہا ہے۔ اس نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ زلفی اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپانے رو رہی تھی۔ اس نے اٹھ کھڑی ہو کر دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“



زلفی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اسی طرح روتی رہی۔

”مجھی آخر کچھ تو بتاؤ۔“

زلفی روتی چلی گئی۔ چنا کو وہ بہت بُری لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اُسے چوٹی سے پکڑا اٹھائے اور چوہر میا کی طرح دروازے سے باہر پھینک دے۔ آخر ان لوگوں نے کیا نخواست پیدا رکھی ہے ہر طرف۔ اتنی خوبصورت دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔

”مجھی کچھ تہہ لمبی چلے۔ آخر کیا ہو گیا ہے۔؟“

”جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں ماں بننے والی ہوں۔“

چنا رسید جا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے کمرے کی چھت ایک دم اُس کے اوپر آگئی ہو۔ وہ زلفی کو دیکھتے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ دوپٹے کے پتوں سے آنکھیں اور ناک پونچھ رہی تھی۔ چنا کو بے حد کراہت محسوس ہوئی۔

”مگر یہ کیسے ہو گیا؟“

”جیسے ہوا کرتا ہے۔“

”اب کیا ہو گا؟“

”میں خودکشی کر لوں گی۔ میں اپنے ماں باپ کی عزت برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔“

اور زلفی ایک بار پھر پھکیاں لے لے کر رونے لگی۔ جب وہ چلی گئی تو چنا کی نیند اڑ چکی تھی۔ اس نے کپڑے پہنے اور کمرے میں چکر لگانا شروع کر دیئے۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ بنا رہا تھا اور پھونکے جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں گویا ہزاروں مجسمے بھینچا ہے تھے۔ اُسے ان تمام لوگوں سے نفرت، انتہائی شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ جنھوں نے اُسے بے معنی چکر دیا تھا۔ پھنسا رکھا تھا۔ ایک وہ سچی ہے جو اُسے یوں سمجھا بھیجی جیسے وہ راتے کا پتھر ہو۔ اور ایک بے صورت لڑکی ہے جو اب اپنے گناہوں کا بوجھ اُس کے سر پر ڈالنا چاہتی ہے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ اُس نے زور سے تھوکا اور زلفی کو دو تین گالیاں دے ڈالیں۔ یہاں کی فضا کھنکھناتی

اور مکروہ ہے۔ یہ لوگ کس قدر گندے اور داہیات ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے بزدل بھائی ہیں۔ ہاں بنوں کی محبت نے زخمیاں رکھا ہے اور اولاد کا خون چوسنے والے تین آسان باپ ہیں۔ نے والی عورتیں ہیں۔ مہانوں کے آگے پیچھے پھر کر ان کی پیٹھ پیچھے انھیں گالیاں دینے والے۔ زن مرید شوہر ہیں۔ خاندانوں کے لیے یک جہتے والی بیویاں ہیں۔ بیٹوں کو بیویوں کے بھائی بھائی کرنے والی مائیں ہیں۔ دس روپوں کے لیے قسم کھانے والے ایماندار ہیں۔ ہیں جن سے بھولوں کی بات کرو تو انھیں چھینک آجائے گی۔ درختوں کا ذکر کر دو تو ناک نے لگیں گے۔ چاند کی کہانی سناؤ تو اوٹھنا شروع کر دیں گے۔ روپے کمانے کی سکیم بیان نہ کر لیں گے۔ دوسرے کی برائی بیان کر دو تو ہمدردی کوں ہو جائیں گے۔ غیر کی تعریف دے جل جھن کر کباب ہو جائیں گے۔

ماں ہیں وہ لوگ کہ منہ اندھیرے گیت گاتے دریاؤں میں کشتیوں کے بادبان کھولتے ہیں۔ ایک کنارے پر کھانا پکاتے ہیں اور دوسرے کنارے پر جا کر کھاتے ہیں۔ سانپ کے بٹوں و ڈال کر قیمتی پیچھے نکال باہر لاتے ہیں۔ آدھی آدھی رات تک دریا کنارے آگ جلا کر کسان درد اور خوشیوں کے گیت گاتے ہیں۔ شعلہ بن کر رقص کرتے ہیں۔ بالوں میں چھپا کلی اور ملتے پرتلک لگاتے ہیں۔ گرم چمکیلے بازاروں میں سیکنی نگاہ سے دیکھتے ہوئے قریب جاتے ہیں۔ سلیم کے جنگلے پر چھکے جھکے گرم ہاتھ پر سلگتا ہوا اپنا ہاتھ رکھ کر محبت کی لہریں باتیں کرتے ہیں۔ ناریل کے درختوں میں رقص و نغمے کے جھومر ڈالتے ہیں۔ بانسری لگاتے ہیں۔ پدما دریا میں کشتی رانی کرتے ہیں۔ پٹے ہوئے باد بانوں کے ساتھ سینہ تان رہتے ہیں۔ چٹا گانگ کے اونچے ٹیرس والے جنگلے میں غالب کی غزلیں گاتے ہیں شاہ باغ کے لافانی میں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔ پھول باڑی کے دیہاتوں میں تنگے پاؤں گھوم پھر کر زندہ لہر محبت کے دگلہ گیت گاتے ہیں۔ چنا کو اس میراگن کا خیال سناتے لگا جیسے اس کے دماغ نے تالاب میں نہاتے ہوئے بانس کے درختوں میں چھپ کر دیکھا تھا جس کی خوبصورتی اس پر آگ آگ لگا دی تھی۔ وہ میراگن یقیناً آج بھی انہی دیہاتوں میں گھوم پھر کر محبت کے گیت گاتی ہوگی۔ اس کا کاروباری دوست پٹ سن کی کانٹھوں پر بیٹھ کر عشق کرنا چاہتا

تھا۔ بے وقوف تھا وہ۔!

میں اس بیہوش کو ضرور ڈھونڈ کر رہوں گا وہ محبت کی اوتار ہے۔ میری روح اور میرے جسم کا  
اسی عورت کی آغوش میں سکون ملے گا۔ میں کل ہی یہاں سے کوچ کر جاؤں گا۔ اسی گندے جوہر  
دلہل میں میری روح فنا ہو جائے گی۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی چار نے جلدی جلدی اپنے حقیر  
میں کچھ کتابیں اور چند ایک ضروری چیزیں رکھیں اور پینک پر بیٹھ کر صبح کا انتظار کرنے لگا۔  
کمرے کے روشندانوں پر صبح کا پسیدہ نمودار ہوا تو چار نے تھکلا اٹھایا۔ دروازہ کھول کر  
نکلا اور تیز تیز قدموں سے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے پیسے  
اُس کے پاس صرف کراچی تک کا کرایہ ہی تھا۔ کراچی سے آسے چٹا گنگ جانے والے بحری جہا  
میں سوار ہوتا تھا۔ اس نے کراچی کا ٹکٹ لے لیا اور پلیٹ فارم پر جا کر ٹکٹ منروہ کا  
کافی دیر ادھر ادھر چکر لگانے کے بعد وہ ایک بیس پر بیٹھ گیا۔



یہ ابھی تک اسی پنج پر بیٹھا ہوں۔

راجہ جانویال گاڑی ابھی تک نہیں آئی۔ میرے پاس بیٹھے مجھے بارش بزرگ نے اپنی کتاب ختم کر لی۔ پڑے ہٹ کر سامان کے انبار کے پاس بیٹھی برقعہ پوش لڑکی نے تھک کر اب پہلو بدل لیا ہے۔

بالجی اسے بغیر اکتائے اسی دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں اسلئے کہ میں فطرتاً عاشقِ مزاج ہو چکیا کہ

ہانی کے تصنیف کر نیوالے کی زبانی میری داستان پڑھ کر اندازہ ہو گیا ہو گا۔ آپ لوگ یقیناً دل ہی دل میں

کہہ رہے ہوں گے مگر یہ آپ لوگوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتا میں نے کبھی آپ لوگوں کو پسند نہیں کیا۔ آپ لوگوں

رہی ہیں آپ کے شہر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ بھی میرے یہاں چلے

روز خوش ہوں گے۔ سچی اس لیے خوش ہو گی کہ اب ہاپنے ناشی سے اپنا مکمل جانے کے خیال سے بے نیاز

خاندان کے ساتھ تنہی خوشی زندگی بسر کر سکے گی۔ سداوارٹی ہاؤس والے دوست اسلیے خوش ہونگے کہ اب

برکات حقانہ باتیں کر سکیں گے۔ ایک دوسر کی بد خوئی، غیبت اور برائی میں ایک دوسر پر سبقت لے جائیں گے۔

یہ باتوں پر اعتراض کر نیوالا نہیں ہو گا۔ کوئی انھیں ان کے گریبان کھول کر داغ دکھانے والا نہیں ہو گا۔ اگر کسی کو

نہیں بلکہ صدمہ ہو گا تو صرف رنجی کو اسلیے نہیں کہ اس کا محبوب اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ بلکہ اسلیے کہ چور اس کے

قبضہ کا کہ اس کا سب کچھ لوٹ کر ہجا گیا ہے۔ اسے صدمہ ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ مجھے اس سے کیا آخر

دادہ بھی تو برابر کی شریک تھی۔ یہ تانی میں نے ایک ہاتھ سے تو نہیں بجائی اس کے کان کتنے لیے ہیں؟ آف

تھنوں ایسے کان ہیں جو کبھی اس سے شادی کرے گا ہمیشہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا رہا گا۔

نور کیا ہے؟ یہ لیجئے گاڑی آگئی۔ چٹا کانگ، قینچی کو میلا، پاربتی پور، فرید پور، تیج گاؤں، دھاکہ  
نہ بنیوالی، پھول باڑی جانیوالی گاڑی آگئی۔ سب مسافر اٹھ کھڑے ہوئے بعضوں نے تو دھڑا دھڑ بھاگنا  
کر دیا ہے۔ برقعہ پوش لڑکی بھی کھڑی ہو کر برقعہ درست کر رہی ہے۔ یہیں اس لڑکی کے ساتھ والے ٹبے  
کا گونگر کرکڑی، حارس، سرستہ، ملا، تنک، لکڑی، سارو، سہم، منہ، سہ جائیگر، مہم، نقشا، غلام،

ٹکائے ایک طرف کھڑا ہو گیا ہوں کیونکہ تھوڑا سا کام معاملہ ہے۔ کھڑکی میں سے دُبیے میں کون سا ہو گا۔

چنار کو معلوم تھا کہ تھوڑا سا کس کے دُبیے گاڑی کے آگے لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ تھیلہ بغل میں ٹکائے برف کے سیدھے رخ کو چل پڑا۔ اچانک اس کی نظر پلیٹ فارم کی دیوار کے نیچے اونڈھے منہ پر سے ہوئے ایک بارہ سال کے لڑکے پر پڑی۔ اس کا پیٹ چمک گیا تھا۔ مانگیں سوکھ کر کھڑی ہو رہی تھیں۔ کندھا جا کر ادا ہوا۔ آنکھیں سوکھ کر تھیرا گئی تھیں۔ کھلے منہ سے دل بہہ رہی تھی اور کھیاں جھینکار رہی تھیں۔ ایک پاؤں نکلا تھا اور دوسرا پاؤں کا پچھا ہوا جوتا دور پڑا تھا۔ کچھ خداترس لوگوں نے اسے ہسپتال پہنچانے کی بجائے اس کے پاس کچھ بیٹے دیئے تھے۔ چنار چوری آنکھ سے اُسے دیکھتا ہوا آگے گزر گیا اور دیوار والے نیلے کے پاس جا کر کئی گہری سوجا دُوب گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس لڑکے کی برادری اور بیسی کا وہی دم دار ہے۔ اسکی ماں کہاں ہے؟ اُسے رات کو اٹھ کر دودھ پلانے والی اسکی آنکھوں میں سرمہ ڈال کر ملائی لینے والی اسکول روڈ کمرنیوالی ماں کہاں ہے؟ ہینڈ کہاں ہیں جنھوں نے اسے اپنے ہاتھوں دولہا بنا کر دلہن کے گھر کو بھیجا تھا؟ وہ بھائی کہاں ہیں جنھیں اسی پر عیب سے باز دیکار لڑکے کے بازو بٹھا تھا؟ کیا اسکی ماں نے خود کشتی کر لی تھی؟ کیا بڑا مامی سے بچنے کے لیے وہ اسے کسی بد رو کنہ سے رکھ گئی تھی جہاں سے غربت منلو کا حال چھوڑے بن کر اس سے چمک گئی اور زندگی کی خوشخوار گیوں پر گوشت چراتی رہی۔

”اچی! گاڑی۔ آہا ہا۔ گاڑی۔ چنار نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ایک بڑا ہی پیارا بچہ کراچی اکیپرس کی پلیٹ فارم میں داخل ہوا دیکھ کر اپنی بائیں کھڑی ماں کا ہر قہقہہ کھینچ کھینچ کر ادھر آدھر متوجہ کر رہا تھا ہار کا پلٹنا پڑا کر رک گئی۔ تھوڑا سا کس کا دُبیہ چنار کے عین سامنے آ گیا تھا۔ لیکن چنار گاڑی میں سوار ہونے کی بجائے باہر نکلنا باہر آکر اس نے ٹکٹ واپس کیا اور سیدھا گھر آ گیا۔ زلفی اُسے دروازے پر ہی ملی۔

”مذرا میرے کمرے میں آؤ۔“ تھوڑی دیر بعد زلفی اس کے کمرے میں تھی جسے جھڑپونچھ کر اس نے ہر شے سے لگا رکھی تھی۔ زلفی کے اندر اتنے ہی چنار نے اُسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ گہرا نہیں زلفی۔ میں۔ میں تم سے شادی کروں گا۔

زلفی حیرت اور سرت کے ملے جھلے احساس سے اُسے تکلیف پہنچ رہی تھی۔ اس نے اُسے اپنے ساتھ لگایا۔ چنار۔ چنار۔ بھول بھری والی بیزاگن کو آخری بلڈ بانس کے جنگل میں گم ہوتے دیکھا اسکے سیاہ بالوں میں گل ہر کا ترنہ بھولا اُنکا رہنا دیکھ رہا تھا اور وہ اسکی طرف پلٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی جنگل کے اندھیروں میں گم ہو رہی تھی۔

## برف باری کی رات



جہاں برف گرتی ہے وہاں پھول بھی کھلتے ہیں

میں تیری تلاش میں نکلی

اور برف گرنے لگی

محبت کا پھول تو برفباری میں بھی شکستہ رہتا ہے

جہاں برف گرتی ہے

میں وہیں تمہیں ملوں گی

محبت پھول روشنی

یہ میری محبت کی نشانیاں ہیں

قدیم ہنسپانوی گیت

چنانچہ ایک روز ہم نے سامان باندھا اور مری کی طرف چل پڑے۔

ہم چار یا تھے۔ میں، اجمی، خواجہ اور ماؤز می تنگ..... جس کا اصلی نام ملک غلام حسن تھا۔ لیکن چینی لیڈر سے غضبناک مشابہت کے باعث ہم سب یا اُسے ماؤ کہا کرتے تھے۔

نئی چنڈیا کے اطراف میں کھڑے کھڑے برش نما بالوں کی سجاوٹ، گول مٹول چہرہ پھیکے شلغم ایسی چھاتیوں بھری کھال چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں جیسے گرم پانی میں ابالی گئی ہوں۔ جب وہ بدنیا پیسے دانت نکال کر ہنستا تو آنکھیں اندر کو چھپ جاتیں اور سوتھوں کا لال لال گوشت صاف نظر آنے لگتا۔ ڈھیسلے ڈھالے بد وضع کپڑوں میں لمبوس رہتا۔ چلتے وقت پاؤں اندر لوڑتے، اور کندھے بھالو کی طرح دائیں بائیں ہلا کرتے۔ قمیض کے دو بٹن ہمیشہ کھلے رہتے جو سینے پر اُگے ہوئے گھنے سیاہ بالوں کے خشک کو ہوا دیا کرتے۔ ناسٹے قد اور مضحکہ خیز شکل دھورت والا ہمارا دوست ماؤ لاہور ریلوے ہیڈ کوارٹر کے دفتر میں سینئر کلرک تھا۔ چار بچوں کا باپ تھا۔ عورتوں کے ذکر کے ساتھ ہی اس کی زبان سے چٹخارے کی سی آواز نکلتی اور آنکھوں میں پانی بھر آتا صنف لطیف کے ساتھ اس کے ایسے کرخت اور حیوانی لگاؤ سے مجھے بڑی کراہت ہوتی تھی۔ ایک بار میں نے اُسے کہا۔

تم عورت کے تقدس کو مجروح کر رہے ہو عورت ایک عظیم صنف ہے۔

اس پر ماؤ نے زور سے تمقہ لگایا۔ میں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ جب ماؤ تمقہ لگا کر ہنستا ہے تو اس کی آواز بالکل نہیں نکلتی۔ بس اس کا منہ کھلتا ہے۔ آنکھیں اندر کو گھستی ہیں

اور پھر صرف ایک بار دکھی کی آواز آتی ہے جیسے کوئی گیل پٹا خنجر چل جائے میری بات پر اس قسم کا ایک گیل پٹا خنجر چلا اور وہ گندے رومال سے آنکھیں پونچھتا ہوا بولا :-  
”میرے یار تم نہیں جانتے۔ دراصل تم لوگوں سے مجھے بھی یہی شکایت ہے کہ تم بھٹے ہوئے گوشت کی پیٹ کو ترکاری کھانے والوں کی نظر سے دیکھتے ہو۔“

لیکن اس کے ساتھ ہی ماؤ میں کچھ اور باتیں بھی ہیں جو بڑی دلچسپ ہیں۔ وہ بڑی ترتیب اور اصول سے کھاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کراچی سے لاہور آ رہا ہو تو راستے میں گندامند کھانا بالکل نہیں کھائے گا۔ مگر وہ رات کو پہنچا ہے تو منہ ہاتھ دھو کر سب سے پہلے ناشتہ کرے گا۔ پھر دوپہر کا کھانا کھائے گا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ رات کا کھانا کھا کرے گا اور سب سے آخر میں دو دھڑپی کر سوجائے گا۔ موسمی پھل وہ ہر موسم میں صرف ایک دفعہ کھاتا ہے۔ امرود کی رُت آئی ہے تو وہ امرود کے نمک مرچ لگے قندوں سے بھری پوری پرات میٹھ کر چٹ کر جائیگا اور پھر سارا موسم امرود کا نام نہیں لے گا۔ کبھی کبھی وہ شہر بھی کہتا ہے۔ مگر حافظہ کمزور ہونے کے باعث اکثر اپنے تخلص کی جگہ غالب، میر یا مومن کا تخلص استعمال کر جاتا ہے جس کی وجہ سے ابھی خاصی گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ شہر بھی وہ عموماً بے وزن اور غلط سلط کتا ہے۔ لیکن ایک شے جو قدرت نے اُسے دے رکھی ہے وہ ہے قصہ سنانے کا فن، داستان گوئی میں اس کا ہنر پیدا نہیں ہو سکا۔ اُسے پوری الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ ازبر ہے۔ یہاں اس کا حافظہ اس کی ہر قوت کو مات دے گیا ہے۔ جب وہ موج میں اگر الف لیلہ کے کسی دل پھینک خوبصورت شہزادے کی داستان سنانے لگتا ہے تو محض پر سنا پا جاتا ہے، اور لوگ اپنا سانس روک لیتے ہیں۔ ماؤ کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ ایک ہاتھ فضا میں بلند ہو جاتا ہے۔ آواز کبھی فحرقہ گھنٹوں کا روپ بدلتی ہے، کبھی شیر کی دھاڑ بن جاتی ہے، اور کبھی خشک پتوں پر جھونکی سرسراہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ موٹی عورتوں کے عشق میں ناکام ہو کر صحرائوں کی چھاننے والوں کے جذبات کی عکاسی وہ بڑی مہارت سے کرتا ہے۔ ان دل جلیا شوق کا حال زار وہ اپنا حال سمجھ کر بیان کرتا ہے۔ ویسے بھی اس کے قصے کی ہر عورت موٹی

ہوتی ہے، اور اگر دبی ہو تو ہمارا داستان گو دوست اسے قصہ سناتے سناتے کھلا لاکر بیٹھتی بنا دیتا ہے۔ ماؤ کو ایک زمانے میں راگداری سے بھی دل چسپی رہی تھی۔ مگر بعد میں یہ دلچسپی عورتوں میں گڑبڑ ہو گئی۔ اب کبھی کبھی جب وہ اپنی بھتیجی آواز میں کوئی راگ لپٹنے کی کوشش کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کوئی سائڈ پیٹ کے درد سے بلبل رہا ہے۔  
”مونی فوراً اس کی گنجی چنڈیا پر چپٹ لگا کر بیچ اٹھتا ہے۔“  
”بندر کو اس دھڑپ کو۔“

صوفی صاحب کا حال احوال میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ کیونکہ اس وقت وہ مری میں ایک گھساٹا ہوٹل ٹھیکے پر لے کر چلا ہے ہیں جس کا نام انہوں نے سلورنگ رکھا ہے ہم چاروں یار ہوٹل سلورنگ میں بسیر کرنے ہی جا رہے ہیں۔ صوفی صاحب کے متعلق میں صرف اتنا عرض کر دوں کہ آپ بے حد کنجوس آدمی واقع ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے کنجوس ہونے کا بے حد صدمہ ہے۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے سر پر جوتے مارا کرتے ہیں اور خدا سے شکایت کیا کرتے ہیں کہ اُس نے انہیں کنجوس کیوں پیدا کیا۔

”بھائیو! میں اپنی فطرت نہیں بدل سکتا۔ اگر اگلے سال میں سخی دل نہ ہو تو خود کشی کروں گا۔“

لیکن اس کا کیا کیجیے کہ اگلے سال وہ اور زیادہ کنجوس ہو جاتے ہیں۔ انہیں سگریٹ کی بالکل عادت نہیں ہے۔ مگر جب کسی دوست کی ڈیا کھل جائے تو وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ سلگا کر پیتے ہیں۔ مشروب سے انہیں سخت نفرت ہے لیکن جب کوئی دوست لے آئے تو آؤٹ ہو کر جوتے سے اپنا سر کوٹنے اور اپنے آپ کو ملامت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کا چہرہ صفا چٹ ہے۔ گچی کھچڑی بالوں والے چھوٹے سر پر وقت سے پہلے توڑے ہوئے ادھکے کدو کا گمان ہوتا ہے۔ جسم بوجھل اور توند چھولی ہوئی ہے۔ دوستوں کے پان کھا کر دانت خراب ہو چکے ہیں۔ پتھر سے پر لجاجت اور عیارانہ بستم ہر وقت عیاں رہتا ہے، دیکھنے میں بڑے بھولے بھالے میسر اور بدحوہ لگتے ہیں۔ حقیقت میں بڑے موقع پرست اور اپنی غرض کے دیوانے ہیں۔ نئے آدمی

سے متعارف ہوتے وقت بلجیا سا ہاتھ ملا کر بالکل موم سے جو کہ جھک جاتے ہیں بے تنگی ہانکنے اور ہر بات، ہر موضوع میں ٹانگ اڑانے کے عادی ہیں۔

لاہور میں بھی صوفی صاحب ایک ٹوٹا پھوٹا ہوٹل ہی چلاتے ہیں جو انہوں نے ٹھیکے پر لے رکھا ہے۔ ایک دن ہم سب دوست ان کے پاس کاؤنٹر پر بیٹھے تھے کہ ایک سفید برقع پوش عورت آئی اور اس نے صوفی سے آٹھ آنے مانگے صوفی نے کاؤنٹر کے تمام دروازے کھول کر دکھائے اور بولے:-

”قسم لے لو جو ایک پائی بھی ہو۔“

جب عورت بے نیل و سرام واپس چلی گئی تو صوفی جیب سے اٹھنی نکال کر اس سے کھینے لگے، ہم نے پوچھا:-

”کون تھی یہ عورت؟“

مسکرا کر کہتے سے بولے:-

”میری ماں تھی۔“

آپ کو جب علم ہوا کہ ہماری ٹولی کو ہری آرہی ہے اور قرعہ ہوٹل سلورنگ کے نام نکلا ہے تو آپ نے فوراً ایک پوسٹ کارڈ کے ذریعے ہماری آمد پر خوشی کا اظہار کیا، اور آخر میں صرف اتنا لکھ دیا کہ ہم سے کمروں کا کرایہ نصف لیا جائے گا ماؤ نے ٹکٹے ہر اکر کما۔

”اس کیلئے کی یہ مجال کہ ہم سے کرایہ لے۔ اس نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے ہم اس کے ہوٹل میں آگ لگا دیں گے۔“

ہمارے تیسرے دوست خواجہ دلگیر صاحب نے بڑی متانت سے عینک کے نشیٹے صاف کرتے ہوئے کہا:-

”میرا خیال ہے ہمیں ایک ہی کمرے میں ڈیرا جمانا چاہئے۔“

خواجہ دلگیر جسے ہم سب دوست صرف خواجہ ہی کہتے ہیں۔ بڑا سنجیدہ اور متین نوجوان ہے۔ شادی ابھی نہیں ہوئی لاہور میں کاپی پینسل سٹیٹوں اور پرانی

تباہوں کی چھوٹی سی دکان ہے رنگ گرا سا نولا ہے۔ جسم پتلا ہے مگر قد کاٹھ کشمیریوں کی طرح چوڑا چکلا ہے۔ بھوڑوں کے بال بڑے گنجان ہیں اور پچھو کے ڈنک کی طرح پیشانی پر اوپر کو اٹھے رہتے ہیں۔ دبے پتلے جسم کی چمک منگ باگر بلوں ایسی ہے۔ بہت کم بولتے ہیں۔ بہت زیادہ سگریٹ پیتے ہیں۔ شراب کھاتے ہیں لگاتار ان کی مثال بالکل اس مکرے کی طرح ہے جس کی ساری محنت باریک ریتوں کا خطرناک جال بننے میں صرف ہوتی ہے۔ مکرے کی طرح خواجہ دلگیر کے منہ سے، ہاتھوں سے جسم کی متین اور سنجیدہ حرکات سے غیر محسوس طور پر غیر مرئی باریک نظر نہ آنے والے ریشے ہر لمحہ نکلتے رہتے ہیں اور ایک خطرناک جال اپنے آپ بنا چلا جاتا ہے۔ پھر جال بن کر تیار ہو جاتا ہے تو خواجہ ایک کونے میں اپنی لمبی لمبی ٹانگیں سمیٹے دیک کر بیٹھ جاتا ہے۔ جوئی کوئی ٹکار جال میں الجھتا ہے خواجہ لپک کر اس پر چھٹکتا ہے، اور ان کی آن میں اُسے چٹ کر کے ہڈیوں کا ڈھچھر نیچے پھینک دیتا ہے۔ خواجہ کی چھوٹی ہونی ناک پر باریک کمانی کی عینک ہر دم چڑھی رہتی ہے۔ عینک ایک لفظ اتر جائے تو آپ کو بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ سگریٹ خود بنا کر پیتا ہے، اور دوسروں کو بھی بنا کر دیتا ہے۔ عورتوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا دھیمہ، پر اسرار اور خطرناک ہوتا ہے۔ صنف نازک کے سامنے بیٹھ کر وہ بڑے اطمینان سے انگلیاں چٹختا ہے اور سگریٹ بنانا کر پیتا رہتا ہے۔ کچھوے کی طرح وہ بڑی موقع شناس کاہلی سے دھیرے دھیرے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور پھر اچانک حملہ کر دیتا ہے۔

ہمارا چوتھا راجھی لاہور کے ایک مشہور نابنائی کاڑھ کا تھا جس کی شر کے صدر بازار میں بیکری کی دکان تھی تین بار میٹرک میں فیل ہونے کے بعد جب اس کے باپ نے لاڈلے بیٹے کو بیکری کے دھندے میں لگا دیا تو ڈیل روٹیاں کاٹتے کاٹتے نازک ہمزاج اچی کی انگلیاں دھکنے لگیں چنانچہ اس نے ایک سال تک تو چمڑے کے ایک مقامی تاجر کی دکان پر جزوقتی منشی گری کا کام کیا، وہاں سے بھاگ کر فینائیل اور ٹارپین بنانے والی ایک فیکٹری میں ٹائم کیپر ہوا۔ یہاں جی نہ لگا تو ایک ریٹائرڈ ڈیپٹ

کلرک کے بچوں کو اردو اور حساب پڑھانے پر لگ گیا۔ پہلے ہی روز ہیڈ کلرک کی زبردور نوٹ کھٹ لڑکی سے آنکھ لڑ گئی۔ حساب کی کتابوں اور کامیوں کے ذریعے رقبے بازی شروع ہو گئی، ایک روز دونوں عاشق و معشوق بیڑھیوں میں کھڑے مشغول تھے کہ ہیڈ کلرک نے دیکھ لیا۔ اچھی نے ایک ہی جہت میں چھ بیڑھیاں پار کر کے دروازہ کھولا اور باہر نکل بھاگا۔ اس کے بعد اس نے شہر کے اس علاقے کا کبھی رخ نہ کیا۔ آج کل اس کا کام کبھی کبھی خالی وقت میں ٹائپ سیکھنا۔ باپ کی گندی پر بیٹھ کر سگریٹ چائے کا خرچ اڑانا اور صبح و شام لڑکیوں کے کالج کے پاس بس سٹاپوں پر منڈلانا تھا اچھی کا رنگ گورا اور جسم دھلا تھا، ناک ٹھری ہوئی تھی اور چہرے پر نسواری رنگ کے بنے شمار تیل تھے اُسے صرف کپڑے پہننے اور لڑکیوں کو عاشقانہ خطوط لکھنے کا شوق تھا اس کے پاس کئی ایک لڑکیوں کے محبت بھرے خطوط تھے۔ جنہیں اس نے تصویروں کی طرح ایک سبز رنگ کی جلد والی البم میں لگا رکھا تھا۔ یہ البم وہ اپنے ہر دوست کو دکھانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی کھینچی ہوئی آنکھوں کی سیلی رنگت بڑی خطرناک تھی۔ بظاہر اس کے چہرے میں کوئی کشش نہ تھی۔ لیکن آنکھوں کی اس سیلی رنگت میں بلا کا جادو تھا۔ ایک عجیب قسم کی بے بسی عاجزی، مسکاسی، اور کراہت کا ملا جلا احساس تھا۔ جو خواجہ دیگر کے خیال میں عورتوں کے لئے اہم اعظم کا درجہ رکھتا ہے۔

کوہ مری کی سیر کا پروگرام اچانک بن گیا۔ صوفی کی بد قسمتی کہ اُس نے مری میں جا کر ہوٹل سلورلنگ کا ٹھیکہ لے لیا اور پھر وہیں کارڈ بھی ڈال دیا۔ دراصل خط اس نے اپنی برتری جتانے کے لئے لکھا تھا کہ اب وہ سارا سیزن مری کی ٹھنڈی ہواؤں میں رہے گا، اور وہیں بولاہور کی گرمی میں مجلس رہے ہوں گے۔ یاد کر کے خوش ہوا کرے گا۔ ماؤ نے خط پڑھنے کے بعد زور سے ناک صاف کر کے اعلان کر دیا کہ ہمیں اس حرام زادے کی خبر لینی چاہیے۔ لہذا ہم سب کوہ مری کی طرف کوچ کر دینا چاہیے۔ پروگرام تو بن گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ رقم کہاں سے پیدا کی جائے۔ ماؤ نے اپنے ریلوے کے دفتر سے پندرہ یوم کی رخصت

لی اور ساتھ ہی اپنی بہن کی شادی کا سہانہ بنا کر دفتر کے امدادی فنڈ سے دو سو روپے قرض بھی لے لئے۔ خواجہ دیگر نے رُف کاغذ کا ایک پرانا سٹاک ایک دوسرے کاغذ کے ہاتھ ادا کرنے پر نے بیچ ڈالا۔ میں نے اپنے بڑے بھائی صاحب سے دو سو روپے ہتھیا لئے۔ اچھی نے دکان سے کچھ روپے اڑاے اور ہم چاروں یا زہری کی طرف چل پڑے۔

ماؤ کے پاس نصف ٹکٹ کاریلوے پاس تھا۔ ہم ریل کی گاڑی سے روانہ ہوئے۔ ماؤ نے پہلے ہی آکر ڈبے میں ادھر ادھر چالاک بندر کی طرح پھلانگ کر ہم سبھوں کے بستر لگا دیئے اور دھوٹی بنیان پہن لیٹ کر جاسوسی ناول کی ورق گردانی شروع کر دی۔ سارا راستہ بڑے مزے سے کٹا۔ جہلم سے پنڈی تک ماؤ نے اپنی بے ہنگم راگداری سے کسی مسافر کو سونے نہ دیا۔ پھر اس نے پہلی جنگ عظیم کے ایک توپچی کی داستان شروع کر دی جس پر ایک انگریز کمانڈر کی بیوی لٹو ہو گئی تھی اور جو چوری چھپے اُسے اپنے ہاتھ سے بنا لئے ہوئے کیگ بھیجا کرتی تھی۔

خدا نے اس نیک دل بی بی کو بڑی موٹی موٹی آنکھیں عطا کی تھیں۔ دل چھیک توپچی کا بیان ہے کہ اُس نے ایسی ماہ پارہ کبھی دیکھی نہ سنی۔

جب بی بی ماؤ یہ داستان سنا تا رہا خواجہ سائے اپنے بستر پر بنیان اور انڈر پیرینے بیٹھا انگلیاں چٹختا رہا۔ ماؤ نے جب ایک بار زبان سے چٹخا رہا تو اچھی کی نمید لوٹ گئی۔ وہ اپنی بی بی کی آنکھوں سے ماؤ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیا کھا رہے ہو؟“

گاڑی راول پنڈی پہنچی تو دن چڑھ آیا تھا۔ مری جانے والی بس صدر جا کر ملی۔ دھوپ بڑی تیز تھی اور گرمی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ ماؤ پسینے میں نرہ ہو رہا تھا۔ کھلے گریبان میں سے سیاہ بالوں کا جنگل باہر کو آ رہا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور بار بار منہ پونچھتے ہوئے گرمی کو کوس رہا تھا۔ خواجہ جیب سے زمبک مرہم کی خالی ڈبی نکال کر سگریٹ بتانے لگا۔ تو ماؤ نے پٹھکار نے انداز میں ہاتھ جھٹک

کر کہا۔

”ارے لعنت ہے تم پر۔ اتنی گرمی میں بھی باز نہیں آتے سگریٹ پینے سے۔“

خواجہ خاموشی سے ہنستا رہا۔ اچھی نے گردن پر رومال پھیرتے ہوئے کہا۔  
”لابار خواجہ ایک میرے لئے بھی۔“

ماؤ نے تپکون کے اندر سے قمیض باہر کھینچتے ہوئے کہا۔  
”پہاڑ کے خیال سے زیادہ گرمی لگ رہی ہے کوئی نہیں۔ ابھی کوئی دم  
میں ٹھنڈی ہوائیں بوس دکنار کر رہی ہوں گی۔“

۲  
سکورنگ ہوٹل کے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے کنجوس صوفی نے ہماری ٹولی کو سامان  
مزدوروں کے سروں پر رکھوائے اقساں و خیزاں سڑک کی چڑھائی چڑھتے دور  
ہی سے دیکھا اور اس کا رنگ اڑ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اندر گیا۔ میلی کیلی  
وردی پوش نوکروں کے پاس جا کر بھولی ہوئی توند پر ہاتھ مار کر بولا:-  
”کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ وہ میرا مال کھانے والے میرے سوتیلے آگئے ہیں“  
اس کے بعد اس نے پاگل ریچھ کی طرح خرخراتے ہوئے کمرے کے دوہیں  
ہلکاٹے اور باہر کاؤنٹر پر آگیا۔ ہماری ٹولی اس وقت ہوٹل کے باہر پہنچ چکی  
تھی، اور مزدور سامان رکھ رہے تھے۔ ماؤ نے جواب خاکی رنگ کا گرم مفلر اوڑھے  
تھادونوں، تھیلیاں ملتے ہوئے کہا۔

”ارے یہاں کیوں رکھ رہے ہو اوپر لے جاؤ۔۔۔۔۔ کیوں جی صوفی کون  
ساگرہ ہے؟“

صوفی بیتیسی کھول کر بڑے عیارانہ مخصوص تبتم کے ساتھ ہم سب کو ملا  
”واہ واہ! خوب رونق رہے گی۔“

خواجہ نے کہا۔

”خوب مزار ہے گا پیارے۔ تمہارا مال کھائیں گے اور اپنیوں کی روح کو



ثواب پہنچائیں گے۔“

صوفی اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ نادر شاہ کی فوجیں رنگیلے کے محل میں داخل ہو چکی تھیں۔ کھستانی سی ہنسی ہنس کر بولا۔  
”کھاؤ پیارو کھاؤ۔۔۔ دوستوں سے بڑھ کر کوئی شے پیاری نہیں۔“  
اجی نے ماؤ کو کہنی ماری۔

”یہ تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ تم کروں کے نمبر بتاؤ۔“

”جیسی تمہاری سمولت کے لئے ایک پورا ہال مکہ ریزرو کر دیا ہے۔ اس کمرے میں آگ جلانے کی انگیٹھی بھی ہے۔“

صوفی جسے ہال مکہ کہہ رہا تھا، وہ ہوٹل سورنگنگ کی دوسری منزل پر ایک سٹور روم تھا، جو کاٹھ کباڑ سے بھر پڑا تھا، اور سیلین اور جلی ہوئی لکڑی کی ٹلیاں بواٹھ رہی تھیں ماؤ صوفی کو گایاں دینے لگا۔

حوا مزادے! ہم کوئی مفت خور سے ہیں، جو اس چٹاگر میں رہیں۔ کیلئے ہم تجھے کرایہ دیں گے۔“

صوفی ہنسنے اور توند پر ہاتھ پھرنے لگا۔

”ارے یارو گرم کیوں ہوتے ہو۔ ایسا اہل نمبر کو سارے ہوٹل میں نہیں میں اسے ابھی صاف کر دیتے دیتا ہوں۔ ارے رنجو۔۔۔۔۔ ادھر آئے۔۔۔۔۔“  
صفائی کے بعد کمرے کی بدھیتی اور بے ڈھنگا پن اور زیادہ نمایاں ہو گیا اس کی دیواریں کتر زدہ تھیں پھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ کونے میں را کو جھینگر بولتے اور دن کو چھپکیاں رنگا کرتیں۔ آتش دان کی دھبیں ڈھبے جلی تھیں اور دیوار دھوئیں سے کالی سیاہ ہو کر باہر کی روشنی میں لٹک رہی تھی جب کہ کا کوڑا کرکٹ ہٹایا گیا تو نیچے سے ایک جھنگا پٹنگ نمودار ہوا جس کی چولیں ہاتھ لگانے سے ہی بول اٹھتیں۔ ہم چاروں میں اس بات پر جھگڑا شروع ہو گیا کہ پٹنگ پر بستر کون جھائے؟ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ پٹنگ آخر پٹنگ تھا اور زمین سے تو ہار

رہے بستر تھا۔ آخر طے ہوا کہ ہر آدمی ایک رات اس پر سویا کرے پہلی رات ماؤ نے انتخاب کر لی۔ اُس نے بڑے ٹھٹھے سے اس پر اپنا بستر جما دیا۔ انجی کیس میں سے شیو کا سامان لوٹا ہوا گول آئینہ، گنگھی، کریم کی ٹیشی، تیل اور جاسوسی ناولوں کا پندرہ نکال کر اُسے گرد آلود کارنس پر رکھ دیا۔ ہم لوگوں نے بھی مجبوراً اپنے بستر پر فرش پر بچھا دیئے۔ اب ہر شخص بڑے زور شور سے داڑھی بنانے لگا۔ میں باہر بالکونی میں آ گیا۔ بالکونی کیا تھی دیمک زدہ پرانی لکڑی کی ایک چٹان تھی جس کے آگے بانس کی بازو لگا دی گئی تھی۔ سامنے جھونپڑی نما مکانوں کا سلسلہ تھا جس کی چھکی ہوئی دیواروں کی کھڑکیاں ہماری طرف کھلتی تھیں۔ نیچے گلی تھی جس میں سارے ہوٹل کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔ اور جس میں سے طرح طرح کی بدبو اٹھ رہی تھی۔ کیس سے پانی کے مسلسل گندی نالی میں ٹپکنے کی صدا آرہی تھی مری کا آسمان ابرا کوڈ تھا، اور ٹھنڈی بلکہ پکلی طاری کرنے والی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ چونکہ ہم ابھی لاہور کی سخت گرمی سے نجات حاصل کر کے اس بہشت میں داخل ہوئے تھے۔ اس لئے سردی کا خیال کئے بغیر بڑے مزے سے صرف بنیان میں ہی ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے۔ میں نے آئینہ بالکونی کے بانس میں اڑایا، اور صابن لگا کر شیو بنانے لگا۔ کنبخت صوفی نے ہمیں شیو کے لئے انتہائی سبز پانی بھجوا یا تھا۔ جس نے بالوں کو نرم کرنے کی بجائے انہیں مزید سخت بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب ہم سب شیو سے فارغ ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے گالوں کی کھال اتار گئی ہے مگر بال ایک بھی نہیں اترا چرکے ماؤ کا تو برا حال ہو رہا تھا۔ جگر جگر سے چہرہ پھیل گیا تھا۔ جہاں اُس نے پاؤ ڈر تحو پ رکھا تھا۔ سوٹ کیسوں میں سے ہم نے بڑی محنت سے استری کر کے تنہ کی ہوئی پتلونیں فیضیں، مفلر اور سو بیٹر نکالے۔ ان میں سے فینائل کی گولیوں کی بو کے بھیکے اٹھ رہے تھے۔ انیس بیگروں میں ڈال کر دروازوں کی چٹینیوں سے لٹکایا کہ چونکہ دیواریں شو زدہ تھیں اور کپڑوں کی الماری کا ہوٹل سلورنگنگ میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، نہانے کے لئے باری باری

نیچے ایک ایسے غسل خانے میں جانا پڑا جس کے فرش پر پھسل کی وجہ سے کھڑا ہوا کسی مرد  
جگہ کا بھی کام تھا۔ اس پر ستم یہ کہ اس کا بغیر چٹختی کے دروازہ بار بار ٹھٹھ سے کھل  
جاتا۔ معلوم ہوتا کہ میرا تسلا ہاتھ میں لئے پانی لینے آیا ہے۔ میرا اس قسم کے مناظر کا مای  
تھا۔ وہ ہماری طرف آنکھ اٹھائے بغیر بڑے اطمینان سے تل کے نیچے تسلا رکھ کر اسے  
بھرتا اور باہر نکل جاتا۔ نہانے کے بعد سردی میں سب کے دانت بجنے لگے۔ فوراً گرم  
چائے منگو کر پی گئی۔ جس میں سے ایک ایسی کلوٹی کی بو آرہی تھی، جو وائش کے  
پیسے میں بڑی بڑی سرگئی ہو۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر کپڑے پہنے گئے۔ پتلونوں پر  
اور ٹائیوں کا تبادلہ ہوا۔ میری ٹائی اچھی کوپنڈ آگئی۔ اچھی کا پھولدار سوئیٹر خواجہ نے پہن لیا  
اور اپنی جمرے کے جیکٹ اُسے دی۔ ماؤ نے اپنا ہزار سالہ پرانا شادی والا گبروین کا بوٹ  
زیب تن کیا جس کی میل استری کی وجہ سے جگہ جگہ چمک رہی تھی۔ اس نے ایک سوئیٹر  
نبیان کے اندر اور دوسرا قمیض کے اوپر پہنا، اور خاکی ادنی مفلر گرون کے گرد پیٹ  
لیا۔ جب ہم چھیلے بنے، لپ بھپ کرتے شہزادوں کی طرح سری کی مال روڈ پر  
نکلے تو کسی کو دیکھ کر خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ ہم ہوٹل سلورکنگ کے کباڑ خانے  
میں رہتے ہیں، اور ہم نے اپنے بستر سید فرش پر لگا رکھے ہیں۔

مال پر بڑی جیل پہل تھی۔ سیزن اپنے جو بن پر تھا۔ عورتیں ریشمی ساریوں،  
غاروں اور شلوار قمیضوں میں ملبوس، بھرپور میک اپ کئے ادھر ادھر جیل پھر  
رہی تھیں کالج کی بال کٹی شوخ و شنگ لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں ہنستی ہنستے  
لگاتیں خوشبو اڑاتی سنہری بدلیوں کی طرح گزر رہی تھیں، پھیکے پٹمرہ چہروں والے  
یو باری مکرمیوں کی مدد سے ہانپ ہانپ کر مال روڈ کی چڑھائی چڑھ رہے تھے  
ہوٹلوں میں بڑی گامگمی تھی۔ شام ہونے کو تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا آسمان ابلو  
میں چھپ گیا تھا۔ سرمئی بادلوں کا کوئی زندہ دل آوارہ کھڑا ادھر ادھر چڑھ کے  
درختوں میں سے ہوتا ہوا جھیکے سے مال پر اتر آتا اور سیاں وہاں خوبصورت آنکھوں  
والی خوشبودار لڑکیوں کے گال سہلاتا، وادی کی طرف نکل جاتا۔ مال روڈ پر کچھ دیر

میلے دھند چھا جاتی، اور کانوں میں جھولتے اجرس آویزے نظروں کے سامنے  
سے ادھل ہو جاتے۔ پھر جب عاشق سراج بادل کا شہزادہ خوشبوؤں اور خوبصورت  
دیکھنا دیکھنے مال پر سے پھسل کر وادی میں اتر جاتا تو لوگوں کے چہروں اور کپڑوں  
پلی کی ہلکی سی تہ جی ہوتی عورتیں جلدی جلدی دکانوں میں داخل ہو کر چہروں پر پرف  
رتیں۔ لمبی لمبی گھٹنوں پر تنگ، ہوتی قمیضوں والی کشیدہ قامت لڑکیاں ہنس  
نس کر ایک دوسری سے باتیں کرنے لگتیں۔ یوں معلوم ہوتا گویا گہرے دبیرا کے  
بٹ جانے سے ایک دم سورج نکل آیا ہو، اور اس کی سنہری کرنوں سے وادی  
وشن ہو گئی ہو۔

”مال پر نظارہ بازی کیلئے یمنر ہوٹل سے بڑھ کر کوئی اچھی جگہ نہیں ہے دوستو“  
یہ خیال زندہ دل ماؤ کا تھا۔ چنانچہ ہماری ٹولی نے سمیر کے جہازی ہوٹل  
ن پہنچ کر ایک بڑا ساموزوں کونہ قبضے میں کر لیا، ہوٹل میں اس وقت بڑی رونق  
تھی کوئی ٹیبل خالی نہ تھی کونے میں بیٹھتے ہی ماؤ کی آنکھوں نے بڑی چابکدستی سے  
دم پھر کر ماحول کا پورا جائزہ لیا، اور آخر ایک جگہ مرکوز ہو گئیں۔ یہاں تیس بیٹیں  
اس کی ایک ہٹی کٹی لال گلاں پھولے پھولے گالوں والی عورت بیٹھی ایک گننے  
نئی سے باتیں کر رہی تھی۔ عورت کے بال برجی بارودت کے انداز میں ماتھے  
پر سے ہوتے تھے۔ جسم کے ساتھ بالکل فٹ ریشمی قمیض اس کے جسم کے  
مات بھدے اور بھاری بھر کم خطوط نمایاں کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا، کہ ہمارا  
دست ماؤ اس کی طرف ٹھٹھکی لگا تے دیکھ رہا ہے..... چہرے کا رنگ فق  
ہے۔ اور آنکھوں میں بار بار پانی آجاتا ہے۔ خواجہ دگیر نے اپنی انگلیاں ماؤ کی  
پلی میں گھس دیں۔

”کینے! کیوں اپنا خانہ خراب کر رہا ہے۔“

ماؤ کھی کھی کر کے گردن ایک طرف لٹکا کر ہنسنے لگا۔ ہم گرم گرم کافی پی رہے  
تھے، اور باہر ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی تھی۔ مال پر اڑتی پھرتی تیلیوں کے قدم

تیز ہو گئے زاب لڑکیوں کی جو ٹولیاں آرہی تھیں۔ انہوں نے نیلی نیلی، زرد اور  
پنک رنگ کی تانوں کی برساتیاں پہن رکھی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رنگ  
بزم پھولوں کے گلہستے سیر کیلئے مال روڈ پر نکل آئے ہوں۔

”یارو! اس حسینہ گلزار کا آنا پتہ معلوم کرنا چاہئے۔“

ماؤ نے بڑی تشویش سے سر ہلا کر کہا۔ خواجہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔

”ارے گلہام کے پُتر! کبھی تو نے آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھی ہے کیا؟“

”شکل دینا میں کوئی شے نہیں خواجہ۔ میں نے کہا آسکر وائلڈ کا وہ جلد تو تم نے  
سنا ہی ہوگا کہ عورت کالوں کے بھروسے محبت کرتی ہے، اب ایک قول میرا بھی  
سن لو۔ حسین سے حسین عورت ایک گونگے کے قدموں پر جھک سکتی ہے بشرطیکہ گونگا  
دولت مند ہو تو تم اسے ایک فرسودہ خیال کو گے، لیکن میں کہتا ہوں یہ ایک بہت  
بڑی حقیقت ہے۔ عورت صرف زبان اور دولت سے عشق کرتی ہے۔“

اجی نے دیا سلائی کان میں گھماتے ہوئے کہا۔

”اس عورت کے متعلق کیا خیال ہے جناب کا؟“

ہم سب نے نیچے دیکھا۔ مال پر ایک موٹی بھدی بے حد بد شکل عورت  
بے اندازہ میک اپ تھوپے قدم قدم پر شرقاتی بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کے قہقہے کی آواز ہمارے سوا ہومل میں اور کسی نے  
نہ سنی۔ ماؤ بڑے موڈ میں آ رہا تھا، اور بڑی گرم گرم متلاشی نگاہوں سے برجی بارود  
کے بالوں ایسی موٹی عورت کو دیکھ رہا تھا۔ جب تیسری بار ماؤ نے کافی کا آرڈر دیا  
تو خواجہ نے کافی کے بجٹ کے پیسے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ ماؤ دانت نکال  
کر بولا۔

”فکر نہ کرو۔ اس آفٹ روزگار کے نام پر ایک کافی میری طرف

سے۔“

رات کو جب ہم مال کی سیر کے بعد قسم قسم کی خوبصورت لڑکیوں کے تصویرات

ہوٹل سلور رنگ کے کباڑ خانے میں آئے تو وہاں ایک پل کھڑے ہونے کو جی  
ہا۔ ماؤ نے اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی ہریل سی کالی تلی کو جوتا مارتے ہوئے موٹی  
کالی دی اور کہا۔

”لغت ہے ہماری زندگی پر۔ آج کی رات تو اس ملکہ ناز کے قدموں  
پر ہونی چاہئے تھی۔“

باہر بوند باندی نے اب ہلکی ہلکی بارش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ہم نے کھانا  
دیا تو کچھ دیر صوفی بھی ساتھ ہی آگیا۔

”میں نے سوچا، اپنے یاروں کے ساتھ ہی مل کر کھانا کھا لوں۔ زندگی کا کیا  
رہ ہے۔“

ہمارے ساتھ کھانے پر وہ بھوکے سانڈ کی طرح جُٹ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ  
بب سے مری میں آپا ہے اسے آج ہی کھانا نصیب ہوا ہے۔ ماؤ نے صوفی  
ہاتھ پیرچ مار کر کہا۔

”کیئے ہوش کے ناخن لے..... بوٹی پر بوٹی کھاتے جا رہا ہے۔“

صوفی بڑی لجاجت سے بولا۔

”میری جان! میں کیا کروں۔ یہاں تو بوٹی بوٹی پر میرے نام کی مٹر لگی ہے  
پھر وہ جھلنگا پلنگ کی طرف دیکھ کر بولا۔

”ارے واہ! یہ پلنگ یہیں پڑا تھا؟ میں نے خواہ مخواہ نہر تھیں کیلئے باہر  
ہار پائی منگوائی۔ چلو تم بھی کیا یاد کرو گے پلنگ پر سو کر عیش کرو۔“

کھانا کھا کر صوفی نے ایک زبردست ڈکاری، اور تو نہر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا  
”یار چائے کا آرڈر نہیں دو گے؟“

خواجہ دیگر زمبک کی خالی ڈبی میں سے تمباکو نکال کر باریک کاغذ پر رکھتے  
کے چپٹا۔

”او کیئے یہاں سے دفع ہو جا۔“

”مشرم کرو خواجہ — خدا کی قسم کبھی ہماری دوستی کو یاد کرو گے۔ لاؤ سگریٹ پلاؤ۔“

خواجہ کا پہلا سگریٹ صوفی نے سلگا کر ایک لمبا کش لیا، اور کھانستے کھانستے باہر نکل گیا۔ رات کو کمرہ بج ہو گیا۔ سیلی دیواریں ٹھنڈی ٹھنڈی آپس بھرنے لگیں بند کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں میں سے سرد ہوا کے فرائے چلے آرہے تھے اس پر طرہ یہ کہ دو ایک جگہوں سے چھت بھی ٹپکنے لگی بارش تھی کہ تھننے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ ہم سب اپنے اپنے لیٹاؤں میں گھس گئے۔ ماؤ کو پلنگ پر بیٹھے ہی معلوم ہو گیا کہ اس نے پلنگ کا انتخاب کر کے بہت بھاری غلطی کی ہے۔ کیونکہ پلنگ کھٹملوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے بار بار پہلو بدلنے سے پلنگ بڑے ڈراؤنے انداز میں چرچرانے لگا۔ آخر ماؤ اپنے لحاف سے باہر کود آیا۔ اس نے بتی جلائی۔ اچھی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟“

”کھٹمل۔“ ماؤ نے چھاتی پر رینگتے ہوئے ایک کھٹمل پر زور سے ہاتھ مار کر کہا

ہم سب ہنس پڑے۔

”اور سوؤ بیٹا پلنگ پر۔“

ماؤ نے پیڑے پین کر کمبل سے منہ سر پٹیا اور میرے لیٹر میں آکر بیٹھ گیا۔ بارش نے مری کی وادی اور اونچی اونچی سڑکوں کے خوب صورت جنگلوں، کانٹوں اور غریب واڑوں کے جھونپڑوں کو دھند کی گہری چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔

ماؤ سردی میں ٹھٹھر رہا تھا، کہنے لگا۔

”یار واگ جلائی جائے۔“

اس نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں کوئی شے جلاانے والی نہ تھی۔ تاہم ماؤ نے دروازہ کھول کر بالکونی کے فرش کی دو تین کچھیاں اکھاڑیں، اور انہیں آتشزدانہ بنادیں جو ٹکر آگ سلگالی۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ ہر کوئی کھانستا ہوا ماؤ کو گالیاں دینے

لگا۔ مگر جب سُرُخ سُرُخ گرم گرم آگ روشن ہو گئی تو سب آتشزدان کے قریب آکر لیٹروں پر لحاف اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ چائے کی کیتلی آگ پر رکھ دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد چائے کا دودھ چلنے لگا۔ ماؤ نے چٹخارہ بھر کر کہا۔

”جاو ابھالو تنٹھیا لگی میں ہے۔ سالاسیان ہوتا تو چائے کی جگہ مشروب اجڑیں اور چل رہا ہوتا۔“

اچھی کی آنکھیں چپکنے لگیں۔ خواجہ نے سگریٹ بنا کر اچھی کو دیا۔ دوسرا خود سلگا کر بولا۔

”میں نے اُسے خط لکھ دیا ہے۔ امید ہے کل تک آجائے گا۔“

”بس پھر مرز آجائے گا۔“ ماؤ بولا۔

خواجہ اپنی باریک کمانی دار عینک کے شیشے منہ کی بھاپ دے کر صاف کرتے ہوئے بولا۔

”پورا راجہ اندر ہے راجہ اندر۔“

ماؤ نے چائے کی تیسری پیالی غماغت چڑھا کر ڈکار مار کر کہا۔

”بس پھر کل اس کباڑ خانے میں راجہ اندر کا دربار لگے گا۔“

”اور آج؟“ اچھی نے پیلی آنکھیں جھپک کر پوچھا۔

ماؤ ہنس پڑا۔ آگ کی روشنی میں اس کی گنجی کھوپڑی چمک رہی تھی۔ ٹیڑھے

میرٹھے دانت نکالے وہ کوئی بھوت معلوم ہو رہا تھا۔

”و آج راجہ اندر کی داستان ہوگی۔ کمانی لکھنے والا اس داستان کو پراچین بھارت کے ایسے دور سے شروع کرتا ہے۔ جب آکاش کی اپسراییں دھرتی کے بایکوں کے ساتھ شادیاں کیا کرتی تھیں۔ کہتے ہیں اسی زمانے میں.....“

اس کے بعد ماؤ نے اپنے مخصوص دل نشیں اور شیریں انداز میں تشبیہوں اور استعاروں کے سنگار سے آراستہ پیراستہ ایک ایسی دل رُبا داستان کا آغاز کیا جس نے ہم سبھوں کی نیند اڑادی۔

اس نے ایک سگار ماؤ کو دیا، اور بولا۔  
 ”یہ اسی کمپنی کا سگار ہے جو چرچل کے لئے سگار تیار کرتی ہے۔ مہاراجہ جو جھوٹو  
 کے پاس پہلی بار میں نے یہ سگار پیا تھا۔ اس کے بعد تو میں نے اس کے علاوہ  
 کبھی کچھ پیا ہی نہیں۔ ڈائریکٹ انگیلنڈ سے منگواتا ہوں۔ ڈیوٹی وغیرہ نکال کر ایک پڑے  
 کا سگار پڑتا ہے۔“  
 ماؤ کو بے اختیار کھانسی آگئی۔

”بڑا کڑوا ہے یہ!“

”اجی مدراس میں اس سے بھی کڑوے پئے ہیں میں نے۔“  
 اس کے بعد ایجنٹ کی ہم سے دوستی ہو گئی۔ وہ اکثر ہمارے پاس آنے لگا  
 لیکن ہمیشہ بغیر اپنے کمرے سے ہی پی کر آتا اور سگار بھی صرف ایک ہی لے کر آتا جو  
 اس کے منہ میں سلگ رہا ہوتا۔ ایک روز لڑکیوں کی بات چل نکلی تو کہنے لگا۔  
 ”والی بیجا پور میرا بڑا فاسٹ فرینڈ تھا۔ سارا محل میرے ڈسپوزل پر تھا۔ دربار  
 میں ایک لڑکی مجھ پر عاشق ہو گئی۔ دینا کی حسین ترین لڑکی تھی۔ میرے ساتھ لکھنؤ کے  
 میرے موقی لے کر فرار ہونے پر تیار ہو گئی۔ لیکن بھائی میں نے ارادہ بدل دیا۔ بڑی کسلی  
 کیلئے پیدا ہو جانے کا ڈر تھا۔“

صوفی نے ہوٹل کے احاطے میں سیب کا پودا لگایا۔ وہ کبخت بڑا ہی ہونے میں  
 نہیں آتا تھا۔ ایجنٹ نے اس کی ٹہنی پر نبض دیکھنے کے انداز میں ہاتھ رکھ کما۔

”عزیزی سیب نہیں ہے۔ پیوندی ہے، اور پھر مرچکا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ میرے  
 ایسٹ آباد والے گھر میں عزیزی سیب کا درخت ہے۔ شہنشاہ جاپان کے خاص محل کا  
 تختہ ہے مجھے میرے ایک دوست افسر زراعت نے دیا تھا۔ عزیزی سیب کے علاوہ  
 میں نے کبھی کوئی اور سیب نہیں کھایا۔“

ایک دفعہ ایجنٹ صاحب بیمار پڑ گئے۔ میں مزاج پُرسی کو لگیا بستر میں دھنسنے  
 تھے۔ گرم پانی کی تین بوتلیں لحاف کے اندر دوپچ رکھی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

ہمارے ساتھ ہی بازو والے کمرے میں ایک دقیانوسی انشورنس کمپنی کے ایجنٹ  
 کی رہائش تھی۔ تنگ پیشانی، عورتوں ایسے بال پتھر ایسا سرد بے جان چہرہ چپک کے  
 داغ، گدھ ایسی نوکیلی ناک۔ چالیس پتالیس کی عمر۔ ہر وقت سجا بنا رہتا۔ ساری  
 عمر بھارت کے بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی مصاحبت میں گزری تھی۔  
 جس کی وجہ سے گفتگو کا انداز خوشامدی اور پھر بازی کی حد تک مبالغہ آمیز ہو گیا تھا۔  
 صبح صبح سچ بن کر چمڑے کا تھیلہ ہاتھ میں لے اس کا ٹھکڑا گلام سے باہر نکلتا اور دوپہر کے  
 کھانے پر واپس آجاتا، نیز طبیعت میں مانگے کا امیرانہ ٹھاٹھ جڑ پکڑ چکا تھا۔ چنانچہ خواہ خواہ  
 ہوٹل کے بیروں پر برستے رہنا، اور صوفی کے سامنے بڑے بڑے ہوٹلوں کے حوالے  
 دیتے رہنا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی شام کو اسے ملنے ایک عیسائی عورت  
 آیا کرتی تھی۔ وہ لب بھپ کرتی لنگا سنبھالتی سلور کنگ ہوٹل کی لکڑی کی چوچوں کرتی  
 سیڑھیاں طے کر کے ایجنٹ کے کمرے میں داخل ہو جاتی جو اس کے انتظار میں  
 نیم وا ہوتا۔ دروازہ اس کے اندر داخل ہوتے ہی بند ہو جاتا۔ ہم نے ماؤ کے  
 مشورے پر عمل کرتے ہوئے۔ دیوار میں ایک جگہ جہاں لکڑی کے تختے لگے تھے،  
 سوراخ کر رکھا تھا۔ ادھر وہ محبت کی ماری ایجنٹ کے کمرے میں گھسی ادھر ہم  
 چاروں سوراخ کی طرف اٹھ دوڑتے۔ ایک روز سگار جلانے کے لئے ماچس کی  
 تلاش میں یہ ایجنٹ ہمارے کپڑے خانے میں نکل آیا۔ ہماری اس سے دوستی ہو گئی

”تکلیف تو بہت ہوتی ہوگی۔“

سر جھٹک کر بولا۔

”مجھے کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔ ایک بار ہوئی تھی تو مٹری کے پندرہ ڈاکٹر جمع کر لئے تھے، اور ان میں سے کوئی بھی کرنل کے رینک سے نیچے نہ تھا۔ ڈاکٹروں کا پورا بورڈ بیٹھ گیا تھا۔“

ویسے یہ آدمی بڑا ہوشیار تھا۔ اس میں اصل بات کو بڑی چالاکی سے ٹال جانے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ ماؤ نے کئی بار اس سے پوچھنا چاہا کہ وہ عیسائی حسینہ کون ہے جو اُسے کبھی کبھی شام کو ملنے آیا کرتی ہے؟ لیکن ایجنٹ ہر بار بات کا رخ کسی دوسری طرف پھیر دیتا، اور اتنی خوب صورتی سے کہ ہم سب اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے ہم سب نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ اس پُرکار ایجنٹ کے پیچھے جاوا بھالو کو چھوڑیں گے وہ اسے چاروں شانے جیت گرا دے گا۔

جاوا بھالو پانچویں روز نشتیا لگی سے مری آیا۔ بھالو ڈن ایسا ڈیل ڈول، بائیں آنکھ کے نیچے سیاہ مساتتی ہوئی بھنویں۔ نائے قد کا چوڑا چکلہ ہمارا پانچواں یار جاوا بھور سے رنگ کی فوجی برانڈی میں ملبوس ہوٹل میں داخل ہوتے ہی صوفی سے بنگلیسر ہو گیا۔ اپنے بھرپور شکم میں لے کر اس نے صوفی کی ہڈیاں کرکڑا دیں۔

جاوے نے بھی پرد گرام کے مطابق اپنا بستر ہمارے ہی کمرے میں یا تھکے میں لگا لیا۔ اس نے اعلان کر دیا۔

”دوستو! اس مکھی چوٹس صوفی کے ہوٹل کی انیٹ سے اینٹ بجا دو۔ اس کا سب کچھ کھانی کر اسے خاک سیاہ کر دو۔“

۴

اگلے روز شام کو سمینر ہوٹل کا پھر پرد گرام بنا۔

چار بجے سے ہی ہمارے کباڑ جانے میں ہر آدمی تولیہ لئے ادھر ادھر منڈلاتا، کپڑوں کو الٹا پلٹا، دن کے دن ادھار مانگی ہوئی پتکوں، ٹائیٹوں اور قمیصوں کو استری کرتا اور گرگر کر شینو بناتا نظر آرہا تھا۔ چھ بجے بنے ٹھنڈے بانگوں کا قافلہ سمینر کی گیلری میں آکر بیٹھ گیا۔ کافی منگوا کر ہم نے نظر بازی شروع کر دی۔ مال پر رنگ برنگ ساروھیوں غراؤں اور شلواریوں کی ٹوٹیوں کی ٹولیاں گزر رہی تھیں۔ کوئی عورت ہماری نگاہوں سے پکڑ نہ گزرتی تھی۔ ہوٹل میں بھی اچھی خاصی عورتیں بیٹھی کافی پی رہی تھیں۔ خواجہ کافی کی پیالی سامنے رکھے، ہاتھ سے بنایا ہوا سگریٹ منہ میں لئے بیٹھا تھا، اور باری باری ہر عورت کو گھورتے ہوئے انگلیاں چٹخا رہا تھا ماؤ بسنتی سوئیٹر پر جاوے بھالو کی سرخ ٹائی لگائے پھیلا بنا بیٹھا تھا اور بات بات پر ہنس رہا تھا۔ اچھی سرور دکاہانہ بنا کر ہوٹل میں ہی رہ گیا تھا اور ہمارا خیال اب یقین میں بدل گیا تھا۔ کہ وہ ہوٹل کے پھوٹے ایک لونڈیا سے عشق لڑا رہا ہے۔ پیلے رنگ کی یہ دہلی سی لڑکی جس کے گال پر سرخ خال کا نشان تھا۔ بڑی تیز اور چمکیلی تھی سارا دن اپنے لکڑی کے پرانے چوہارہ کی کھڑکی میں کھڑی ہم سے آنکھیں لڑایا کرتی۔ اچھی اس پرچی جان سے فلا ہو گیا تھا، اور اس نے لونڈیا سے باقاعدہ اشارہ بازی بھی شروع کر دی تھی۔ لونڈیا بھی ایک ہی آفت کی پڑیا تھی۔ کبھی بال کھوکھو جو گنوں ایسا ہر وہ بھر لیتی، اور کھڑکی کے پیٹ سے گئی آہیں بھرا

کرتی۔ کبھی آئینہ سامنے رکھ کر گالوں پر مسرخی تھوپنے لگتی۔ پھر اچی کو دیکھ کر شرم جاتی، اور شوخی سے مسکرا کر پرے ہٹ جاتی اور کبھی دامن اٹھا کر چہرے کو ہوا کرنے لگتی۔ اچی کو اس نے پاگل بنا رکھا تھا۔ وہ رات کو اٹھ اٹھ کر بالکونی میں جاتا اور کھڑکی کی طرف منہ کر کے پیٹے ٹھنڈی آہیں بھرتا، اور پھر اپنی نظر نہ آنے والی محبوبہ کو گالیاں دینی شروع کر دیتا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس عشق کا بھید ہماری منڈلی میں سب پر کھل گیا۔ مگر اچی نے اقرار نہ کیا۔ صوفی نے اسے یہاں تک کہہ دیا۔

”بیٹا عشق میں آہیں کیوں بھرتا ہے۔ اس سے عشق کیا ہے تو کم از کم اپنے کپڑے ہی مفت دھلوا لیا کرو اگر تو حامی بھر لے تو خدا کی قسم آج رات وہ تیرے پہلو میں ہو۔“ لیکن اچی نے سوائے گالیوں کے اور کوئی جواب نہ دیا۔

سیمنز میں ہمیں بیٹھے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا۔ بالکونی کا تیسرا پیالہ چڑھا رہا تھا۔ دراصل آج کاہل جاوے نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ اس نے ہم سبھوں کے دل شیر ہو گئے تھے اور کافی پر خوب ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک کیشہ قامت تیکے نہیں نقش کی لڑکی چست فیض میں ملبوس کانوں میں گولڈن رنگ اور ماتھے پر پوڈل کٹ کے بال ڈائے ہوٹل میں داخل ہوئی اور ایک میز پر اکیلی بیٹھ گئی۔ ہماری منڈلی میں ہر آدمی چپ ہو گیا۔ سب نے اپنی آنکھوں کے کیمرے اس لڑکی کی طرف فٹ کر لئے۔ خواجہ کی پھولی ہوئی ناک پر باریک کمانی کی عینک تھر تھر رہی تھی اور اس نے شادیت کی انگلی کو زور سے چٹایا۔ ماؤ کے ہونٹ لٹک گئے اور آنکھیں اندر کو مکر گئیں۔ جادا بھالو گردن کو جھٹکا دے کر خزیاء کیشہ قامت حسینہ اپنے دھیان میں بیٹھی کافی پی رہی تھی اس کا بسنتی پرس میز پر سامنے رکھا تھا۔ کچی ہوئی بمبوؤں سے نسواری رنگ کی شوخ و روش آنکھیں بڑی گہری خوبیت سے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ماؤ نے ہونٹوں پر بکرے کی طرح زبان پھرتے ہوئے اُسے لقب عطا کر دیا۔

”آڈر سے ہمیں!“

اچانک ماؤ کا رنگ بدل گیا۔ سر کے مختصر بال کھڑے ہو گئے اور اس نے بے

زاری سے جو سانس لیا تو ناک میں سیٹی سی بج اٹھی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس روز والی ہٹی لٹی عورت برجی باردت کی طرح بال بنائے اپنے بادامی رنگ کے ٹھٹھکے کتے کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو رہی ہے۔ ماؤ نے جاوے بھالو کو آہستہ سے کہنی ماری۔

”یہی عورت ہے جاوے۔ اسی نے مجھ غریب کو قتل کیا ہے۔“

موٹی عورت کا ڈنٹر پر کھڑی کیک پیٹری بندھوا رہی تھی۔ ٹھٹھکا بادامی کتا بار بار اس کی ریشمی شوار کو منہ مار رہا تھا۔ اور وہ ہر بار اس کی زنجیر کھینچ کر اُسے پیار سے جھڑک رہی تھی۔

”ڈونٹ بی سٹی پو پی؟“

خواجہ نے چھنگلی چٹختاتے ہوئے کہا۔

”ہمتیں بلا رہی ہے ماؤ۔“

اتنے میں اس نے چھوٹا سا پارسل تمام کر بل ادا کیا۔ اور کتے کی زنجیر سنبھالتی ہوٹل کی سیرٹھیاں اترنے لگی۔ ماؤ کے جسم میں ہیجان سا بپا ہو گیا۔ اُسے اپنے بارے میں پرچونیاں رنگینی محسوس ہوئیں۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک فلک شکاف سرد اہ بھری اور اپنی جگہ سے بے اختیار اٹھتے ہوئے بولا۔

”دوستو! اب تاب انتظار نہیں۔“

اتنا کہہ کر وہ اپنی موٹی پھیل چھیل..... محبوبہ کے پیچھے ہی ہوٹل کی سیرٹھیاں اتر گیا۔ بدیر انتظار کرنے کے بعد جاوے بھالو نے ہوٹل واپس چلنے کا قصد کیا۔ اس کے مشروب اوقت ہو گیا تھا۔ اب کے خواجہ نے اٹھنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے سامنے پوڈل لٹ بالوں والی کیشہ قامت آڈر سے ہمیں بیٹھی کافی کے بعد پرس میں سے ایک کتاب کال کر مطالعے میں محو تھی۔ جادا بھالو بڑا سٹپا یا۔

”تم سب دل پھینک عاشق ہو کمینو! ایک دن تم اپنے ساتھ مجھ شریف کو بھی ٹالنے بچھاؤ گے۔“

اس نے پل ادا کی اور ہم دونوں ہوٹل سورنگنگ والے اپنے کباڑ خانے میں

واپس آگئے۔ یہاں اگر ایک دوسرا عاشقانہ منظر دیکھا۔ اچی پلنگ کی اوٹ میں فرشی بستر پر اپنی دھو بن مجبورہ کے پاس بیٹھا اُسے ماؤ کے سوٹ کیس میں سے نکالے ہوئے بسکٹ کھلا رہا تھا۔

جادو بھالو غصے میں آگیا۔

”میں یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا کہ تم ایک غریب آدمی کی عزت خراب کرو۔ ایک شریف زادی کو خراب کرنا کہاں کی مردانگی ہے؟ میں یہ ناگہم یہاں نہیں چلنے دوں گا۔“

شریف زادی گول گول دیرے کھولے حیرت سے جادے بھالو کی نرالی منطق سن رہی تھی۔ اچی نے غراتے ہوئے کہا۔

”تم کون ہوتے ہو دخل دینے والے؟ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“

بھالو چیخا۔

”بکواس بند کرو۔ ہم میں سے کوئی محبت نہیں کر سکتا، ہم صرف بد معاشی کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاؤں گناہ کی دلدل میں دھنس گئے ہیں۔ نکل جا چڑیل یہاں سے.... اگر پھر قدم رکھا، تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ جوانی کا اتنا ہی زور ہے تو شادی کر لے۔“

اچی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نشتے میں بھول رہا تھا۔ اس نے جلدی سے پلنگ کا سہارا لے لیا۔

”میں اس سے شادی کر رہا ہوں جادوے۔“

”تم دوسرے ہی دن اسے طلاق دے دو گے۔ اس کے ساتھ کوئی دھوبی ہی بیاہ کرے گا۔ جاتی ہے یہاں سے یا دوں ایک گھولنسہ؟“

”لونڈیا چوہیا کی طرح پھدک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ باہر صوفی دروازے سے لگایہ سارا ماجرا سن رہا تھا۔ وہ جلدی سے پرے ہٹ گیا۔ لونڈیا گیبری کے چوڑاتے تختوں پر سنبھل سنبھل کر چلتی جب میز پڑھیاں اترنے لگی تو صوفی نے اسے دبوچ لیا۔“

”میرا حساب تو صاف کرتی جا۔“

اچی کو واقعی اس دھو بن کی لونڈیا سے عشق ہو گیا تھا۔ رات کو وہ زار و قطار روئے لگا۔ لونڈیا کا نام لے لے کر وہ سینہ کو بی کرتا۔ اٹھا اٹھ کر بالکونی کی طرف جاتا، اور رات

باندھیرے میں اپنی مجبورہ کے مکان کی طرف ہاتھ سے بو سے اڑتا۔ میں اور جادوے بل کر بڑی مشکل سے اُسے بستر پر لٹا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اچی زور زور سے خراٹے رہا تھا۔

خواجہ اور ماؤ ابھی تک اپنی مہمت عشق سے پلٹ کر نہیں آئے تھے۔ ہم دونوں بن کرنے لگے۔

”میں جانتا ہوں یہ اس لڑکی کو خراب کرنے پر تلا ہوا ہے محبت وغیرہ سب ٹکوسل ہے۔ اب دیکھو کیا گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ مردانا مکینہ ل ہوتا ہے۔ وہ اپنی چکنی چڑی باتوں سے درغلا کر عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ ہر کنواری لڑکی اپنے خاوند کی امانت ہوتی ہے اس میں خیانت کرنے والے کی گردن قلم کر سکتا ہوں۔“

جادو ابراہنڈی میں پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔ کافی نے بہت جلد ہمارے خون کو گرم کر لیا۔ اُس نے براہنڈی اتار کر سرہانے رکھ لی۔ اس کی آنکھوں کی رنگت گلابی ہو رہی تھی۔

”ابائیں آنکھ کے نیچے کا مسہ مجھے نیلگوں دکھائی دینے لگا تھا۔“

”گدھے کی طرح خراٹے لے رہا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پر بوتل دے ماروں۔“

ب بار مجھے ایک عورت سے محبت ہو گئی۔ سالی نے کوئی ایسا منتر پھونکا کہ میں اس کے پیچھے باؤلا ہو گیا۔ میں نے سب برائیوں سے توبہ تبرا کر لی اور اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کراخامیری گھڑی اور ساری نقدی لے کر فرار ہو گئی۔ اب تو محبت کے اسے رُوح کا نپ جاتی ہے اور میری ایک بات تم بھی یاد رکھنا شریف عورت پر ہی نظر نہ ڈالنا۔ اب میری طرف ہی دیکھو.... عورت کے نام پر میری جان جاتی ہے۔ بن خدا کی قسم شریف عورت سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ اس کے قدموں سے پالتو کتے کی طرح لپٹ جاؤں۔“

ٹھیک آٹھ بجے خواجہ صاحب تشریف لے آئے سردی میں منہ نیلا ہو رہا تھا، دربالوں پر پانی کے قطرے جم رہے تھے۔ معلوم ہوا باہر بوندا باندی ہو رہی ہے۔



آپ گھنٹہ بھر اپنی متوقع محبوبہ آڈر سے ہیبرن کے سامنے ہوٹل میں بیٹھے رہے۔ پھر پیچھے پیچھے اس کے کالج تک گئے۔ دیر تک کالج کے ارد گرد منڈلاتے رہے۔ لڑکی کو بھی شہر ہو گیا تھا، کہ آپ اس پر لٹو ہو گئے ہیں۔ تفریح طبع کیلئے وہ بھی گھر کے راستے میں دو ایک بار مڑ کر انھیں دیکھتی رہی۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد اس نے ایک دفو کھڑکی سے باہر دیکھا۔ خواجہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ محبت ٹھن گئی ہے۔ جلدی سے نقشے کا ایک پھول توڑ کر لڑکی کی طرف اچھال دیا۔ لڑکی نے غصے اور نفرت سے آپ کی طرف دیکھا۔ آپ مسکرا دیئے لڑکی نے پاؤں سے سینڈل نکال کر دکھائی اور ماتھے کے بال جھلک کر کھڑکی بند کر کے چلی گئی۔ لیکن یہاں آکر انہوں نے جو بیان دیا وہ یہ تھا۔

”آپ لوگ چلے آئے تو میں اٹھ کر اس کی میز پر جا بیٹھا۔ میں نے اسے کافی ٹوٹ دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کر لی۔ کافی دیر تک موسم کی اور فلموں کی باتیں ہوتی ہیں پھر ہم وہاں سے اٹھے اور سینڈل پوائنٹ کی جانب سیر کرنے نکل گئے۔ سارا وقت جادو بھالو خواجہ کی باتیں سنتے ہوئے دانتوں سے انگلیوں کے ہاتھ کرتا رہا۔ جب خواجہ نے اپنی دھمکانی ختم کی تو جادوے نے گلاس حلق میں انڈیل کر زوردار ڈکاری اور کباب منہ میں ڈال کر بولا۔

”میں تیری ایک ایک رگ سے واقف ہوں خواجہ! تو جھوٹ بول رہا ہے۔“ ایک گھنٹہ بعد ہمارے یار ماؤ تشریف لائے تو پانی میں نہچرے ٹھہر رہے تھے معلوم ہوا کہ یاہر باقاعدہ پانی برسنے لگا ہے۔ آپ نے جلدی جلدی کیڑے اتارے۔ دھوتی نیاں پہنی۔ کمبل اوڑھا اور میرے پاس پلنگ پر آکر اکڑوں بیٹھ گئے۔ گرم ہو کر اپنی محبت کی داستان سنانی شروع کر دی۔

”دوستو! مجھ سے کوئی سی قسم لے لو۔ اس قتالہ جہاں نے کل رات مجھے کھانے پر اپنے گھر بلایا ہے۔ جادوے! اپنا نیلا سوٹ کل تیار رکھنا مانی خواجہ کی بڑی بیج کرے گی۔ الٹی توبہ! ایسی عورت نہ دیکھی نہ سنی۔ ارے جادوے! وہ تو مجھ پر فدا ہو گئی ہے کہنے لگی۔

”پیارے! تم پہلے کہاں تھے؟“ میں نے کہا۔

”تمہارے قدموں میں۔“

”غضب خدا کا پہلی نظر کا عشق بھی کیا بلا ہوتا ہے۔“

جادوے نے ماؤ کی ٹانگی چند پر دھول جا کر کہا۔

”اس نے اپنے دلیپ کمار کی گنجی کھوپڑی نہیں دیکھی کیا؟“

”تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو؟ میں نے سرفراز سے ڈھانپ رکھا تھا۔

ماؤ نے مشتعل ہو کر دانت بیچنے لگے اور منہ اور ناک سے عجیب و غریب قسم کی نکلنے لگا۔

”گھر و نہیں دوزخ کے دروازے پر ہم تمہارا انتظار کریں گے۔“

آخر ماؤ سچی بات بتانے پر مجبور ہو گیا۔ کہنے لگا۔

”میاں محبت کرنے کے لئے پتھر کا کلیہ چاہئے خواجہ! یہاں سب سنگدل ہیں۔

ہاتھ بڑھاؤ لوگ کتے چھوڑ دیتے ہیں۔ کتوں سے پیار کرو ستم گر تھانے بھجوا دیتے

میں تو جو گیوں کا بھیس بدل کر کاغان کی چوٹیوں پر جا رہا ہوں۔ دوستو! میرے گھر

ہیں..... میرا سر گنجہ ہو گیا ہے میں پہلے سے زیادہ بد صورت ہو گیا ہوں۔ چار

دھابو چکے ہیں۔ پانچواں بھی ہو جائے گا۔ ہر صبح منہ پر پٹھکار پڑی ہوتی ہے۔ دینا

شراب ہی ایک سہارا ہے۔ بیوی کو بچوں سے فرصت نہیں ملتی ہے وہ میری

میرے بچوں کی بیوی ہے، اور میں درد مارا پھرتا ہوں، اور وہ سالی موٹی عورت

..... اس نے اپنا کتا میرے پیچھے چھوڑ دیا۔ خواجہ! بیوی بڑی پیاری شے ہوتی ہے

اور کو صرف بیویوں سے محبت کرنی چاہئے۔ ارے لعنت ہے مجھ پر..... ہزار

ننت! بیوی کے تین خط آئے ہیں۔ ایک کا بھی جواب نہیں لکھا کیا لکھوں؟ سری

پناہ لینے آیا تھا۔ یہاں بھی سکون نہیں مل سکا۔ کہاں جاؤں؟ کدھر کدھر جاؤں.....؟“

ماؤ کو بہت زیادہ چڑھ گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر نیلی جھاگ جم رہی تھی۔

”ہر بدکاری اپنے پیچھے ندامت کی ایک تیز دھار والی کیر چھوڑ جاتی ہے۔ جو انسانی  
 بہت کو دو ٹکڑوں میں کاٹ کر رکھ دیتی ہے، اور زنا سے بڑھ کر دنیا میں کوئی برائی  
 نہیں جس کا خیارہ آدمی کو اتنی جلدی بھگتنا پڑتا ہو۔ ہمیں اس عظیم کام

بنے لگتے ہیں۔ جس طرح جھوٹے کالام بھی جھوٹا ہوتا ہے۔ اسی طرح عادی بدکار کا یہاں بدکاری میں ملوث ہو کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اچھائی کے راستے سے ہٹکا دیتا۔ یہاں انسان کی عقل اور تدبیر سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہاں صرف خدا کی رحمت ام آتی ہے۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں شادی کے لائق ہی نہیں

اب تو میں کسی نیک بی بی کو اپنی بیوی بنا کر اُسے عزت و تکریم کا وہ مرتبہ نہ دے سکا جس کی وہ مستحق ہے۔ جب کبھی میں کسی شادی شدہ جوڑے کو بازار میں گزرتا یا باغ بنے چھوٹے سے بچے کے ساتھ سیر کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ منظر دنیا کے تمام نظروں

اسکی سوچتا ہوں میں بھی شادی شدہ ہوتا تو میرا بھی ایک پیارا سا بچہ ہوتا۔ میں بھی دن

کلام سے تھکا ہارا گھر میں داخل ہوتا کوئی محبت اور عقیدت بھری نگاہوں سے میرا

اگر ناچھر سوچا ہوں شاید مجھے کوئی حق نہیں کہ میں کسی شریف لڑکی سے شادی کر کے  
کی زندگی کو حیرت نپا دوں میں ایک شریف گھرانے کی دہلیز سے لڑھک کر گندی تالی میں

از دل سے گندے بدر میں آگیا ہوں۔ باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں تو اور دھنستا چلا

اول بے بس اور بیخبری کے عالم میں ہوا جا رہا ہوں اب تو نسبت بڑے سمندر کی اس  
 لہر کا انتظار ہے جو ایک ہی تھیلہ بڑے سے مجھے دھو دھلا کر بھیسے تاک کہ دے گی۔"

سگریٹ پیتے ہوئے جاوے کے منہ میں تمباکو آگیا تھا وہ دیوار کی طرف منہ کر

آنکھوں کی پتیاں پھیل گئی تھیں چہرے کی چھائیاں زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔ وہ پتنگ نے اٹھ کر دھوٹی بنیان میں کمرے میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح چکر کھانے لگا، ہم سب نے مل کر اسے بمشکل سنبھالا۔ ہمارے قدم بھی لڑکھڑا رہے تھے۔ اگر خواجہ وہاں نہ ہوتا تو شاید ہم سب نے مل ملا کر اپنا بُرا حال کر لیا ہوتا۔ ماؤ نے دیوار سے لگے آئینے میں اپنی شکم دیکھی تو بیچ مار کر رونے لگا۔

”یہ کسی ریحہ کا چہرہ ہے۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دینا۔“

اجی بے سدھ ہو کر سو رہا تھا۔ شاید خواب میں لوندیا سے عشق لڑا رہا تھا۔ مازنیہ پر لوٹنے لگا۔

”میرے بچے بھی بڑے ہو کر مشروب پیئیں گے۔ میں اُن کے لئے کچھ نہیں کر سکا  
بڑھاپا وقت سے پہلے مجھے آنکھیں دکھانے لگا ہے۔ خواجہ نے بڑی مشکل کے ساتھ ماؤ  
کو اچی کے پاس اس کے بستر پر لٹا دیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ بستر پر سر تارتا رہا اور اپنی بوڑ  
بیچوں کو یاد کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔ بے خبر ہو کر،

اب کمرے میں صرف جاوا، امیں اور خواجہ تھے۔ خواجہ کو چونکہ معلوم ہو گیا تھا کہ رات دیر تک دور چلے گا۔ اس لئے وہ بڑے اطمینان سے کپڑے بدل کر اپنے بستر پر گھس گیا تھا۔ جاوے کا نشہ کچھ کچھ اتر گیا تھا۔

وہ ایک بار پھر موج میں آ رہا تھا۔ احمی اور ماؤ گری نیند سو رہے تھے۔ تھوڑی

دیر بعد حواجہ کے حرائے بھی کوجھٹے لگے۔ جاوے نے بڑی پھرتی سے مسجد الباب سے باہر نکلا اور اُسے دلی سے جیانے لگا۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور بالکوئی کے نیچے پتھر

گلی میں اس کے گرنے کی آواز صاف سائی دے رہی تھی۔ جاوے نے براؤنڈ کی پٹ

آہستہ آہستہ کب جیسا رہا تھا۔ بند کمرے میں بھنے ہوئے گوشت اور تمباکو کی ملی جلی

پھیلی ہوئی تھئی۔ میری آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ میں نے نیا سگریٹ سلگایا۔

جاوے لے اہستہ سے انہیں لھول دیں، وہ انکاروں کی طرح سر ہلے۔

کے تھوکنے لگا۔

دیکھو حرامی گھوڑے بیچکر سو رہے ہیں۔ کیوں یا یہ نیند کی بلا ہے؟ سو جاؤ اور پھر جانے کیا کیا خواب آتے ہیں، اُف!..... سرچکر کھا گیا ہے۔“

ایک دم دروازہ دھڑاک سے کھلا اور گرم بجے کوٹ اور مغل میں ٹھنڈا ہوا چھوٹے سر والا صوفی نمودار ہوا دونوں ہاتھ زور سے رگڑتے ہوئے اس نے غور کیا۔

”اٹاھ! پارٹی پوری ہے۔“

جاوا دانتوں میں پھنسا ہوا گوشت نکالتے ہوئے لال لال آنکھوں سے اُسے گھورتا رہا اور کچھ نہ بولا۔

۵

غریب لڑکی کا عشق اچی کے سر پر بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ وہ ہر رات لوٹتا ہے ٹھپ کر اس کے گھر جایا کرتا وہ رات کے بارہ بجے اپنی کھڑکی میں لیپ جلا کر بجا یہ میدان صاف ہونے کا سگنل تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گھر والے سب سو گئے۔ اب آجاؤ پیارے..... اچی بالکونی میں کھڑا لیپ کی ایک جھلک دیکھنے کے ٹھہر رہا ہوتا۔ وہ کبیل اوڑھ کر جلدی سے باہر نکل جاتا اور پھوڑے کی گلی پھاند کر عوارضے میں پہنچ جاتا۔ یہ ترکیب اسی عشق کی متوالی کے ذہن میں آئی تھی۔ وہ اپنے ناکے عقب میں نگھاس پھولنس سے بھری ہوئی کوٹھڑی میں اپنے محبوب کے انتظار پر براہ ہوتی۔ گھنٹہ بھر وہ وہاں بیٹھی جی بھر کہ باتیں کرتے اور پھر کل کے وعدے پر رہاتے۔ جاوا اسے اور خبردار کرتا۔

”بیٹھے یاد رکھو، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو اس کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔“

ادودھ یاد نہ آئے تو جاوا نام نہیں۔

مگر اچی منہ زور گھوڑے کی طرح عشق کی راہ میں سرپٹ دوڑے جا رہا تھا۔ وہ نم کی باتیں سن کر ہنس کے ٹال دیتا۔ آخر جوانی کی حماقتیں رنگ لے آئیں دھوین کا ایک رات رنگ اٹھا ہوا تھا۔ اس نے روتے ہوئے اچی کو بتایا کہ وہ ماں والی ہے بائے اللہ! اب کیا کروں..... اچی! اچی!..... مجھ سے شادی کر لو۔

سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

نکھیں ملتا اور اُپر اُٹھا۔ اُچی نے اس کے سر پر سامان لاد اور بسوں کے اڈے  
 آگیا۔ پانچ بجے والی بس تیار کھڑی تھی۔ سامان بس کی چھت پر رکھو اگر اس نے پنڈی  
 ایک ٹکٹ کٹوایا سرے کو ایک روپیہ دیا اور پھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر  
 میں راولپنڈی کی طرف فرارے بھرتی اڑی جا رہی تھی۔ اُچی نے آنکھیں بند کر کے  
 سر کھڑکی سے نگار کھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پھول سے بھی زیادہ ہلکا پھلکا محسوس کر  
 رہا تھا۔

ادھر جب دن چڑھا تو سب نے دیکھا کہ اُچی اپنے بستر اور اچھی کیس سمیت  
 نائب ہے۔ سرے نے بتایا کہ صاحب پہلی بس سے پنڈی چلے گئے ہیں۔ ماؤ گنجی  
 ہنڈیا پر ہاتھ پھر کر حیرت سے بولا۔

رات کو تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک سو رہا تھا۔

خواجه نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور سگریٹ بنانے لگا۔

”مگر اُسے بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔“

جادو دروازے کے پاس کھڑا شیو بنارہا تھا۔ منہ میں آیا ہوا جھاگ تھوک کر بولا  
 ”میں جانتا ہوں کیا ہوا ہے۔ کل تک تم لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ ابھی  
 سے اپنا ٹھکانہ کرلو۔ ہوٹل پر مصیبت آنے والی ہے۔“

گول مٹول کمزور دل ماؤ کا تو رنگ اڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی دکھی بیوی اور  
 بچوں کی شکلیں گھوم گئیں۔ خواجه کی پھولی ہوئی ناک پر باریک کمائی والی عینک تھرتھرا  
 اٹھی۔ اُنھے بھی اپنا فکر دامن گیر ہوا۔ ماؤ نے فکر منہ چہرہ اٹھا کر کہا۔  
 ”آخر کچھ نہیں بھی تو بتاؤ۔“

چنانچہ ایک دن بعد سارا بھید کھل گیا۔ صوفی دوڑا دوڑا پریشانی کے عالم میں  
 ہمارے کباڑ خانے میں آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

”نیچے سپاہی آیا ہے۔ یہ کہنے اُچی نے کیا گل کھلادیا۔ وہ مجھ سے اُچی کا آپتا  
 پوچھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ محلے کا چوہدری بھی ہے۔“

شادی کا نام سن کر اُچی کا خلق خشک ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ گدھوں پر گھنڈے  
 مندے کپڑوں کے گھنٹے لادے دھوبی گھاٹ کو جا رہا ہے، اور ایک مکروہ صورت  
 پلا اس کے ساتھ ریں ریں کرتا چل رہا ہے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔  
 ”تم چپ کیوں ہو گئے اُچی؟ اگر تم نے شادی نہ کی تو میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں  
 گی۔ میں تباہ ہو جاؤں گی۔“

اُچی کے پاؤں تلے سے تو زمین نکل گئی۔ پہلی آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا۔ عشق  
 کا بھوت بھاپ بن کر اڑ گیا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ صبح منہ اندھیرے  
 ہی وہ بوریا بستر باندھ کوہ سری سے بھاگ جائے گا۔ اُچی نے گردن اڑا کر اپنی دھوبی  
 مشوقہ کو تسلی دی۔

”گھبراؤ نہیں، تمہارا ہاتھ پکڑا ہے تو چھوڑ دوں گا نہیں۔ میں کل ہی تم سے شادی کر  
 لوں گا۔ لیکن یہ شادی کہاں ہوگی، کیسے ہوگی؟“

بد نصیب دھوبی کا چہرہ ایک دم چمک اٹھا۔

”تم فکر نہ کرو۔ ہم یہاں سے بھاگ کر ڈونگا لگی اپنی خالہ کے پاس چلے جائیں گے  
 وہ میری راز دار ہے۔ ہم وہاں شادی رچالیں گے۔ باقی گھر کا معاملہ خالہ خود سنبھال لے  
 گی۔ کل رات کو تم تیار رہنا۔ میں تمہارا انتظار کھدوں گی۔“

اُچی نے بڑے زور شور اور پورے اعتماد سے کل ڈونگا لگی جا کر شادی کر لینے کا وعدہ  
 کیا اور لاکھڑا تے ہوئے قدموں سے وہاں سے واپس چل پڑا۔ ہوٹل میں آکر وہ بے  
 جان پتھر کی طرح اپنے ٹھنڈے بستر پر گر پڑا۔ اس نے گھڑی دکھی اس وقت رات کے  
 پورے دو بج رہے تھے، اور راولپنڈی کو پہلی بس پانچ بجے چھوٹتی تھی۔ کمرے میں  
 سارے گہری نیند میں سو رہے تھے۔ اُچی نے باقی رات بستر پر لیٹے لیٹے سگریٹ  
 پھونکتے گزار دی۔ جب بالکونی کے باہر کھڑکی کے شیشوں میں صبح کی نیلی جھلکیاں  
 نمودار ہوئیں تو وہ آہستہ سے اٹھا۔ بستر بخل میں دبا کر اچھی کیس ہاتھ میں لیا اور سب  
 کو سوتا چھوڑ کر چیکے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بیڑھیاں اترتے اُسے بے ہوش

”ہو سکتا ہے آپ کو ایک بار تھانے آنا پڑے۔“  
 تھانے کا نام سن کر صوفی کے پران خشک ہو گئے۔ لیکن اس وقت تو اس نے  
 سپاہی کے چلے جانے پر کلمہ شکر ادا کیا۔ اسی رات صوفی نے انٹورنس کمپنی کے ایجنٹ  
 کی چائے پی کر اجمی کو وہ مغلطات سنائیں کہ اگر وہ موجود ہوتا تو صوفی کا کچھ ضرر کال دیتا۔  
 اندر سے وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا۔ اُسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ اب تھانے سے بلاوا  
 آیا کہ آیا۔ اتفاق سے سی آئی ڈی کا ایک کارندہ ساتھ والے ہوٹل میں چائے پینے آ  
 نکلا۔ صوفی کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب اس کے ہوٹل کی خیر  
 نہیں۔ وہ بھاگ بھاگ یہ رپورٹ پہنچانے ہمارے کباڑ خانے میں آ گیا۔ ماؤ جو پہلے  
 ہی ڈرا ہوا تھا سی آئی ڈی کا نام سن کر چکر میں آ گیا۔ اُسے اپنی ریلوے کی نوکری ہاتھ سے  
 چھوٹی نظر آئی۔ وہ تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسی لمحے اعلان کر دیا کہ کل صبح پہلی بس پر  
 وہ بھی لاہور کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ خواجہ انگلیاں جٹھاتے ہوئے بولا۔  
 ”تم لاہور جا رہے ہو۔ جاوا تھیا گل چلا جائے گا۔ پھر میں یہاں رہ کر کیا کروں گا؟“  
 صوفی سر پیٹ کر رہ گیا۔  
 ”میری جان کے دشمن ایک ایک کر کے سب کھسک رہے ہیں۔ اچھا دوستو  
 چلے جاؤ۔ میرے سر پر جو آن پڑی ہے وہ اکیلا ہی بھگتوں گا۔  
 جاوا بھالو صوفی کو دھکا دے کر بولا۔

”مرے کیوں جاتے ہو۔ میں ابھی یہیں ہوں۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن سری سے راولپنڈی کی جانب جو پہلی بس اڑی  
 ہمارے تھی اس میں خواجہ دیگر اور ہمارا گول مٹول یا رماؤ دونوں بیٹھے تھے خواجہ حسب  
 عادت انگلیاں جٹج رہا تھا اور ماؤ سکڑی ہوئی آنکھوں کی درزوں میں سے باہر وادی  
 کے چہرے کے درختوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ اب اس کمرے میں صرف میں اور جاوا رہ گئے۔  
 خواجہ اور ماؤ کے چلے جانے کے ایک ہفتہ بعد تک دھوہن کا قہقہہ اپنے آپ  
 ہی ختم ہو گیا۔ صرف ایک دفعہ صوفی کو تھانے بلوایا گیا۔ وہاں جا کر صوفی نے اپنا پہلے

جاوے نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کی راکھ جھاڑ دی۔ ماؤ ایک دم زرد  
 ہو گیا۔ خواجہ کی پھولی ہوئی ناک سکڑ گئی۔ ماؤ کھڑا بالوں میں گنگھی کر رہا تھا۔ وہ کنگھی  
 پھوڑ کر بیدم سا ہو کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔  
 ”اب یک ہو گا؟“

صوفی بولا۔

”یہی تو میں پوچھنے آیا ہوں۔“

خواجہ نے کہا۔

”اُسے کہہ دو اجمی نام کا کوئی آدمی یہاں نہیں ہے ایک مسافر آیا تھا۔ وہ جا چکا ہے  
 اس کا پتہ غلط غلط لکھوا دو۔“

صوفی نے پانی کا گھونٹ پیا اور گھبراہٹ میں بولا۔

”مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ پولیس کا معاملہ ہے کہیں تھانے لے جا کر ٹھکانے نہ کریں۔“  
 جاوا بھالو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ صوفی نے اُسے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔  
 ”میری جان پر مبنی ہے اور تو ہنس رہا ہے۔ سالونہ تم یہاں آتے نہ مجھے یہ مصیبت  
 پڑتی۔ وہ کمینہ جاتے جاتے کمرے کا کڑیہ بھی مضطرب کر گیا۔ یا اللہ! اب کیا کروں؟“  
 جاوا بولا۔

”پیارے خواجہ نے جو نہیں کہا ہے وہی کرو۔ رام بھلی کرے گا۔“

ہم سمجھوں نے کہ سن کر جاوے کو براصنی کیا کہ وہ صوفی کے ساتھ نیچے جا کر پولیس  
 والے کو سمجھا دیا کہ حضرت کرے اور اس بن بلائی بلا کو ہمارے سر سے ملے جاوے  
 نے نیچے جا کر سپاہی کو بتایا کہ ہمارے کمرے میں اجمی نام کا کبھی کوئی آدمی آکر نہیں ٹھہرا۔  
 صوفی نے بیان درج کر دیا کہ اس نام کا مسافر ہوٹل میں آکر ٹھہر ضرور تھا۔ لیکن وہ اپنا  
 اپنا بتاتے بغیر حساب چکار یہ سوں یہاں سے جا چکا ہے۔  
 سپاہی نے بیان لکھ لیا۔ چائے کے دو پیالے پی کر پورا ایک ہڑپ کر گیا  
 جاتے ہوئے اتنا کہہ گیا۔

”پنڈی سے آخری بس تو کبھی کی آچکی ہے۔ کیوں۔ بات کیا ہے؟“  
جاوے نے پوچھا۔ وہ آدمی آہنی جنگلے کا سہارا لے کر بولا۔

”جناب میری بیوی راولپنڈی سے آخری بس میں آ رہی تھی۔“  
میں نے پوچھا۔

”تم اس وقت اڑے پر نہیں آئے؟“

”مجھے صدمہ دیا چانے ابھی ابھی بتایا ہے۔ کہنے لگا۔ بیٹے میرا حافظہ کمزور ہے، میں  
تینیں شام کو بتانا بھول گیا تھا۔ اب کیا کروں جناب؟ اگر وہ آگئی ہو تو بے چاری کہاں ہوگی۔“  
”تم کہاں کام کرتے ہو؟“

”جی میں ٹی کمپنی میں چیپڑا سی ہوں اور لوگر بازار والے دفتر میں رہتا ہوں میری بیوی  
کارنگ سائزلا ہے، اور رہنے گال پرائمکھ کے نیچے زخم کا نشان ہے۔“  
جاوے نے کہا۔

”بھائی اب کیا ہو سکتا ہے تم جا کر آرام کرو۔ اب تو صبح کو ہی معلوم ہو سکے گا۔ یہ  
بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیوی پہنچی ہی نہ ہو۔“  
”نہیں جناب..... میرا دل کہ رہا ہے کہ وہ ضرور آئی ہے۔ تمہاری شادی ہوئے ابھی۔  
تین ماہ ہی تو گزرے ہیں جناب.....“

ہم اس پریشان انسان کو یونہی بے معنی دم دلا سا دیکر اپنے ہوٹل میں آگئے۔ مجھے  
بروں محسوس ہوا جیسے مری کا سارا شہر ایک کبل پوش بے چین انسان کے روپ میں  
دیوالوں کی طرح بس کے اڈوں پر اپنی نئی یا ہتائی بیوی کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ مگر  
میں داخل ہوتے ہی جاوے نے حسب عادت ہاتھ اٹھا کر سگریٹ جلایا اور باہر  
بالکونی میں مفلا اوڑھ کر ٹہلنے لگا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور صوفی نے چوروں کی طرح اندر داخل ہو کر دروازہ پھر  
سے بند کر دیا۔ جاوے نے گردن کھلاتے ہوئے پوچھا۔  
”کیوں اوئے..... کیا پھر کوئی آفت آن پڑی ہے؟“

والا بیان دہرا دیا۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور ہوٹل سلورنگنگ پھر اپنی پرانی ڈگر پر چل نکلا  
پندرہ بیس دن اور گزر گئے۔ صوفی سب کچھ بھول بھلا کر ایک بار پھر اپنی ریشہ دوانیوں  
میں مصروف ہو گیا۔

سری کا موسم کافی سرد ہو گیا تھا۔ بارشیں ختم ہو چکی تھیں۔ دن بھر ٹھنڈی بچ خزاں  
آلود ہوا ایسے چلا کرتی۔ ہمارا کام اب صرف تاش کھینا، ایمنز ہوٹل یا لفٹ میں بیٹھ کر  
سڑک کا نظارہ کرنا اور رات کو نیم اجازت سڑکوں پر سڑک گشت کرنا ہی رہ گیا تھا۔ دوسرے  
تیسرے کمرے میں جاوے کی محفل نشاط بھی لگ جاتی۔ رات گئے تک شعر و نغمے  
کا دور چلتا جس میں انشورنس کمپنی کا ایجنٹ اور صوفی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ جاوے  
بھالو کی حالت اب انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دلدل سے نکلنے کی  
کوشش میں اس میں اور دھنستا جا رہا ہے۔ کبھی وہ بچوں کی طرح رونے لگ جاتا۔ اس  
وقت میں حیران ہوتا کہ اس ہاتھی ایسے ڈیل ڈول والے آدمی میں اتنی نازک اور لطیف  
شے کی سمائی کیسے ہو گئی۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ اچانک بارش ہو کر بادل چھٹ گئے اور سرد ہوا میں  
دانت بچنے لگے۔ اس روز جاوے کا محفل نشاط کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہم سیر کرتے  
ہوئے نیچے سنی بنک کی طرف نکل گئے۔ کافی دور تک سیر کرنے کے بعد جب ہم اوپر  
آئے تو ہمارے جسم گرم ہو چکے تھے، اور ماتھوں پر پسینہ آ گیا تھا، رات کے دس بج  
چکے تھے اور سڑکیں تقریباً ویران ہو گئی تھیں۔ بسوں کے اڈے پر خالی بسیں چپ  
چاپ کھڑی سردی میں ٹھہر رہی تھیں۔ بکنگ کے پاس دو ایک مزدور آگ جلا کر بیٹھے  
چائے پی رہے تھے۔ ہم لوہے کے جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سڑک کا موڑ  
گھومنے لگے، تو ہمیں ایک آدمی نے روک لیا۔

”کیوں جناب پنڈی سے آخری بس کب آتی ہے؟“

طرطی کے خاکی کبل میں پیٹے ہوئے دبیلتے پتلے آدمی کی آنکھیں اندھیرے میں جھپٹتے  
ہوئے دیپے کی طرح ٹٹمار رہی تھیں۔ اس کی آواز میں تجسس اور ناامیدی کی جھلک تھی۔

صوفی آنکھ مار کر مکارانہ ہنسی ہنسا۔

”آفت نہیں..... آفت کی پُرکالہ ہے۔“

”کماں ہے؟“

صوفی نے ہمیں اشارے سے ہلا کر کہا۔

”سائبر کمرے میں بے ریمیرے پیچھے پیچھے چپکے سے چلے آؤ۔“

سات نمبر کمرے میں ٹوٹی ہوئی میز پر صرف ایک موم جلی رہی تھی جس کی دھیمی

دھیمی پراسرار روشنی میں ایک عورت گھڑی بنی پلنگ پر ایک طرف سٹی بیٹھی تھی۔

جاوے نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ فرش پر کھڑے کھڑے بھول

رہا تھا جیسے کوئی بحری جہاز کا کپتان ڈولتے ہوئے جہاز کے عرشے پر کھڑا ہو کر

میں ہولے ہولے سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ عورت رو رہی ہے۔

عورت کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے

لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب اس کے جو بچی بندھی تو تھننے کا نام ہی نہ

لیتی تھی۔ جاوے نے جھنجھلا کر صوفی سے پوچھا۔

”یہ چڑیل کماں سے اٹھالائے ہو تم؟“

کتنی تھی میں اپنے خاوند سے ملنے آئی ہوں۔ میں نے کہا ہم بھی تو تیرے خاوند

ہی ہیں۔“

جاوے کو جیسے بجلی کا ہلکا سا جھٹکا لگا۔

”خاوند سے ملنے آئی ہے۔ کون سی بس سے اتری تھی؟“

”آخری بس کا کہہ رہی تھی۔ مگر ہم ان اڑن گھائیوں میں آنے والے ہیں بھلا؟“

جاوے کو جیسے ایک جھٹکا اور لگا۔ اس نے عورت سے پوچھا۔

”وتم پڑی سے آئی ہو؟“

”جی۔“ عورت کی آواز بچکیوں میں دبی ہوئی تھی۔

”تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”تین مہینے!“

”تمہارا خاوند چائے کمپنی کے دفتر میں چپڑا سی ہے۔“

”جی۔“ اور عورت بے اختیار رونے لگی۔

جادو ایک دم اچھل کر پلنگ سے پرے ہٹ گیا۔ اس نے تیزی سے موم جلی اٹھا

اور عورت کے منہ کے آگے کر دی۔ داہنے گال پر آنکھ کے نیچے زخم کا نشان آنسوؤں میں

بھیک رہا تھا۔ جاوے کے ہاتھ سے موم جلی زمین پر گر پڑی۔ صوفی چیخا۔

”یہ کیا کر دیا۔ تم ہوٹل میں آگ لگا دو گے۔“

صوفی نے جلدی سے جلی جلا دی۔ روشنی میں جادو بھاو چیتے ایسی غضبناکی کے

ساتھ صوفی پر چھٹا۔ اس نے پاگلوں کی طرح صوفی کو لاتوں اور گھونسوں سے کوننا تڑو

ل دیا۔ صوفی تو ششدر رہ گیا۔ اس کی آواز بھی نہ نکل سکی۔ بس میدے کی بوری کی طرح

پیٹ پکڑ کر فرش پر گر پڑا، اور پھر نہ اٹھ سکا۔ جاوے نے آگے بڑھ کر فرش پر گرے ہوا دوپٹ

اٹھایا۔ دوسری طرف منہ کر کے اپنے ہاتھ سے اس بدنصیب عورت کے سر پر ڈالتے

اوسے رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

”برقع پہن کر میرے ساتھ آؤ بہن۔ میں تجھے تیرے خاوند کے پاس پہنچا دیتا ہوں۔“

عورت کئی کئی بار گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ایک دم کا بائسٹ سی

لیے ہو گئی۔ اس بد قماش کے اندر سے نیک دل بھائی کماں سے نکل آیا؟ اس نے جلدی

سے اپنا سفید سیدھا برقع اوڑھا اور ہمارے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ رات کے

آخر میرے ہم نے لوئر مال کی اونچی بنجی اترائی سنبھل سنبھل کر طے کی جادو اسارا راستہ کچھ

دبلا۔ ہونٹ بیچھے، ہاتھ خاک برانڈی کی جیبوں میں ٹھنڈے بالکل چپ چاپ چلتا

ہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ٹی کمپنی کی بیگی ٹیڑھی غارت کے نیچے کھڑے دنگ دے رہے

تھے۔ سا بک نما دفتر کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ صرف ایک کھڑکی میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی

تھی۔ غم نصیب غریب خاوند دیا جلائے اپنی نوپا ہوتا بیوی کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کسی نے

بڑی بے تابی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی گمبیل پوشش دلا آدمی کھڑا تھا۔ اس کی

بیوی بھاگ کر اس سے جا لپیٹی، اور اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ خاوند کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ جاوے نے صرف اتنا کہا، اور اس کی اپنی آواز زندہ ہوئی تھی۔  
 ”میں تمہاری بیوی کو نہیں اپنی بہن کو اس کے گھر چھوڑے جا رہا ہوں۔“  
 جاوا جلدی سے مجھے ساتھ لے کر لوئر بازار کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ ٹی کمپنی کا چیر اسی

ہوٹل میں واپس آکر جاوے نے کہا۔

”اب میں یہاں نہیں رہ سکتا میں کل صبح ہی نٹھیا گلی چلا جاؤنگار۔“

اس کے بعد وہ پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔

”جی بھلا کر تم بھی سو جاؤ۔“

میں نے جی کل کر دی اور بستر میں گھس کر لحاف اوپر کر لیا۔ اندھیرے میں مجھے دیر تک کچھ اس قسم کی آواز سنائی دیتی تھی جیسے جاوا اسکیاں بھر رہا ہو۔  
 کیا وہ روبرہ تھا؟

جہاں برف گرتی ہے



وقت انجینئر چندن کوٹ کے ریسٹ ہاؤس میں پہنچا دھوپ کا رنگ  
 ہو رہا تھا۔ نیچے گہری گھائی میں کاڈ اور چیرھ کے مرطوب سائے لمبے ہو  
 ۷ اور اُس طرف سے آنے والی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں کوہستانی  
 ٹھنڈک اور چیرھ کی خنک خوشبو تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے باہر پوکلیٹس کے  
 درخت تلے محکمہ جنگلات کا ایک چھوٹا افسر، دوسرے ڈیر، ایک منشی اور  
 رہنم مارک گھنی موچنوں والا کلاہ پوش ٹھیکیدار انجینئر صاحب کے  
 ل کے لئے چشم براہ تھے۔ ٹھیکیدار کے ایک ہاتھ میں نرگس کے زرد پھول  
 تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ شلوار کا نیفہ درست کر رہے تھے۔ چلی کر  
 گردن والا منشی ناک کی ہڈی پر کھسکتی ہوئی عینک کو بار بار اُوپر کر  
 اور گردن کو طوطے کی طرح گھا پھرا رہا تھا۔ سگار کو داہنے ہاتھ کی  
 ایلی گروڈش دیتے ہوئے گنجنے سروائے محکمہ جنگلات کے افسر کے  
 لون سردیر ڈھیلے ڈھالے نیم گرم کپڑوں میں یوں چاق و چوبند کھڑے  
 ان کی تصویر آتازی جا رہی ہو۔ لمبے قد اور ڈبلے جسم والا ادھیڑ عمر کا  
 بی جھوٹی سی نسواری رنگ کی موٹر سے پائپ پیتا باہر نکلا اور خیر مقدم  
 الوں کی بیسیاں ایک دم کھل گئیں اور ٹھیکیدار نے بڑھ کر موٹی گردن  
 در نرگس کے پھول پیش کئے۔

”مور پر نور کے مزاج کیسے ہیں؟“

”یہ ہے حضور کا سفر آرام سے کٹا ہوگا؟“

جب رات گہری ہو گئی  
 میں تمہاری تلاش میں نکلا  
 جنگل کے درختوں سے شبنم گر رہی تھی  
 سنان وادی میں چاند طلوع ہوا  
 چاند مجھے تیرے گھر تک لے گیا  
 تیرے گھر کا دروازہ کھلا تھا  
 مگر تو وہاں نہیں تھی  
 اداس خوشبو کا جھونکا مجھے چوم کر گزر گیا  
 کیا یہ تم تھیں؟

(پشکن کا ایک غیر معروف گیت)

”حضور غسل کے لئے پانی گرم ہے۔ یہ پانی دھنڑا رٹ کی بلندی سے موضع دھرن کوٹ کے پڑانے چشے سے منگوا یا ہے۔ فدوی جب کبھی موضع دھرن کوٹ گیا ہے چشے پر غسل کرنا نہیں بھولا۔۔۔۔۔“

ٹھٹھکے قد کے گول مٹول ٹھیکیدار نے چھٹی مرتبہ کوٹ کی جیسوں میں ہاتھ ڈالے اور پھر باہر نکال لئے۔

”حضور والا اگر کبھی دھرن کوٹ تشریف لائیں تو آپ کو جنگلی مرغیوں کا شکار کھلایا جائے۔ موضع دھرن کوٹ کی جنگلی مرغیاں۔۔۔۔۔ یہ کوٹ فدوی کو پکڑا دیں۔۔۔۔۔ کافی بوجھل ہوگا؟“

انجینئر نے محکمہ جنگلات کے گنجے افسر کی جانب پائپ کا دھواں پھوڑتے ہوئے مڑا کر ٹھیکیدار سے کہا۔

”ضرور آئیں گے۔“

ٹھیکیدار سر سے لے کر پاؤں تک جھوم گیا اور اس کے گندی چہرے کی چمک کے آگے اس کے براؤں جو توں کی چمک ماند پڑ گئی۔ محکمہ جنگلات کے گنجے افسر نے تھو تھنی سیکڑ کر پائپ کا دھواں سونگھا اور ہلک کر کہا۔

”غالباً حضور ایرن مور کا شوق فرماتے ہیں؟“

اس قسم کی احمقانہ مگر نہایت اہم گفتگو کے بعد انجینئر محکمہ جنگلات کے چھوٹے افسر کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوا تو ٹھیکیدار نے قمیص کا دامن اٹ کر واسکٹ کی جیب میں سے تمبینی کی ڈبیا نکال کر سگریٹ سلگایا اور ریسٹ ہاؤس کے عقب میں جا کر اپنے خاص باورچی کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔

”بٹیروں کی یخنی میں زعفران ڈالنا مت بھولیو اور مرغوں میں مٹر بھرتے وقت چچا سبحانی کو پاس رکھنا۔ وہ بس آ رہا ہوگا۔ میں اُسے آتی مرتبہ پھر کہہ آیا تھا۔ اور وہاں وہ ابھی تک حرام زادہ صمد کیوں نہیں آیا؟ اب انار دانہ اُس کی ماں گھوٹے گی؟۔۔۔۔۔“

پشتمہ واقع دھرن کوٹ کے نیم گرم پانی سے ہاتھ منہ دھونے کے بعد بڑے گرم گرم تلخ کافی کا ایک پیالہ پیا اور سیاہ پائپ سلگا کر دونوں برادر گنجے افسر کی معیت میں اس مقام کی طرف چل پڑا۔ جہاں بیچ میں نامعلوم قبر کے آ جانے سے زیر تعمیر نئی سڑک کو سات میل کا چکر پڑ رہا۔ یہ نئی سڑک سانبر ہیڈ کے آخری موڑ سے شروع ہوتی تھی اور اُسے سوا ہزار فٹ اوپر رشی کنڈ کی چیمڑھ اور صنوبر سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں تک پہنچا۔ جہاں محکمہ صحت نے ملک کا سب سے بڑا مینی ٹوریم بنانے کا فیصلہ کیا۔ آسمان کی بلندیوں سے اُترنے والے بھورے بھورے لطیف بادلوں بھر مٹ رشی کنڈ کے صنوبروں سے گلے مل کر نیچے اُترتے اور اپنے ساتھ تین ہزار فیٹ کی اونچائی پر اُگنے والے چناروں کی خوشگوار مہنک لاتے تھے۔ سانبر ہیڈ سے ایک پتلی سی کچی پگڈنڈی گہری گھاٹیوں اور نا کھنڈوں کے ساتھ ساتھ ہو کر اوپر کو جاتی تھی۔ اونچے لمبے چیمڑھ کے ذن اور سایہ دار گھنے چناروں کے بیچوں بیچ جانے والی اس نازک پگڈنڈی دونوں جانب جنگلی بوٹیوں کی بھرا تھی۔ جن کی جڑوں میں رہنے والے زہریلے پ اکثر راہ چلتے مسافروں کی ہلاکت کا باعث ہوتے تھے۔ رشی کنڈ کی ب ڈھلوانوں پر اُگے ہوئے گنجان جنگل دُور سے گہرے سبز بادلوں کے ے معلوم ہوتے تھے۔ ان تاریک جنگلوں سے گذر کر اوپر جنگلی ناشپاتیوں ل اور آڈوڈوں کے خود رو باغات کا طویل سلسلہ تھا۔ جس کے وسط غاف نیلے پانی کی ایک جھیل تھی۔ بہار میں جب مشرقی پہاڑیوں پر نموج نا پھل کر بہہ نکلتا تو ندریں تخت پر بیٹھے ہوئے بادلوں کے شہزادے اُس دن جھیل کے نیلے آئینے میں اپنے دکتے ہوئے چہرے کا روپ دیکھا۔

نئے تھے اور رات کو اس کے دامن میں ستاروں کے فالوس جگمگایا کرتے۔ ب خنزاں کے سرولس سے پھول پتوں کا رنگ اُڑ جاتا اور چنار

”تو پھر آگئی..... مرن جوگی..... ذرا ٹھہر تو.....“

رشی کنڈ کی چوٹیوں پر رہنے والے زندگی کا لطف حاصل کرنے میں رشیوں بھی آگے ہیں۔ وہاں گھاس ہے، بھیریں ہیں، جھیل کا پانی ہے نیلا آسمان اور کچی لسی ہے اور چھپاندا ملا مکھن ہے، اور کالی کالی آنکھوں والی گنوار۔ انہیں ہیں۔ رشی کنڈ کتنی اچھی جگہ ہے!

اور اب تو وہاں ایک سینی ٹوریم بھی بنایا جا رہا ہے۔ اب یہ جگہ اور بھی اچھی اُجے گی۔ سینی ٹوریم کے بعد وہاں ایک ہوٹل بن جائے گا اور پھر ایک سینما ہارمن برانڈا کی کوئی تازہ تصویر..... ہائے! کارمین کو ناچتے ہوئے کو لھے مٹکا تنی مہارت حاصل ہے اور جب وہ ناچتی ہے تو اس کے کولہوں کی چھلیاں بے آب کی طرح کیوں ترپتی ہیں؟ یورپ کے دریاؤں میں اتنی ساری ہاں کہاں سے آگئی ہیں؟

دل! بول کہ لب آزا ہیں تیرے ارے رشی کنڈ کی مسکین مچھلی!

لیکن تو بے زبان ہے اور بے زبان مچھلی بھوک مچھلی کی نسبت زیادہ تیزی لسی کی ڈور کی طرف دوڑتی ہے اور شہر سے اُوپر آنے والی لاریوں میں نیروں کی ٹولیاں بھی آئیں گی اور اُن کی زبانیں اُن کی بنسیوں کی ڈوریوں بھی زیادہ لمبی ہوں گی۔ اور اُن کی باتیں پکی ہوئی غویانیوں کے سنہری شیرے زیادہ میٹھی اور چندن کوٹ سے رشی کنڈ جلنے والی سڑک سے زیادہ ہوں گی۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ..... اسے پُر سکون نیلی جھیل میں تیرنے دلیو! یہاں سے کوچ کر جاؤ..... اوپر..... اور اوپر..... ہمالیہ کی آترائیوں نچن چنگا کی برفوں کی طرف، ایورسٹ کی چوٹیوں کی جانب! کسی جگہ، کسی کسی سمت..... لیکن جاؤ ضرور..... ڈوریاں بٹ رہی ہیں، کانٹوں کے ایکٹ چپکائے جا رہے ہیں، سڑک بن رہی ہے.....

لیکن سڑک ابھی سانبر ہیڈ سے بمشکل دو فرلانگ ہی اُوپر گئی ہوگی کہ بمبائش

کے گہرے سُرخ پتے اپنی ٹہنیوں سے ٹوٹ کر گرتے تو جھیل کی پُر سکون سطح لپکتی لگتی اور بہت جلد اس پر خزاں نصیب نرود زرد، سُرخ سُرخ پتوں کی شطرنج سی بچھ جاتی اور پھر بچ بستر پر فلی ہواؤں کے جھکڑ صنوبر کے جنگلوں میں سے پیختے ہوئے اُٹھتے اور آسمان ہلکے سرخی مٹیل بادلوں کا غلیظ لحاف اوڑھ لیتا۔ اور برف مند مند بے جان درختوں پر کا فور چھڑکنے لگتی۔ پھر رشی کنڈ کی جھیل سرمائی کھن اور کھر لمبی چپ سادھ لیتی اور اس پر جھکے ہوئے برف پوش درختوں کے کتبے آنے والی بہار کے انتظار میں ڈوب جاتے۔ پھر جب نکھرتے آسمان پر بہار کا سورج طلوع ہوتا تو درختوں کی مردہ رگوں میں زندگی کا سبز فون اُبلنے لگتا اور آلوچوں کی ٹہنیوں پر جمی ہوئی برف ترخنے لگتی اور نود میدہ غنچے اپنی ابریشمی پلکیں جھپکاتے خزاں کی لمبی نیند سے بیدار ہونا شروع ہو جاتے۔ رشی کنڈ کے سادہ لوح چرواہے بنسریوں پر زندگی، حسن، اور شادمانی کے نغمے الاپتے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آتے۔ اور سیاہ آنکھوں والی چرواہے چناروں کی بیٹیاں، اپنے جڑوں میں سب کے گھٹے لٹکائے ریلوڑوں کو ہنگام سرسبز چراگاہوں میں اُتر جاتیں اور اُن کے دامن صندل کے جنگلوں سے آنے والی ہوا میں اُڑنے لگتے اور اُن کے ہونٹوں میں بہار کا شہد لبس جاتا اور اُن کے ننگے پاؤں رقص کے دائروں میں اُچھتے لگتے اور ہری ہری دوب پر بھیڑ بکریاں ہرنیوں کی مانند فلاںچیں بھرنے لگتیں، اور اخروٹ کے کسی نادر درخت تلے دو محبت کرنے والے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور مخمور آنکھوں والی کوئی چرواہن جھک کر کہتی۔

وہ کچھ نہ کہہ سکتی اور حیا سے اس کا چہرہ سُرخ پھول کی طرح دیکھنے لگتا اور اس کا سر اور زیادہ جھک جاتا اور ہونٹ پکپکانے لگتے اور پاس ہی کوئی بھڑا نہیں دیکھ کر شرارت سے میاتی اور چرواہن پک کر اس کی طرف بھاگتی۔

کرنے والوں کو کام روک دینا پڑا۔ کیونکہ جس موٹر پر سے نئی سڑک کو آگے گزرنا تھا اس کے عین بیچ میں اخروٹ کے تناور درخت کی چھاؤں میں ایک قبر بنی ہوئی تھی۔ یہ قبر تراشیدہ نیلگوں پتھروں کی ایک اونچی سی ڈھیری تھی جس کے سرمانے کی جانب دھواں کھائے پتھر لیے طاق میں مٹی کا پُرانا دیا پڑا تھا قبر پر جا بجا نرم نرم گھاس کے ہریارے خوشے اُگ آئے تھے اور کہیں کہیں خود میلے نیلے پھول کھل رہے تھے۔ پیمائش کرنے والوں نے سامان ایک طرف کر دیا اور خود قبر کے پاس آکر اُسے ہاتھ لگا لگا کر یوں چھونے لگے جیسے اس میں ٹائم بم دفن ہو۔ ٹھیکیدار نے کلاہ کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنی کھوپڑی کھجالی اور جھک کر طاق میں رکھے ہوئے میل خوردہ دیئے کو غور سے دیکھنے لگا۔

”ہونہ ہو یہ کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا مزار ہے..... ارے اس دیئے میں تیل بھی ہے!“

ٹھیکیدار نے تیل میں اُلگی ڈبو کر اُسے اپنی خوفناک مونچھوں پر رگڑا اور ”سبحان اللہ“ کا ورد کرتے ہوئے پیمائش کرنے والوں سمیت ریسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑا۔ دوسرے ہی روز محکمہ جنگلات کی وساطت سے نشیبی شہر کے چیف انجنیئر اپنی نسواری رنگ کی کار میں سوار ہو کر چندن کوٹ پہنچ گیا۔ نائب انجنیئر کی عمر چالیس پتالیس کے قریب ہو گئی۔ لیکن قریب سے دیکھنے پر وہ زیادہ مقرر دکھائی دیتا تھا۔ کنپٹیوں پر سر کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ اور جھریوں کی جہین لکیریں رخساروں کی ہڈیوں سے ہونٹوں کے کناروں تک چلی گئی تھیں۔ پائپ کے مسلسل دباؤ سے نچلے ہونٹ کا بایاں حصہ نیچے کو جھک آیا تھا۔ آنکھوں سے شرافت اور بختگی عیاں تھی اور بات کرتے وقت وہ یوں سمٹ جاتی تھیں گویا دُور کی شے دیکھ رہی ہوں۔ پتی ناک کے سرے پر چھو سا کالا تیل تھا جیسے کسی نے سیاہی بھرے قلم کی نوک چھوا دی ہو۔ ہاتھوں کی لمبی انگلیوں میں عورتوں ایسی نزاکت تھی۔ اور دُبلے جسم پر ڈھیلے ڈھلے

پڑے کسی دوسرے کے معلوم ہو رہے تھے۔ موقع پر پہنچ کر انجنیئر نے پائپ خوشگوار دھواں اُڑاتے ہوئے کچھ دیر تک قبر کا اچھی طرح جائزہ لیا اور محکمہ جنگلات کے گئے افسر سے باتیں کرنے لگا۔ شروخ میں اُن کا خیال تھا کہ وہ گاؤں والوں کو خبر دیئے بغیر قبر کو ڈھادیں اور سڑک وہاں سے گزار کر لے جائیں۔ چونکہ اس کی موجودگی میں سڑک کو ایک اونچے ٹیلے کی پشت پر سے گھوم کر اوپر بانا پڑنا تھا۔ اور اس طرح تقریباً سات میل کا چکر پڑ رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ قبر کسی بزرگ کی ہو اور بعد میں خواہ مخواہ کا بھگڑا کھرا ہو جائے۔ انجنیئر نے پہلے خیال کو منسوخ کر دیا اور قریبی گاؤں میں جا کر خود تحقیقات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری صبح انجنیئر نے بھورے رنگ کا پوری آستینوں والا سویٹر پہنا۔ اور چھوٹی ہاتھ میں لے کر پائپ کے دھیمے دھیمے کش کھینچتا سانبر میڈ کے ساتھ نالی بستی کی جانب روانہ ہو گیا۔ شروخ اپریل کا نیلگوں آسمان شفاف تھا اور نیم گرم پسید دھوپ چمک رہی تھی۔ اونچے لمبے چتر کے جھومر بہار کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں سرگوشیاں سی کر رہے تھے اور چناروں کے درختوں میں سُرخ سُرخ نوٹ گنتے پتیوں کے شعلے سے اٹھ رہے تھے۔ انجنیئر اپنے اندر خون کی مدت محسوس کر رہا تھا اور اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چھوٹی اور پائپ ایک طرف پھینک کر ہری ہری لچکیلی گھاس پر لوٹنا شروع کر دے اور ہری بھری چراگاہ کے آخری کناروں تک لوٹتا چلا جائے اور پھر ناشیاتی کے کسی پھولوں بھرے درخت تلے گھاس میں منہ چھپا کر لیٹ جائے اور کبھی شہر کے بھاپ چھوڑتی لگ بھری سڑکوں پر نہ جلتے اور کسی چیف انجنیئر کی کار کے لئے پڑول مابند و بست نہ کرتا پھر سے چھ ہزار فیٹ کی بلندی، خوشبودار گھاس، پھولوں کے بار سے جھکی ہوئی ڈالیاں اور اوپر گہرا نیلا آسمان..... انسان کو اور کیا باہیئے؟ یہ رشتے، یہ سودے، یہ بھوٹی گواہیاں، یہ بے رُوح قہقہے، یہ

بناوٹی مسکراہٹیں، یہ نقلی آنسو، یہ کاغذی پھول، یہ ریت کی دیواریں، یہ رب کیوں؟ کس لئے؟  
”میں نہیں.....“

چنار کی شاخوں میں کوئی طوطا چلا یا۔ انجینیئر نے پائپ منہ سے نکال کر طوطے کی جانب دیکھا۔

”میں نہیں.....“ طوطے نے پھر آواز دی۔ انجینیئر اپنے آپ ہنس پڑا۔  
”ٹھیک ہے۔ ان سب سوالوں کا یہی ایک موزوں جواب ہے میں نہیں اور بس۔“

سابر میڈ سے چند قدم آگے جا کر انجینیئر ایک جگہ خود بخود ڈرک گیا۔ نشیبی بستی کے ایک منزلہ کچے مکان صاف نظر آرہے تھے۔ یہ مکان پہاڑی کی ڈھلوان پر سیڑھیوں کی شکل میں اوپر نیچے بنے ہوئے تھے اور اُن کی کھڑیا مٹی سے پی ہوئی چھتوں پر کہیں دھان کے خوشے کہیں لال مرچیں اور کہیں مکی کے بھٹے دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ ہر مکان کے سامنے چھوٹا سا صحن تھا جس کے آگے باڑ لگی تھی اور کنارے پر سید، آلوچہ، ناشپاتی یا بٹنگ کا پیرا لگا تھا۔ یہ پڑسیند کا سنی یا گلابی پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور ان پیڑوں تلے کہیں کوئی عورت بیٹھی دھوپ میں اپنے بال نکھار رہی تھی اور کہیں کوئی بچہ بندھی ہوئی بکری سے کھیل رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی ندی وادی کا چکر کاٹ کر نیچے دوڑ تک چل گئی تھی اور صنوبر کے درختوں میں گم ہو گئی تھی۔ پاس ہی چوڑے سے ہموار تختے پر یوکلپٹس کے درختوں کا بہت بڑا جھنڈ تھا۔ جس کے ٹھنڈے اور گہرے سائے تلے چشمے پر ایک بوڑھا دیہاتی دو تین بیڑوں کو پانی پلا رہا تھا۔ پرے اونچی نیچی گھاٹیوں اور بھوری چٹانوں کے سلسلے حدنگاہ تک پھیلے ہوئے تھے اور اُن کے اوپر چیلیں پر توڑے دائروں کی شکل میں منڈلا رہی تھیں۔

انجینیئر فیچر کے اس سحر کار حُسن سے مسحور ہو کر رہ گیا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا یہ جگہ اس نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہو۔ شاید خواب میں اُس نے فردوس کے اس حسین مکدرے کی سیر کی ہو۔ اُس نے یوکلپٹس کے جھنڈوں کی طرف سے آنے والی ہوا کی لطیف خشکی اپنے نتھنوں میں محسوس کی اور چشمے کی جانب چل پڑا۔ یہ چشمہ کافی بڑا تھا اور کناروں پر پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے ساتھ ساتھ جوڑے ہوئے تھے۔ پانی کی سطح پر کہیں کہیں پتے تیر رہے تھے۔ گھنی چھاؤں کے باعث چشمے کے نیچے کی سلیں گہری سبز دکھائی دے رہی تھیں۔ چشمے میں سے ایک چھوٹا سا نالہ نکل کر عقب میں بٹنگ کے باغ میں چلا گیا تھا۔ بوڑھے دیہاتی نے انجینیئر کو دیکھ کر بیڑوں کو ایک طرف کر دیا۔ اور بوڑھا ہاتھ ماتھے پرے جا کر سلام کیا۔ انجینیئر آہستہ سے ایک چھوٹے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

”یہ بیڑیں تمہاری ہیں بابا؟“

بوڑھا مسکراتے ہوئے اپنی سپید داڑھی پر ہاتھ پھرنے لگا۔  
”آپ ہی کا مال ہے بابو جی! پار سال ان کی ماں مر گئی تھی۔ اب بھلا میرے سوا ان کی رکھوالی کون کرے! آپ کی دعا سے گھاس پات کھا کر ہی پل رہی ہیں.....“

انجینیئر نے پاؤں جوتوں سے باہر نکال کر گھاس پر پھیلا دیئے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے کسی نے اس کی جلتی ہوئی آنکھوں پر برف کے پانی میں بھگوئی ہوئی پی رکھ دی ہو۔ اُس نے ایک ہاتھ چشمے میں ڈال دیا۔ پانی سرد اور شفاف تھا۔ وہ پانی کی ننھی مٹی لہروں سے کھیلنے لگا۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ اس دیہاتی سے نئی سڑک والی قبر کے بارے میں کچھ دریافت کرے۔ بوڑھا دیہاتی ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائے گھاس پر نہایت اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اور ادھر ادھر جرتی ہوئی بیڑوں کو تک رہا تھا۔ انجینیئر

نے ٹھنڈے میٹھے پانی کے دو تین گھونٹ پی کر رومال سے ہاتھ منہ پونچھا۔  
اور بوڑھے سے پوچھا۔

”کیوں بابا! یہاں کسی بزرگ کا مزار بھی ہے؟“

بوڑھا گردن پر ماتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”مزار تو کوئی نہیں بابو جی!“

انجینیئر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”لیکن رشی کنڈ جانے والی پگڈنڈی پر.....؟“

بوڑھے نے بات کاٹتے ہوئے حامی بھری۔

”اب سمجھا..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بابو جی! وہاں ایک مزار ہے۔ اگرچہ

وہ کسی بزرگ کا نہیں، بلکہ ایک لڑکی کا ہے، لیکن وہ کسی بزرگ سے کم نہ تھی۔

کم از کم میں اُسے ایسا ہی سمجھتا ہوں.....“

بوڑھا دمک گیا۔ اور گردن جھکاتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ انجینیئر

نے کان کھڑے کر لئے۔

”لڑکی؟“

”یہ بڑی پُرانی کہانی ہے جناب! اسے کہنے کے لئے میرے پاس دل اور سنے

کے لئے آپ کے پاس وقت نہیں ہے، ایک زمانہ تھا۔ جب لاجی کے جن کے

چرچے رشی کنڈ کی چوٹیوں تک تھے۔ اور اس کی جوانی کی مہک وادیوں اور

چراگا ہوں میں بسی ہوئی تھی..... اب نہ وہ زمانہ رہا، اور نہ لاجی ہی رہی۔

ہاں اس کی قبر ضرور باقی ہے۔ اور میری موت کے بعد شاید وہ بھی مٹ

جائے.....“

انجینیئر اپنے سیاہ پائپ میں تمباکو بھر رہا تھا۔ وہ ایک دم رگ گیا۔

جیسے کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا ہو۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر بوڑھے دیہاتی

کے پاس بیٹھ گیا۔

”اس کا نام لاجی تھا بابا؟“

”ہاں اس کی ماں اُسے اسی نام سے پکارتی تھی۔ اور میں بھی اُسے لاجی ہی کہا

مرتا تھا۔ اُسے مجھ سے بڑا پیار تھا۔ اُس کے دل کا رتی رتی حال مجھ پر کھلا تھا

ایک روز وہ بہت غمزہ تھی اور میرے پاس آکر رو پڑی تھی۔ اور میں نے

اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ میرے ہاتھوں میں ابھی تک لاجی کے بالوں

کی خنکی محفوظ ہے اور اس کے بال سنہری تھے.....“

..... اور اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔“

”ہاں اُس کی آنکھیں نیلی تھیں..... اور اس کا رنگ بھورا تھا..... اور

اس کی گردن میں چھوٹا سا تل تھا۔“

”ہاں وہ تل لاجی کو بڑی نظر سے بچائے رکھتا تھا۔ لیکن بد نصیب لاجی کو

کسی کی نظر کھا گئی۔ اور جب میں نے برف میں سے اُس کی لاش کو نکالا، تو اُس

کی گردن پر وہ خوب صورت تل ویسا ہی تھا۔ اور اُس کی نیلی آنکھوں کی جھیلیں

نہجہ ہو گئی تھیں۔ اور اس کا بدن کالج کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن بابو جی آپ

نے اُسے کہاں دیکھا؟“

بوڑھے دیہاتی نے اپنی کپکپاتی پلکیں اُپر اٹھا کر انجینیئر کو دیکھا۔ مگر وہاں کوئی

نہ تھا۔ پھر دس گردنیں جھکائے گھاس چر رہی تھیں۔ چشمے کے نیلگوں پتھر خالی تھے۔

چشمے پر سے نیچے وادی میں جانے والی پگڈنڈی..... ویران تھی۔ بوڑھے نے آہستہ

سے گردن جھکالی اور پرانی یادوں کے خزاں نصیب جنگلوں میں کھو گیا۔

ریسٹ ہاؤس میں پہنچ کر انجینیئر نے سیاہ پائپ اور چھڑی میز پر رکھ دی۔ اور

اپنے آپ کو آتشدان کے قریب صوفے پر گر دیا۔ اس کے جوتوں کے تسمے

کھلے تھے۔ اور سانس یوں پھول رہا تھا۔ جیسے وہ دو تین میل کی چپڑھائی

پڑھتا اُپر آیا ہو۔ آتشدان میں کوئلوں کی آج مدھم پڑ گئی تھی۔ اور کوئلوں

کے ارد گرد گلابی رنگت کی ملائم روشنی کا پھیکا سا بالہ بن گیا تھا۔ دروازے پر

ملازم نمودار ہوا۔ اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔  
”کھانا تیار ہے جناب۔“

ایک لمحے تک انجنیئر کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا؟ ملازم نے دوسری مرتبہ کھانے کے متعلق پوچھا انجنیئر نے سر اٹھا کر آہستہ سے کہا۔

”میں سو نے جارہا ہوں۔ آج کسی سے نہ مل سکوں گا۔“

”یہاں بہار میں بھی بارش ہوتی ہے؟“  
ڈرائیور نے بے نیازی سے جواب دیا۔  
”یہاں سب کچھ ہوتا ہے زنا ب....“

اور میٹرنگ گھما کر لاری ٹیکم پور کے اڈے پر کاؤ کے گھنے درخت تلے کھڑی کر دی۔ ٹیکم پور کافی بڑا قصبہ تھا۔ اور یہاں کی دو تین سڑکوں پر رنگ پھری ہوئی تھی، دوسرے مسافروں کے ساتھ وہ بھی لاری سے باہر نکل آیا اور اپنا بستر اور سوٹ کیس ایک جگہ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے تقریباً سبھی مسافر پہاڑی مزدوروں کی بیٹھ پر اپنا اپنا سامان لا کر چلتے بنے۔ اور وہ اپنی جگہ پر کھڑا خوشی سے سیاہ پائپ پیتا رہا۔ وہ شہر کے سب سے بڑے انجنیئرنگ کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور اپنی گرما کی چھٹیوں کے کچھ روز پہاڑ پر گزارنے آیا تھا۔ اس کا نام فیصل تھا۔ فراغت کے یہ ایام وہ کسی ایسے مقام پر بسر کرنا چاہتا تھا۔ جو پہاڑ کی پرسکون گنج میں خوش اور پُرانے درختوں کے درمیان واقع ہو۔ جہاں اُسے مکمل تنہائی اور اطمینان حاصل ہو سکے، اُس کے دوستوں نے اُسے مشورہ دیا تھا۔ کہ وہ چند کوٹ میں رہے، جو ٹیکم پور کے اڈے سے ڈیڑھ ہزار فٹ کی اونچائی پر تھا۔ اور جہاں پہنچنے کے لئے ٹکڑوں پر سوار ہو کر چھ سات میل کا پُر خطر پہاڑی راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ چندن کوٹ میں اُس کے ایک امیر زمیندار دوست نے اپنا چھوٹا سا ایک منزلہ مکان بنوا رکھا تھا۔ جس کی چابی فیصل کے گرم کوٹ کی

اس کا لہجہ اُس کی آواز سے زیادہ بوجھل اور افسردہ تھا۔ ملازم نے چپکے سے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔ انجنیئر نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے پائپ سٹگایا اور اُسے دانتوں تلے دبا کر کمرے میں ٹھپنے لگا۔ وہ کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لاشعور کے کباڑ خانے میں اُن گرد آلود بھولی بسری یادوں کو ڈھونڈ رہا تھا، جن کا تعلق چندن کوٹ سے تھا۔ نیلگوں پتھروں والے چشمے سے تھا۔ اور سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لاجبی سے تھا۔ وہ چندن کوٹ کب آیا تھا۔ وہ کبھی چندن کوٹ آیا بھی تھا؟ نہیں..... اس سے پہلے وہ یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ لیکن..... وہ سنہری بال..... نیلی آنکھیں.... گردن کا تل..... یہ رب کہاں سے آگئے؟ انجنیئر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ نچان کی وادیوں پر ہلکی نیلی دھند چھا رہی تھی۔ اور ایک تپتی سی سڑک سانپ کی مانند بل کھاتی ٹیلوں کا چکر کاٹتی نیچے دور تک چلی گئی تھی۔ ایک ایک انجنیئر کے ذہن میں روشنی کی لکیر سی چمکی وہ کھڑکی سے ہٹ کر صفوفے پر بیٹھ گیا۔ اوریوں مضطرب نگاہوں سے کھڑکی کی جانب دیکھنے لگا۔ جیسے وہاں کوئی انہونی شے نمودار ہونے والی ہو۔ اب اُسے سب کچھ یاد آ رہا تھا اور وقت تیزی سے پیچھے کی جانب گردش کر رہا تھا۔ اور اس نے دیکھا۔ کہ وہ لاری کی اگلی میڈ پر بیٹھا ہے۔ اور اس کا سرخ ریشمی مفلر ہوا میں اڑ رہا ہے۔ اور اسی کا چہرہ مسرت سے دیکھ رہا ہے اور آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے جمع ہو رہے ہیں۔ ہاں اُس روز مینہ بھی برسا تھا اور اڈے پر پہنچتے ہی اُس نے ڈرائیور سے پوچھا تھا.....

اندرونی جنب میں تھی۔ آسمان پر بادلوں کے جھرمٹ زیادہ گہرے ہو رہے تھے اور وہ اٹھے پر کھڑا سوچ رہا تھا۔ کہ چندن کوٹ کا سفر ابھی شروع کرے یا کل پر ملتوی کر دے۔ اگرچہ لیکھ پور میں وہ رائل مسلم ہوٹل میں رات گزار رہا تھا جس کا بورڈاڈے کے بالکل سامنے ٹکڑی کی تعزینہ نما منزلہ عمارت کے باہر لٹک رہا تھا۔ لیکن جب اس نے ہوٹل کی بالکونی پر جھکے ہوئے ایک موٹے آدمی کو دھوٹی کے اندر ہاتھ ڈالے رائیں کھلاتے دیکھا تو وہ سر سے بے کرا پاؤں تک کانپ گیا۔ اور دو ٹوکرائے پر بے کرا ایک پر سامان باندھ اور دوسرے کی پیٹھ پر خود بیٹھ چندن کوٹ کی طرف چل پڑا۔

چندن کوٹ کو جانے والا پتھر لارا ستہ پہاڑی کے ساتھ ساتھ گھومتا ہوا اوپر چلا گیا تھا۔ اس کی ایک جانب پہاڑ تھا۔ اور دوسری جانب گہری ڈھلوانی کھڈ..... جس کی تہہ میں بہت نیچے کوستانی مالہ بہہ رہا تھا اور خوفناک نشیبوں پر بھوری ٹیلی چٹانیں سر اٹھائے آسمان کو تک رہی تھیں۔ کہیں کہیں سیڑھی نما کھیتوں میں ہل چلاتے کسان کھلونوں کی مانند نظر آ رہے تھے..... اوپر پہاڑ پر جا بجا صنوبر اور چنار کے سایہ دار درخت اُگے ہوئے تھے اور خود رو سبزے نے پتھروں پر پخل کی چادر سی ڈال رکھی تھی۔ چڑھائی اگرچہ دشوار گزار نہ تھی۔ لیکن سڑک اس قدر چھوٹی تھی، کہ ٹھو بھی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے، فیصل زندگی میں پہلی مرتبہ پہاڑی سفر کر رہا تھا۔ لاری میں اُسے چکر بھی آئے تھے۔ مگر پیاز کا اچار چلتی مرتبہ اس نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ تازہ اور خشک پہاڑی ہوانے اُس پر بے حد خوشگوار اثر ڈالتا تھا۔ اور اب وہ اپنے آپ کو بادل کے لطیف ٹکڑے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جو خچر کی پیٹھ پر بیٹھا چندن کوٹ کا پہاڑی راستہ طے کر رہا ہو۔ اس نے آنکھوں پر آئے ہوئے سرخ مفکر کو پرے ہٹاتے ہوئے خچر والے سے کہا۔

”کچھ کاؤدوست..... میں نے سُن رکھا ہے پہاڑی لوگ بہت اچھا لگاتے ہیں۔“

ٹھو کھینچنے والے کے کرخت مگر صحت مند گندمی چہرے پر شگفتگی سی آگئی۔ اور نے دو ایک بار کھنکار کر منہ پہاڑ کی چوٹیوں کی سمت اٹھا کر آواز لگائی:-

چھبے دیاں ہٹیاں  
دکدا ای چینا

کس مرنا اور کس چینا

جیویں لاڑیئے نی

کس مرنا ایں کس چینا

اس کی تیز اور گھٹک دار آواز پتھروں اور چٹانوں سے ٹکرا کر دادیوں اور جنگلوں میں گونج پیدا کرتی ہوئی بھورے بادلوں میں گم ہو گئی۔ اور فیصل نے لٹوس کیا۔ کہ اس آواز میں بڑا درد اور رنج تھا۔ پہاڑی گانے اس قدر دلگیر برہن ہوتے ہیں؟ ان بے جان پتھروں میں بسنے والے لوگوں کے دلوں میں یہ نزاکت اور گداز کہاں سے آجاتا ہے؟ پہاڑی گوتیے نے فیصل سے سگریٹ مانگا۔ اور اس کے لمبے لمبے کش لیتا ہوا پھلے ٹھو کو رستی سے پکڑ کر اوپر کھینچنے لگا۔

”مرا کیوں جاتا ہے؟ ابھی تو دو کو س طے ہوئے ہیں۔“

فیصل کو ڈرتھا۔ کہ کہیں مینہ نہ پڑنے لگے۔ ایسی حالت میں وہاں سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ کہ خچروں کو درخت کے ساتھ باندھ کر پتوں کی پکیٹی ہوئی بھت تلے بارش کے رکنے کا انتظار کیا جائے۔ اسے اپنے کپڑوں کا اتنا خیال نہیں تھا۔ جتنا بستر کے بھیگ جانے کا تھا۔ اگر بستر بھیگ گیا۔ تو وہ سوئے گا کس پر؟ لیکن چندن کوٹ آئے تک بارش نہ ہوئی۔ اگرچہ بادلوں کی ریشمی انگلیاں اسے بڑی محبت سے چھو کر گزر جاتی تھیں۔ کسی وقت کوئی دودھیا ابر پارہ انہیں اپنی لڑوب اور ملائم دھند میں چاروں طرف سے لپیٹ لیتا۔ فیصل کو ہر سانس پر یوں معلوم ہوتا گویا وہ برفاب میں گھلی ہوئی آکسی کریم پی رہا ہو۔ خچر موج میں آکر کر خرنانے لگتے۔ ہوا ان بادلوں کو بہت جلد اڑا کر اوپر لے جاتی۔ اور وہ نیلو



فضا میں تحلیل ہو جاتے۔ فیصل کو یوں لگتا۔ جیسے اُس نے قدرت کو سانس لیتے دیکھ لیا ہو۔ اور اس کا چہرہ انجانی مسرت سے دکنے لگتا۔ اور اس کا ذہن خوبصورت تر خیالات سے جگمگا اٹھتا۔ یہ روشنی، یہ مسرت شہروں میں کیوں نہیں ہوتی؟ فیصل نے سوچا۔ کہ وہ پوری گمائی چھٹیاں پہاڑ پر ہی گزار دے گا۔ اور شہر کا رخ اس روم کرے گا۔ جب وہاں جھلسکتی ہوئی سنگین سڑکوں پر لوگوں کے جھکڑ چلنا رک جائیں گے اور لوگ شام کو گرم کوٹ پہن کے گھر سے نکلا کریں گے۔ یا پھر سردیوں کا موسم بھی وہ یہیں رہے گا۔ اور دن کے وقت جب بند دروازوں کے باہر برف لگے گا۔ وہ چندن کوٹ کے اک منزلہ مکان میں آگ کے سلاہ بستر میں دیکھا شارٹ برونٹے کے ناول پڑھا کرے گا۔

..... اور خوشبودار بجائے پٹے گا۔ اور پائپ کا دھواں اڑائے گا۔ وہ منزل کتنا دل کش ہوگا۔ وہ کلثوم کو بھی نہیں بلالے گا۔ اور پھر دونوں برف پر پھسلا کریں گے۔ اور جب بھر کر قہقہے لگائیں گے۔ اور رات کو آتش دان کے سامنے بیٹھ کر مستقبل کے سنہری خواب بنا کریں گے، کلثوم کے خیال کے ساتھ ہی فیصل کو اس کے الوداعی الفاظ یاد آگئے۔ جو اس نے اس چہرہ بنا کر کہے تھے۔ اس نے کہا تھا۔

”میں تمہیں پہاڑ پر جانے سے نہیں روکتی۔ لیکن مجھ سے وعدہ کرو، کہ مجھے ہر روز خط لکھا کرو گے۔ اور بغیر مفکر کے باہر ہوا میں نہیں نکلو گے۔“

پھر کلثوم نے اپنے ہاتھوں سے فیصل کا سرخ مفکر درست کیا تھا۔ اور فیصل نے وعدہ کیا تھا، کہ وہ ہر روز اُسے خط لکھے گا۔ اور مفکر لئے بغیر ہوا میں نہیں گھومے گا۔..... بے چاری کلثوم..... اُسے فیصل کا کتنا خیال رہتا ہے فیصل کا دل کلثوم کی سوگوار یاد سے بوجھل ہو گیا۔ اُسے یوں معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ کلثوم سے کئی مہینوں سے جدا ہے۔ اُس نے خیر پر بیٹھے بیٹھے دل میں فیصل کر لیا۔ کہ وہ چندن کوٹ میں چند روز قیام کے بعد فوراً شہر واپس ہوئے گا۔ ایک ایسی پچھلا خیر نہایت بھدے طریق سے نہنایا۔ فیصل کو یوں لگا۔ جیسے وہ اس کا

اٹار با ہو۔ اُلو کا پٹھا۔ چندن کوٹ پہنچتے پہنچتے اُسے شام ہو گئی۔ اور نشیب کی وادیاں رات کے اولیں مرطوب اندھیروں میں پھنپھنے لگیں۔ اس کے دوست کا ذاتی مکان اُس چھوٹے سے گاؤں کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ اور ذرا اونچائی سے دیکھنے پر گڑیا کا گھر معلوم ہوتا تھا۔ فیصل نے بوڑھے چوکیدار کو اپنے دوست کا خط دکھلا کر دروازہ کھولا۔ سامان اندر رکھا۔ اور دروازہ بند کر کے چھوٹے سے ڈرائینگ روم کی کھڑکیاں کھول دیں۔ شام کی افسردہ ہوا اندر کئی ایک پھولوں کی مہک بھی لے آئی۔ فیصل نے موم بتی روشن کر کے کارنس پر رکھی۔ اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑی جگہ میں مختصر سامان الٹ پلٹ پڑا تھا۔ اور صوفوں پر گرد جم رہی تھی۔ کھڑکی کی بل پر خدا جانے کب کا آدھا بچا ہوا سگریٹ رکھا تھا پھت نیچی تھی۔ اور دیواروں پر پھول دار کاغذ منڈھا ہوا تھا۔ کارنس کے اوپر کسی دوشیزہ کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ جو برس پہنے، نگہبان ایال والے گھوڑے پر سوار تھی۔ اور فیصل کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ سونے والے کمرے میں پلنگ پر گدا دو ہرا پڑا تھا۔ اور بڑی آرام کرسی گرد آلود ہو رہی تھی۔ فیصل نے گدا میدھا بچا کر جلدی سے بستر کیا۔ سوٹ کیس میں سے ڈبل روٹی کے ٹکڑے نکال ان پر جام لگایا۔ اور انہیں حلق میں اتار کر موم بتی بچھا بستر میں لیٹ گیا۔ وہ دو روز سے سفر پر تھا۔ اور بے حد تھک رہا تھا۔ چنانچہ اُسے بہت جلد نیند آ گئی۔

صبح جس وقت اس کی آنکھ کھلی۔ روشن دان میں سے چمکیلی دھوپ اندر آ رہی تھی۔ کھلی کھڑکی میں سے جو تازہ ہوا داخل ہو رہی تھی۔ اس میں گیلی مٹی اور مرطوب گھاس کی مہک تھی۔ باہر آسمان کے نیلگوں سمندر میں دو دھیا ابر پاروں کی بادبانی کشتیاں رزاں تھیں۔ فیصل اپنے جسم میں توانائی اور شکنجی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے لیٹ لیٹ ایک لمبی انگڑائی لی۔ اور اچھل کر بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اب وہ مکان کے اندرونی حصے کا اچھی طرح جائزہ لے سکتا تھا۔ یہ مکان ڈرائینگ روم۔ خواب گاہ۔ باہرچی خانے اور غسل خانے پر مشتمل تھا۔ کمرے چھوٹے مگر پرسکون تھے۔



ماحول میں رہ کر ہلا بڑھا تھا۔ اور شہروں میں اگر کوئی لڑکی پھسل کر نالی میں بھی گر پڑے۔ تو لوگ اُسے ہاتھ لگاتے ہوئے جھکتے ہیں۔ مبادا وہ لڑکی جیتج اُٹھے۔  
 ”گھر ماں بہن نہیں ہے کیا؟“

اس کے باوجود جب اس نے لڑکی کو ہائے میں اب کیا کروں۔ کہتے سنا۔  
 تو اس سے نہ رہا گیا۔ لمبے لمبے تین چار ڈگ بھر کر باغ کی مینڈھ پر پہنچا۔ اور لڑکی کے ہاتھ سے رسی پکڑ کر بھڑکواؤ پر کھینچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بھیڑ بھی شاید اُمی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ فیصل کے ہاتھ میں رسی دیکھ کر یوں اپنے آپ اُدھر آگئی۔  
 جیسے اس کے ہاتھ میں سرسوں کے پوے ہوں۔ لڑکی فیصل کو دیکھ کر ایک دم پرے ہٹ گئی۔ اور اپنی لمبی لمبی پلکیں جھپکا کر حیرت اور تعجب سے دیکھنے لگی۔ فیصل نے جگالی کرتی بھیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں کی بھیڑیں مردوں سے بالکل نہیں گھبراتیں۔“

بھیڑ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کے پاس سمٹی ہوئی لڑکی بھی خاموش رہی۔ فیصل نے نگاہیں اُدھر اٹھائیں۔ اور لڑکی نے پلکیں نیچے جھکالیں۔ لیکن اس نے اُن پلکوں تلے نیلے سمندر کی ایک جھلک دیکھ لی تھی اور اب وہ سنہری بال دیکھ رہا تھا۔ اور بالوں کے گرد روشنی کا زریں ہالہ دیکھ رہا تھا۔ اور پکی ہوئی خوابی ایسے رخساروں پر کنوارے کنبے کا حجاب تھا۔ اور حیا کی سرخی تھی، چمک تھی۔ اور یہ چمک اُس نے راستے میں پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر غروب آفتاب کے وقت دیکھی تھی۔ لڑکی نظریں نیچی کئے۔ مگر دن ایک طرف جھکائے جگالی کرتی ہوئی بھیڑ کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھوں کا رنگ بھورا تھا۔ اور کلامیوں میں چاندی کے گنگن تھے، اور چوڑی آستینوں کے نیچے جلد کا رنگ پسید تھا۔ اور لمبے نیلے کرتے کے گرہ بیان پر سرخ دھاگے سے بیل کاڑھی ہوئی تھی۔ اور خمیدہ گردن پر ایک طرف چھوٹا سا کلا تلی تھا۔ کانوں میں چاندی کی باریک بالیاں تھیں۔ اور سنہری بالوں کی دونوں لٹیں سینے پر تھیں۔ اور نیلے سمندروں پر ہلا

ماہ تھا۔ فیصل کی نگاہیں ایک جگہ پر نہ ٹھہر سکیں۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

”میں..... میں شہر سے آیا ہوں۔ میں یہاں پر دیسی ہوں۔ اور وہ سامنے ہی کے مکان میں رہتا ہوں..... اس گاؤں کا آسمان بڑا نیلا ہے۔ اور اس نئے کا پانی بہت میٹھا ہے۔“

لڑکی اور زیادہ مترا گئی۔ اُس نے فیصل کی طرف دیکھ کر بغیر بھیڑ کی رستی تھامی۔ اُسے کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔ پگڈنڈی پر کھڑے ہو کر اُس نے گھرائے۔ انداز میں فیصل کو دُور سے دیکھا۔ اور ڈھلوان پراثر نے لگی۔ اُدھر پر چشمے کے ل کھڑا فیصل دیر تک اُس معصوم چرواہن کو بتی سی پگ ڈنڈی پر بے ربطی ہ قدم اٹھاتے اور بھیڑ کو ہنکاتے دیکھتا رہا۔ تا آنکہ اس کا مختصر سا نازک جسم منزلہ مکانوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ اور وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ اپنے پہاڑی مکان کی جانب چل پڑا۔ وہ کلتھم کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اور اس لڑی دوشیزہ کے پکی ہوئی خوابیوں ایسے شہابی رخسار دیکھ کر اُسے کلتھم کے زرد زرد اس چہرے کا خیال آیا تھا۔ کوہستانی بہار کی پہلی جھلک نے فیصل پر شہری بہا ا بے جان افسردگی کو زیادہ اُجاگر کر دیا تھا۔ اور وہ حیران تھا۔ کہ کلتھم کے گالوں اور خشتی کو کون بچھا گیا ہے؟ اس کے گال پکی ہوئی خوابیوں ایسے کیوں نہیں ہا؟ کیا وہ جوان نہیں۔ وہ ہر روز ناشتے پر پھلوں کا رس پیتی ہے۔ اور سونے سے ہلے دودھ میں انڈوں کی زردی پھینٹ کر پیتی ہے۔ پھر اس کے چہرے پر سردگی کی زرد لکیریں کون کھینچ گیا ہے؟..... مگر نہیں..... کلتھم کے پڑمردہ ہرے میں ایک خاص دل کشی ہے، مومہنی ہے۔ یہ خزان کا حسن ہے اور خزان گن بہار کی نسبت زیادہ گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اور کلتھم کو ایک بار اپنے نابل دیکھنے اور اس کی سوگوار پلکوں پر اپنے ہونٹ کو رکھ دینے کی آرزو نے بل کو بادل کے چھوٹے سے ٹکڑے کی مانند گھیر لیا۔ اور اسی بادل کے سائے

میں اُسے ایک دفعہ پھر اُس پہاڑی دوشیزہ کا خیال آگیا۔ اور وہ تعجب کرنے لگا کہ اس لڑکی نے کوئی بات کیوں نہیں کی؟ اس نے اکثر اُردو ناولوں اور کہانیوں میں اس قسم کی پہاڑی لڑکیوں کو پہلی ملاقات میں ہی پریسیوں کے گلے میں باہن ڈال کر کہتے سنا تھا۔

”پریسی! مجھے چھوڑ کر چلے تو نہیں جاؤ گے؟“

فیصل کا جی چاہا۔ کہ وہ ان کہانیوں اور ناولوں کے مصنفوں کی گردنوں میں رتہ ڈال کر انہیں کھینچتا ہوا موضعِ چندن کوٹ تک لائے اور چپڑے کے درختوں پر اُلٹا لٹکا کر غودا پس چلا جائے۔ اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھانے لگا۔ اُسے دور سے مکان کے دودکش میں سے نیلا نیلا دھواں اُٹھتا دکھائی دیا۔ مکان کے برآمدے میں کھڑے ہو کر اُس نے باورچی خانے میں جھانک کر دیکھا۔ بوڑھا چوکیدار انگلیٹھی پر چائے کا پانی رکھے آگ جلا رہا تھا۔ فیصل کو دیکھتے ہی وہ آنکھیں پونچھ کر بولا۔

”جناب! میں تو سمجھا آپ راستہ بھول گئے ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے۔ بڑی دُور نکل گئے تھے..... چائے لاؤں؟“

”ضرور۔“

کمرے میں جا کر فیصل نے دیکھا۔ کہ کرسیوں وغیرہ کی بھاڑ پونچھ ہو چکی تھی اور ہر شے اپنی اپنی جگہ پر ترتیب سے پڑی تھی۔ وہ بوڑھے چوکیدار کی سنگت پر بہت غرض نہ تھا۔ اس وقت اُسے محسوس ہوا۔ کہ چوکیدار کے بغیر وہ چندن کوٹ میں دودن بھی مشکل سے کاٹ سکتا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر فیصل نے پائپ سلگایا۔ اور لیٹر پیڑ نکال کر بیٹھ گیا۔ اس روز کلشوم کے نام اُس نے محبت سے بے زبیر ایک طویل خط لکھا۔

لیکن اس میں پہاڑی دوشیزہ کا کہیں بھی ذکر نہ تھا۔!

خط لکھ کر اس نے لیمپ بجھایا۔ اور لحاف اُپر کر کے لیٹ رہا۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے درختوں کے سیاہ بھندڑوں کے اُپر تارے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور ان کی مدھم روشنی کمرے میں ہلکی نیلی دھند کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ فیصل دیر تک کلشوم کی شیریں یاد میں کھویا رہا۔ اور پھر اُسے نیند آگئی۔ اور اس نے ایک خواب دیکھا۔ کہ وہ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی کسی لڑکی کے ساتھ مرغزاروں کی لمبی گھاس میں گھوم رہا ہے۔ اور اُن کے پاؤں ننگے ہیں۔ اور اوس میں بھیگ رہے ہیں۔ لڑکی کا کھر دراگر گرم ہاتھ اُس کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ کتنے چستے پیچھے پھوڑا آئے ہیں۔ کتنی ہی ندیاں غبور کر آئے ہیں۔ اور اُن کا راستہ ان گنت کلپوش وادیوں سے ہو کر گزرا ہے۔ اور وہ تھک گئے ہیں۔ اور ہری ہری جنگلی گھاس پر بیٹھ گئے ہیں۔ اُن کے سروں پر خوبانی کے پیڑ کا سایہ ہے۔ پیڑ کی ٹہنیاں شبنی شکوفوں سے لدی ہوئی ہیں۔ لڑکی کی نیلگوں آنکھوں میں سات سمندروں کی پُرسکون گہرائیاں ہیں۔ اور اس کے بالوں میں سبب کے پھولوں کا گچھا سج رہا ہے۔ وہ اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے چہرے پر سحر خیز روشنی کی چمک ہے۔ اور ہونٹوں پر حیا آلود تبسم ہے۔ اور اس کے جسم سے کنوار پنے کی خوشبو اُٹھ رہی ہے۔ اور اُس کے لمس میں بہار کی تازگی ہے۔ خون کی حدت ہے۔ محبت کی مہک ہے..... دونوں کی نظریں بغل گیر ہو رہی ہیں۔ دونوں خاموش ہیں۔ اور ایک دوسرے

سے پوچھ رہے ہیں۔ ہم اس سے پہلے کہاں تھے؟ ہماری ملاقات کون سے شاعر میں ہوئی تھی؟ ہم نے ایک دوسرے کو کہاں دیکھا تھا؟ اس کے بعد ہم کدھر جائیں گے؟

ٹپ..... ٹپ!

خوبانی کے شگوفوں پر سے اوس کی بوندیں گھاس پر گزر رہی ہیں۔ اور مرغزاروں میں سے دھند اٹھنے لگی ہے۔ اور وہ دونوں اٹھ کر ایک طرف چل پڑے ہیں۔ اور اُن کے جسم ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہیں۔ اور کائنات کے نورانی خلاؤں میں روشنی کے دائرے رقص میں ہیں۔ اور زمین پر ہفتے کے پھول اُن کے پاؤں چوم رہے ہیں۔ اور اُن کے غیر مرئی ہیولے دودھیا ابر پاروں میں تحلیل ہو رہے ہیں۔ اور دنیوی آنکھیں آہستہ سے اُن پر ٹھک جاتی ہیں..... نیچے..... اور نیچے.....

فیصل ایک دم جاگ پڑا۔ کھڑکی کے باہر روشنی کا غبار سا اڑنے لگا تھا۔ اور آسمان پر سپیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا۔ اس نے دتین بار آنکھیں ملیں۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ماند پڑتے پھیکے ستاروں کو دیکھتے ہوئے وہ اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا۔ جس کے ساتھ وہ ابھی ابھی وادیوں مرغزاروں اور چشموں پر گھوم رہا تھا۔ اور جس کے بالوں میں سیدب کا گچھا تھا۔ اور جس کے ہونٹوں پر محجوب تبسم تھا۔ وہ لڑکی کلاٹوم نہیں تھی۔ وہ چشپے والی چرواہن تھی۔ جو آج صبح اُسے یوکلپٹس کے درختوں میں ملی تھی۔ اُس نے لیپ روشن کیا۔ رات کلاٹوم کو لکھا ہوا طویل خط شروع سے لے کر آخر تک پڑھا۔ چہرہ پہن کر سرخ منظر گلے کے گرد لپیٹا۔ لیپ بچھایا۔ اور سیر کے لئے باہر چل پڑا۔

باہر ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ ابھی مشرقی افق پر سپیدہ سحری نمودار ہو رہا تھا۔ ابھی ستاروں کے فانوسوں کو ایک ایک کر کے بجھنا تھا۔ ابھی ہمالیہ کی برف آلود پیشانی پر سے مہری کرنوں کو طلوع ہونا تھا۔ ابھی بہت

کچھ ہونا تھا۔ ابھی تو سیدب کے شگوفے نیند میں تھے۔ اور ان کی پلکیں بند تھیں اور چنار کی ٹہنیوں پر سے اوس ٹپک رہی تھی۔ فیصل کے پھیپھڑوں میں جو ہوا داخل ہو رہی تھی۔ اُس میں شبنم کی تازگی، سبزے کی رطوبت، پھولوں کی مہک اور برف کی خشکی تھی۔ یہ ہوا اُسے شہروں میں کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس ہوا

میں "اے" سے لے کر "زید" تک سارے وٹامن موجود تھے۔ اس میں پٹروں کی بو نہ تھی۔ سڑکوں کی گرد نہ تھی۔ بازاروں کا شور و غل نہ تھا۔ گلیوں کا تعفن نہ تھا۔ گندے خیالات کے بیج نہ تھے۔ اور غیر طبعی خواہشات کے جراثیم نہ تھے۔

یہ نیچر کی لطیف روح تھی۔ پہاڑ پر آکر ہر شے لطیف ہو جاتی ہے۔ اپنا آپ عریاں کر دیتی ہے۔ فیصل اپنے تئیں پھول کی طرح ہلکا ہلکا محسوس کر رہا تھا وہ مشرقی مرغزاروں میں دُور تک گھومتا ہوا نکل گیا۔ اس کے ارد گرد چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ گہری خاموشی تھی۔ اس نے اس سے پیشتر اس قدر نیلا

آسمان اور شفاف ستارے کبھی نہ دیکھے تھے۔ شہر کا آسمان ہمیشہ دھوئیں اور گرد کی غلیظ چادر میں لپٹا رہتا تھا۔ اور ستاروں پر راکھ سی اڑا کرتی تھی۔

پہاڑوں پر اس قدر سن کہاں سے آجاتا ہے؟ اس حسن کا ذکر انجینئرنگ کالج کی کتابوں میں کیوں نہیں ہے؟ وہ کاؤ کے گھنے۔ تناور اور عظیم الشان درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا..... ان درختوں کی پُر وقار خاموشی پر دفیروں کے دھواں دار لیکچروں سے زیادہ گہری اور زیادہ پُر اثر تھی۔ درختوں کے پُر سکون اور بے الفاظ لیکچر اُسے عظمت، بزرگی اور نیچر کے ساتھ

ہم آہنگی کا سبق دے رہے تھے..... اور اُن کی بے آواز گفتگو میں اتھڑ کی لطیف نغمگی تھی۔ اور ندیوں کا ترنم تھا۔ اور گرتی ہوئی شبنم کی سرگوشیاں تھیں!

ان مرغزاروں کا لمبا چکر کاٹ کر فیصل ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی پر ہو لیا۔ جو چڑ کے درختوں میں گھرے ہوئے سبز تنے کا چکر کاٹ کر موضع

چندن کوٹ کی بستی سے ہوتی ہوئی اوپر اس کے مکان کی جانب نکل گئی تھی۔  
 اب رات کا تاریک طسم ٹوٹ رہا تھا۔ صبح کی بڑھتی پھلتی دودھیا روشنی  
 میں ستارے ماند پڑ رہے تھے۔ اور درختوں کے پھنڈوں میں چڑیاں چہچہا  
 لگی تھیں۔ اور گھاس پر ہرے ہرے ٹڈوں نے پھدکن شروع کر دیا تھا  
 اور مھیکڑ کی جھاڑیوں میں خرگوش بھاگتے دوڑنے لگے تھے۔ فیصل ٹیلے کا چکر کاٹ کر  
 سبز تلے پر آیا۔ تو دن نکل آیا تھا۔ گول گول سورج کا لٹخ تھا۔ برف پوش بلندیوں سے  
 طلوع ہو رہا تھا۔ اور آسمان لالہ زار بن گیا تھا۔ ہرے ہرے طوطوں کے جھنڈ  
 میں میں کرتے پھلدار باغات کا رخ کر رہے تھے۔ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے  
 ٹکڑے جو ایک لمحہ پہلے دودھیا تھے۔ اور گلابی ہو گئے تھے۔ اب گہرے قرمزی  
 ہو رہے تھے۔ ہمالیہ کی شفاف، کنواری برف پر لگیلا ہوا سونا بہہ رہا تھا۔ نیچے  
 وادیوں میں ندی نالوں کی پتلی اور پیچ دار لکیروں کے منہ شہابی ہو رہے تھے۔  
 گھاس پر اس کے موتی چمک رہے تھے اور ہر موتی میں ان گنت سورج جگمگا  
 رہے تھے۔ دھوپ کی رنگت میں پکے ہوئے سبب ایسا سنہری پن تھا۔ اور چائے  
 کی بھاپ ایسی پُر سکون گرائش تھی۔ اس نے چپڑ کے ٹن کھول دیئے۔ اور لمبے لمبے  
 گہرے گہرے سانس کھینچنے لگا۔ سانس لیتے وقت فیصل ہوا کی تازگی اور نکھار  
 محسوس کرتا۔ لیکن چھوڑتے وقت اُسے یوں محسوس ہوتا۔ گویا وہ ہوا اس کے  
 پھیمپھروں سے نہیں۔ بلکہ کسی مُنہ در مُنہ بھرے ہوئے سینا باؤس سے نکل رہی  
 ہے۔ بادلوں کے ٹکڑے جو پہلے قرمزی تھے۔ اب گلابی ہو رہے تھے۔ اور اس کے  
 بعد انہیں پھر اصلی رنگت پر آنا تھا

پہاڑوں پر سورج کس قدر اہتمام سے طلوع ہوتا ہے۔ یہاں دن نکلنے کا ایک  
 جشن منایا جا رہا ہے۔ جس میں اگر پہاڑوں کی شفاف برف حصہ لیتی ہے۔ تو گھاس  
 میں چھپ کر اُچھلنے والا ٹڈا بھی شریک ہوتا ہے۔ شہر میں اُس نے کبھی سورج  
 نکلنے نہ دیکھا تھا۔ وہ جس وقت بیدار ہوتا تھا۔ دھوپ اس کے آدھے کمرے

کو ڈھانپے ہوتی تھی۔ اور بازار میں تانگوں موٹروں اور لوگوں کا شور مچ رہا  
 ہوتا تھا۔ بستر پر آنکھ کھلتے ہی اُس کا سب سے پہلا کام سر ہانے کے نیچے سے  
 سنگریٹ کیس نکال کر سنگریٹ سلگانا ہوتا تھا۔..... یہاں بھی اس کی جیب میں  
 پائپ موجود تھا۔ لیکن وہ اُسے سلگاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ کوئی غیر محسوس طاقت  
 اُسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ اُسے خواہ مخواہ یقین سا ہو گیا تھا۔ کہ وہ  
 کسی بہت بڑی مسجد کے صحن میں گھوم رہا ہے۔ اور اس کے پائپ سلگاتے ہی پھول  
 مردہ پرندوں کی طرح درختوں پر سے گر پڑیں گے۔ اور میٹھی بولیاں بولنے والے  
 رنگین پرندے دم گھٹ کر مرجائیں گے۔ اور دھوپ کا سنہری پن غائب ہو جائے  
 گا..... اور فضا کا سارا احسن، سارا تقدس، سارا طسم ٹوٹ جائے گا۔ فنا ہو  
 جائے گا۔

ایک چھوٹی سی ندی ٹیلے کے گرد گھوم کر نیچے وادی میں چلی گئی تھی۔ ندی کا  
 پانی کافی تیز تھا۔ اور نوکیلے، گول، چورس، بھورے، سیاہ، ٹیلیے اور  
 نیلے نیلے پتھروں سے ٹکرا کر گزر رہا تھا۔ فیصل نے دونوں ہاتھ ندی کے سرد  
 سرد پانی میں ڈال دیئے اور آنکھوں پر ہلکے ہلکے چھینٹے مارنے لگا۔ اس کی  
 آنکھیں ایک دم گرم ہو گئیں۔ اور اُن میں سے سینک سا اُٹھنے لگا۔ اُسے ہر  
 شے پہلے سے زیادہ شفاف اور نکھری ہوئی دکھائی دینے لگی۔ ندی کے اوپر  
 ایک جگہ چنار کے ناتراشیدہ کندے ڈال کر ٹپل بنایا ہوا تھا۔ وہ پل عبور کر کے  
 ایک بہرے بھرے چھوٹے سے مرغزار میں آ گیا۔ جس کی ایک طرف ڈھلوان پر  
 دھان اور مکئی کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ قریب ہی دس بیس اک منزلہ کچے  
 مکانوں میں سے کہیں کہیں دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اور کسی بھی نیس کے ڈکرانے کی  
 مسلسل آواز آرہی تھی۔ ان مکانوں کے اوپر فیصل کو اپنے مکان کا مصرف  
 دودکش ہی دکھائی دے رہا تھا۔ جس میں سے پھیکے رنگ کے دھوئیں کی  
 باریک نکیر سی باہر نکل رہی تھی۔ اُس نے اُوچی نیچی گھاٹیوں میں اچھی خاصی آواز

گردی کر لی تھی۔ اور اپنے باورچی خانے میں سے دھواں نکلتے دیکھ کر اس کی بھوک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ چڑھائی دشوار گزار نہیں تھی۔ وہ بڑی آسانی سے پہاڑی راستے پر اُپر چلا جا رہا تھا۔ بستی کے مکانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو دیکھا۔ جو آنگن میں شہتوت کے پیرتلے بیٹھی بکری کا دودھ دوہ رہی تھی۔ بکری بڑے اطمینان سے ہرے ہرے پوے کھا رہی تھی۔ ایک دوسرے مکان کے باہر چند ایک نوجوان عورتیں چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ اور ایک دوسری کی جوئیں نکال رہی تھیں، قریب ہی ایک بچہ زمین پر بیٹھا رو رہا تھا۔ اور ایک چٹکیرے داغوں والا کتا اپنی اچھل کود سے اُسے اور زیادہ تنگ کر رہا تھا۔ ایک مکان کی چھت پر بوڑھا آدمی منڈیر کے ساتھ لگا حقہ گرو گڑا رہا تھا۔ ذرا پر سے بھینس بدستور ڈکرا رہی تھی فیصل نے سوچا۔ انسان کا وجود دشمن کا محرک بھی ہے۔ اور اُسے تباہ بھی کرتا ہے۔ جہاں چار آدمی مل بیٹھیں، وہیں دھان کے خوشے بلبھانے لگتے ہیں اور ناشپاتی کی ٹہنیوں پر شگوفے پھوٹ نکلتے ہیں اور دھوپ میں چمکتی ہوئی سبز گھاس پر سپید سپید بھیریں ابر پاروں کی طرح ٹپٹپٹے لگتی ہیں اور وہیں گندی نالیاں بن جاتی ہیں۔ اور گندی گھسے ڈھیر سڑنے لگتے ہیں۔ اور عورتیں آگے پیچھے بیٹھ کر جوئیں نکالتے لگ جاتی ہیں، دنیا میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے۔ جہاں انسان صرف حسن تخلیق کرتا ہو۔ اور صرف حسن ہی کے لئے محنت کرتا ہو؟ انجینئرنگ کالج کی کتابوں میں ایسی کسی جگہ کا ذکر نہیں تھا، فیصل کو محسوس ہوا کہ وہ انجینئرنگ کالج میں محض جھک مارتا ہے۔ اور جب وہ دہاں سے باہر نکلے گا۔ تو خود ایک مشین بن چکا ہوگا۔ اور مشینیں حسن کی دشمن ہیں۔۔۔۔۔ اور کائنات کا مقصد حسن کی تخلیق اور اس کی پرستش ہے۔ یہ مقصد گرو گڑا تے ہوئے ٹینک میں نہیں۔ چنار کے چپ چاپ درخت میں ہے۔ بادشاہ کے عیسے میں نہیں۔ چستے کی تہہ میں ڈوبے ہوئے پتھر میں ہے۔ سپہ سالار کی ٹوپی میں لگی ہوئی کلنی میں نہیں ہے۔

لیکن گہری کھڑ میں اُگی ہوئی گھاس میں ضرور ہے۔ ہوگا۔۔۔۔۔ ضرور ہوگا۔ لیکن اواندھے فلسفی ذرا اُپر تو دیکھ! اُپر سے ایک لڑکی سر پر گارگر رکھے نیچے اتر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گارگر تھام رکھی تھی۔ اور یوں سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھ رہی تھی۔ جیسے ڈھلوان پر پھسلن ہو۔ اس کے بازوؤں کی اُپر اٹھی ہوئی کمانوں میں سے نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ جب وہ قریب آئی۔ تو فیصل نے اُسے فوراً پہچان لیا۔ وہ چشے والی چرواہن تھی۔ اُس نے اُسی روز والا لمبا نیلا کرتہ پہن رکھا تھا۔ اور وہ پاؤں سے ننگی تھی۔ اور بھوری کلائیوں میں چاندی کے کنگن تھے اور نیلی نیلے آنکھوں میں پراسرار گہرائیاں بھانک رہی تھیں۔ داہنے گال پر سے پانی کی لکیر سی بہہ کر گرتے میں جذب ہو رہی تھی۔ اور سنہری بالوں کی ایک لٹ شہابی زہار سے چمٹ گئی تھی۔ اُس نے بھی فیصل کو دیکھا۔ اور فوراً پہچان گئی ہوگی۔ اور سوچ رہی ہوگی۔ کہ یہ وہی لڑکا ہے۔۔۔۔۔ وہی پردیس ہے۔ جو اس روز اُسے چشے پر ملا تھا۔ اور جس نے شہرِ اکی کی رسی تھام کر اُسے اوپر کھینچ لیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے تھے۔ لیکن دونوں خاموش تھے۔ اور دونوں کے ہونٹ بند تھے اور دونوں اجنبیوں کی مانند ایک دوسرے کے قریب سے گزر گئے اور دونوں نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکنیں محسوس کیں۔ اور دونوں کے ہونٹ ایک لمحہ کے لئے پکپکائے اور انہوں نے ایک دوسرے سے پوچھنا چاہا۔

”ہم اس کے بعد کہاں ملیں گے؟“

مگر وہ چپ چاپ گزر گئے۔ لڑکی نیچے بستی کی طرف اترنے لگی۔ اور فیصل اُپر اپنے مکان کی طرف چڑھنے لگا۔ کائنات کے وسیع خلاؤں میں قرن ہا قرن سے گردش کرتے ہوئے دو ستارے لحظہ بھر کے لئے ایک دوسرے کے قریب آئے۔ اور پھر بچھڑ گئے۔۔۔۔۔ جانے پھر کب ملاپ ہو!

اوپر پہنچنے پر اُسے گرمی لگنے لگی۔ اور ملتے پر پسینہ آ گیا۔

اُس نے کمرے میں جا کر سیٹر اتارا۔ مفکرہ صوفے پر بھینکا۔ بوٹ اتار کر چل پہنی۔ اور کرسی نکال کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ اور کلثوم کو لکھا ہوا خط لفافے میں ڈالنے لگا۔ چوکیدار تھوڑی دیر بعد ناشتہ وغیرہ لے آیا۔ فیصل نے پوچھا۔  
 ”یہاں ڈاک کا کیا انتظام ہے چوکیدار؟“

”جناب! ہفتے میں ایک بار علی جان یہاں سے خط اکٹھے کر کے نیچے لکھم پور لے جاتا ہے اور وہاں سے اوپر کی ڈاک لے آتا ہے۔“

”وہ کب نیچے جا رہا ہے؟“

”شاید برسوں جائے گا۔“

فیصل چائے پیتے ہوئے سوچنے لگا۔ اگر برسوں خط ڈاک میں ڈالا گیا۔ تو کلثوم کو تیسرے دن شام کو ملے گا۔ اور اگر چوتھے روز کلثوم نے خط ڈاک میں ڈال دیا۔ تو ساتویں روز شام کو لکھم پور پہنچے گا۔ اور آٹھویں روز اُسے ملے گا۔۔۔۔۔ مائی گاڈ! تاہم اس نے چوکیدار کو علی جان کی روانگی کا دن معلوم کرنے کے لئے کہہ دیا۔ چائے پی کر اس نے لفافے پر ٹکٹ چسپاں کئے۔ پتہ لکھا اور پائپ سلگ کر ٹانگیں پھیلانیں۔ اور مزے مزے تمباکو کے خوشگوار کش لینے لگا۔

وہ نیم وا آنکھوں سے لفافے پر کلثوم کا ایڈریس پڑھ رہا تھا۔ اور اس چروا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو اُسے آج دوسری مرتبہ ملی تھی۔ اور جس کے دانے کال سے سنہری بالوں کی ایک لٹ چمٹی ہوئی تھی۔ اور جس کے بازو اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔

پوری دو پہر وہ کھلے آسمان تلے، چمکی دھوپ میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ گنجان درختوں میں سے گزرتے ہوئے اُس نے چیر اور چناروں کی خوشبو سونگھی۔ مرطوب سبزہ زاروں میں اُس نے بہار کو پھولوں کا منہ چومتے دیکھا۔ اُھلوانی چراگاہوں پر اس نے روئی کے گالوں ایسی سپید سپید بھڑوں کو گردنیں جھکائے چرتے دیکھا۔ اور عقیق گھائیوں میں سے گزرتے ہوئے اس نے نوزائیدہ بچوں کو ابریشمی پلکیں جھپکاتے دیکھا۔ اور سنگین چٹانوں کی عظیم خاموشی محسوس کی۔ اور اب وہ تھکی ہوئی ٹانگیں پھیلانے برآمدے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اور اس کا پائپ بجھ گیا تھا۔ اور اس نے دیا سلائی اٹھانے کے لئے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور اس کی نگاہیں اوپر اٹھیں۔ اور وہ دیا سلائی اٹھانا بھول گیا۔ اور پائپ منہ سے نکال کر نیلی آنکھوں والی چرواہن کو پتھر کی سیڑھیاں اترتے دیکھنے لگا۔ چرواہن کے سر پر کانسی کی چھوٹی سی جاکر تھی۔ اور سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ اور شفق کی روشنی میں چرواہن کے سنہری بال شعلوں کی طرح دمک رہے تھے۔ اور چہرے پر ایک اور سورج طلوع ہو رہا تھا۔ فیصل کرسی پر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور اس نے ٹانگیں لٹھی کر لیں۔ چرواہن اس کے پاس آ کر گاگر زمین پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ اور بچوں کی طرح معصوم سا چہرہ بنا کر بولی۔

”چوکیدار نے دودھ کے لئے کہا تھا جی..... آج ذرا دیر ہو گئی ہے۔“



ہماری بھینس بڑی ضد کرتی ہے۔ کل سے جلدی لایا کروں گی؟

فیصل نے محسوس کیا۔ کہ چرواہن کی آواز اس کی آنکھوں سے زیادہ چپکلی اور شفاف تھی۔ اور اس میں بارش کے اُس پہلے قطرے کا ترنم تھا۔ جو کسی پھول کی پتی پر سے پھسل کر جھیل کی سطح پر گرتا ہے۔۔۔۔۔ چرواہن فیصل کو اپنی طرف گہری نگاہوں سے دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی تھی اور حیا آلود معصوم پلکیں جھکا دیے تھیں۔ وہ اس کے گانگے کے باہر چھلکا ہوا دودھ پونچھ رہی تھی۔ فیصل نے کہنا چاہا۔ ”چرواہن! پلکیں اُپر اٹھاؤ۔ دیکھو سورج غروب ہو رہا ہے۔ اور چراگاہوں پر اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ اور وادیاں گھروں کو لوٹتے ہوئے چرواہوں کے نغموں سے گونج اُٹھی ہیں۔ آؤ شام ہونے سے پہلے ہم اپنی محبت کو گلاب کی کلیوں کا تاج پہنائیں اور اس کی پلکوں پر چشمتے کا نرمل پانی چھڑکیں۔ اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر صنوبروں کے جھنڈوں میں نکل جائیں۔ اور رات کی خموشی میں پھولوں پر اوس کی کہکشاں بچھنے کا منظر دیکھیں۔ اور درختوں کی بے زبان گفتگو سنیں۔۔۔۔۔“ لیکن اس نے کہا۔

”چرواہن! تمہاری بھینس بہت ضد کرتی ہے کیا؟“

چرواہن نے پلکیں جھپکا کر کہا۔

”ہاں جی!۔۔۔۔۔ وہ بہت ضدی ہو گئی ہے۔ ابھی ابھی میں اس کا دودھ دوہنے لگی تھی۔ تو اس نے ایک دم ٹاپنا شروع کر دیا۔ میں تو جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔۔۔۔۔“

”اچھا؟“ فیصل نے یونہی حیران ہو کر کہا۔ ”پھر تو یہ بھینس بڑی خطرناک ہے۔ تمہیں اس سے بچ کر رہنا چاہیئے۔“

”نہیں جی! پھر وہ اپنے آپ مان بھی تو جاتی ہے۔“

چرواہن نے یہ جملہ بڑے بھولپن سے کہا اور پھر خود ہی شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ فیصل نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”چرواہن! میں نے۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں اس روز چشمتے پر بھی دیکھا تھا۔“

”ہاں جی! وہاں ہمارا چھوٹا سا باغ ہے۔“

”چرواہن!۔۔۔۔۔ تم اس روز گاگرا اٹھائے نیچے اتر رہی تھیں نا؟“

”وہ میں پانی لا رہی تھی جی۔۔۔۔۔ مجھے روز چشمتے سے پانی لانا پڑتا ہے۔“

چرواہن! تم چشمتے پر۔۔۔۔۔“

جی میرا نام چرواہن نہیں لاتی ہے۔“

”لا جی!۔۔۔۔۔ لاتی تم روز دودھ لایا کرو۔“

چوکیدار نے بھی یہی کہا تھا جی!۔۔۔۔۔ برج ذرا دیر ہو گئی ہے۔ کل میں ی لے آؤں گی۔“

لوڑھا چوکیدار چادر کی لٹکل مار سے اوپر کی پگڈنڈی پر سے ہوتا ہوا نیچے مکان میں آیا۔ اور لاتی کو دیکھ کر بولا۔

”اری مرجانی! پہلے ہی روز اتنی دیر کر دی۔“

بابا! آج معاف کر دو۔ کل جلدی آؤں گی۔“

اور لاتی معصومیت سے مسکرانے لگی۔ چوکیدار منہ ہی منہ میں کچھ بولتا ہوا باؤڑی میں اندر گیا۔ اور اندر سے جگ لاکر اس میں دودھ کو ڈلوانے لگا۔ دودھ

ہوئے لاتی ذرا آگے کو جھک آئی تھی۔ اور اس کے منہری بالوں کی ایک پسسل کر گلابی رخسار پر لگنے لگی تھی۔ فیصل کا جی اس منہری لٹ کو جو منہ کو

رہا تھا۔ لیکن چوکیدار لاتی کے سر پر کھڑا تھا۔ اور ابھی دن کی روشنی باقی تھی طرح گاگرا کو گودی میں لے کر چلنے لگی۔ تو چوکیدار نے کہا۔

کل دیر نہ ہو چھوری!

اچھا جی!۔۔۔۔۔ اور وہ پتھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اور پگڈنڈی پر مڑتے

اُس نے کن آنکھوں سے برآمدے میں بیٹھے پردیسی کو دیکھا اور تیز تیز

لے ہوئے دن کو دائیں بستی کے مکانوں کی طرف اُترنے لگی اور بمبیکڑ اور

پھوٹے سے چھوٹا حادثہ اسے ختم کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ پھر کیوں نہ بانی اور الوچے کے پھولوں کے درمیان گھاس پر لیٹ کر گزارا جائے۔ کیا رکافی ہاؤس کا ملک شیک یہاں نہیں - نیلے پتھروں کے درمیان ٹھنڈی سا میں بہنے والا چشمہ تو ہے۔ کاش اس کے پاس اتنا پیسہ ہو کہ وہ کافی ہاؤس کو جلی ہوئی گرم کافی کے پہیلے حلق میں انڈیلنے والوں کو چند ن کوٹ کے لئے اور شیریں چستے پر لے آئے۔ اور ان کی عینکیں اتار کر پرے پھینک دینگیں کتابیں چین کریںچے کھڑ میں گرادے۔ اور ان کے ساتھ چستے کے بر قاب بی پنڈیلیوں تک ڈبوکر بیٹھ جائے۔ اور مانسکو کے تاریخی نظریات کی بجائے الی اون اتار نے اور پھل داردرختوں کی کاشت کے متعلق باتیں کرے!

۷-۱-۱۰

ماہی کوئی بھیڑ زور سے مینائی۔ فیصل نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بٹنگ کے چھوٹے سے درخت کے قریب چرواہا کی کھڑی ٹسکرا رہی مکی گود میں بھیڑ کا بچہ تھا۔ اور وہ ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھے

ہا میں نے دیکھ لیا تھا۔ کہ آپ سو رہے ہیں۔ اور میں آپ کو جگانا نہیں  
 سکتی۔ لیکن اس مرن جوگی کا منہ کیسے بند کرتی؟ آپ سو جائیں میں اُسے گھر  
 سے لے کر آتی ہوں.....“

میں نے اٹھ کر لالچی کے پاس آ گیا۔ وہ اس سے اس قدر قریب تھا کہ

سالبنی کی لمبی جھاڑیوں نے لاجبی کو فیصل کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ فیصل پائپ سٹگائے دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ باغ میں اندھیرا پڑ گیا۔ اور نیلے آسمان پر دیئے ٹمٹمانے لگے۔ اور پہاڑی شاموں کی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ وہ آہستہ سے اٹھا۔ اور ماچس اور تمباکو کی تھیلی ہاتھ میں لے کر اندر چلا گیا رات کو جب وہ بستر پر راز ہوا۔ اور لمپ کی روشنی میں ہارڈی کا ناول کھولا۔ تو اس کی آنکھوں میں لاجبی کی تصویر بچھرنے لگی۔ لمبی پلکوں کے سائے میں لیٹی ہوئی دو نیلی جھیلیں سونے کے تاروں ایسے بال، رخسار پر جھولتی ہوئی سنہری زلف اور حیا سے سمٹا ہوا معصوم چہرہ..... جیسے پتوں میں چھپی ہوئی گلاب کی کلی..... لاجبی.....!

فیصل نے کتاب میز پر رکھ دی۔ اور لیمپ بجھا دیا۔  
دوسرے دن جب سورج پہاڑوں پر کانٹا اُپر آ گیا۔ تو فیصل سیر کرتا ہوا اُپر  
چشے کی طرف نکل گیا۔ دھوپ روز کی طرح چمکیلی تھی۔ اور دن صاف اور روشن  
تھا۔ چشے کے اُپر سپیدے کے درختوں میں پرندے گارہے تھے۔ گہرے نیلے  
آسمان میں دودھیا بلکلوں کی ایک قطار مغرب کی سمت اُڑی جا رہی تھی۔ نیچے  
چندن کوٹ کی بستی میں کوئی آدمی لکڑیاں بھاڑ رہا تھا۔ چشے پر یو کلیئس کا ٹھنڈا  
سایہ تھا۔ اور گہری چھاؤں تھی۔ اور امن و آسودگی تھی۔ اس نے پتھروں پر جھک  
کر چشے کا شیریں اور سرد پانی پیا۔ اور درختوں کا جھنڈ عبور کر کے پرلی طرف باغ  
کی جانب نکل آیا۔ گھاس کا چھوٹا سا قطعہ تھا۔ جس کے ارد گرد بے شمار پھل دار  
درخت قطار اندر قطار اُگے تھے۔ بعض درختوں پر پھول لگ رہے تھے۔ فضا  
..... میں دھوپ کی خوشگوار حدت۔ پھولوں کی بھیجی بھیجی مہمک اور شہد کی مکھیوں  
کی جھنبھناہٹ تھی۔ فیصل نے پائپ سٹکایا۔ اور وہیں گھاس پر بیٹھ گیا۔ پُر سکون  
دھوپ اس کے شانوں کو تھپتھپانے لگی۔ اور اس کی آنکھیں خمور سی ہو گئیں۔ وہ  
ٹانگیں پھیلا کر گھاس پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور خاموش فضا میں

چرواہن کی بھوری گردن پر سیاہ تل دھڑکتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس کے مضبوط جسم سے اٹھتی ہوئی کچے مکھن ایسی بو اس کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ لاجی کی نیلی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ اور اس کی گردن خود بخود جھک گئی۔ اور وہ بھڑکے بچے کی لپٹم پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ فیصل نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ہاتھ کھردرا اور مخنتی تھا۔ اور فیصل اس سے خون کی حدت اپنے جسم میں پھیلتی محسوس کر رہا تھا۔ چرواہن ایک دفعہ سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گئی۔ اور اس کے پکے ہوئے گلابی ہونٹ تھڑھرائے اور بھڑکنا بچہ خود بخود اس کے ہاتھ سے نیچے کود گیا۔ اور اس کا سونے کے تار در سے بنا ہوا سر فیصل کے سینے سے آن لگا۔ اور فیصل نے اپنے ہونٹ اس کی نازک گردن کے سیاہ تل پر رکھ دیئے اس کے ہونٹ جل رہے تھے۔ اور گردن کا تار دھڑک رہا تھا۔ اور اس کے پچھے ہوئے لیے کرتے میں گھاس کی بو تھی۔ دودھ جھک تھی۔۔۔۔۔ فیصل کا ہاتھ اس کی کمر کے گرد تھا۔ اور اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اور سانس پھول گیا تھا۔ اور نیلی آنکھیں بوجھل سی ہو کر بند ہو رہی تھیں۔ اور وہاں کوئی خوبانی کا درخت اور گھاس کا قطعہ اور بھڑکنا بچہ اور نیلے پتھروں کا چشمہ نہ تھا۔ پہاڑ ان کے نیچے سے کھسک گیا تھا۔ اور آسمان اُپر سے ہٹ گیا تھا۔ وہ کہاں تھے؟ وہ کہاں تھے؟

ایک ایک دھماکا سا ہوا۔ اور لاجی پردیسی کی آغوش سے تڑپ کر نکلی بھاگتی ہوئی بنگ کے درختوں کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ اپنی ماکن کو بھہر کر بھڑکنا بچہ بھی اس کے پیچھے اچھلتا کودتا درختوں میں جا کر گم ہو گیا فیصل اپنی جگہ پر ثبت بنا کھڑا تھا۔ اس کے پاس ناشپاتی کے شگوفوں شہد کی مکھیاں منڈلاتی رہی تھیں۔ اور چشمے والے درختوں پر پرندے چہرے تھے اور سبز گھاس پر دھوپ چمک رہی تھی۔ ایک لمحہ پہلے کچھ نہیں اور دوسرے لمحے سب کچھ موجود تھا۔ ہائے یہ لمحات شعبہ بازی! اور

گھاس پر سے اپنا پائپ اٹھایا۔ اور سست قدم اٹھاتا اپنے مکان کی جانب چل پڑا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ چند سیکنڈ پہلے نیلی آنکھوں۔ منہری بالوں اور سبب ایسے گالوں والی کو ہستانی دوشیزہ اُس کی آغوش میں تھی۔ کبھی کسی نے بادل کے ٹکڑے کو اپنی آغوش میں نہیں لیا۔ اور سورج کی کرنوں کے گرد بازو حائل نہیں کئے۔ اور لاجی کا جسم بادل کے ٹکڑے اور سورج کی زریں کرنوں کے لطیف امتزاج سے تیار ہوا تھا۔

تمام دن فیصل اپنے جسم میں چرواہن کے صحت مند خون کی حرارت اور اس کے بدن کا گداز تناؤ محسوس کرتا رہا۔ شام کو اسے دودھ بے کمر آنا تھا۔ لیکن وہ نہ آئی۔ اُس کی بجائے ایک لڑکا آیا۔ اور دودھ دے کر واپس چلا گیا۔ چونکدار کے پچھنے پر اُس لڑکے نے صرف اتنا بتایا۔ کہ لاجی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ فیصل نے کتاب پڑھتے ہوئے یہ سنا اور اس کا جی چاہا۔ کہ وہ کتاب پھینک کر لڑکے کے پاس جائے اور اس سے خود پوچھے۔

”وہ کیوں نہیں آئی؟ وہ کب آئے گی؟“

وہ اگلے دن بھی نہ آئی۔ اور اس سے اگلے روز بھی نہ آئی۔ اور فیصل کو چندن کوٹ کی وادی سے بہار رخصت ہوتی محسوس ہونے لگی۔ اور وہ دن میں کئی بار چشمے پر جاتا۔ اور اس کے ساتھ والے باغ کی گھاس پر آنکھیں بند کر کے لیٹا رہتا۔ اس انتظار میں۔ کہ شاید کوئی بھیڑ کا بچہ اچانک میا اٹھے۔ اور وہ ایک دم آنکھیں کھول دے۔ اور اس کے سامنے خوبانی کے شگوفوں کے سائے میں چرواہن بھیڑ کا بچہ اٹھائے کھڑی ہو۔ اور اس کے سنہری بال گالوں پر اڑ رہے ہوں۔ اور نیلی آنکھوں میں معصومانہ شوخی ہو۔ اور ہونٹوں کی پتیاں نیم وا ہوں اور قدرے گھبرائے ہوئے لمبے میں کہے۔

”کیا کر رہی ہو؟“

”جی میں آپ کو جگانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس مرن جوگی.....“

مگر وہ گھنٹوں مرطوب گھاس پر پھپھو لوں کے درمیان لیٹا رہا۔ اور کسی چرواہن نے اُس کی خبر نہ لی۔ اور چپکے سے قریب آ کر اُس کی بند پلکوں پر اپنے ہاتھ نہ رکھے۔ اب اُسے خوش الحان پرندوں کے چہنچہوں پر ریلوے گھر کے بے ہنگم شور کا گمان ہوتا تھا۔ اور اس کے تمباکو میں سے خوش گوار فلیو جاتا رہا تھا۔ اور چند روز پیشتر سنہری دھوپ میں چمکتی وادیوں پر اب ہر وقت دھندلاؤ تھا۔ کہہ سنا چھایا رہتا تھا۔ اس دوران میں اُسے کئی بار اُداس آنکھوں والی کلمش کا خیال آیا۔ اور اُسے ہر بار کچھ یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ زمین پر جھکا۔ بجھے

ہوئے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا رہا ہو۔ اور دھوپ میں لیٹا برسات کا خواب دیکھ رہا ہو۔ اور تمباکو کا تازہ ڈبہ کھولتے ہوئے پُرانے خالی ڈبوں کے متعلق سوچ رہا ہو۔

کلمش کے خیال کے ساتھ ہی لمبے چوڑے ویران ڈرائینگ کمروں، ٹوٹے برشوں، کریپ سول کے منیڈلوں اور قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانوں اور دھول اڑاتی کاروں اور رچی ہوئی کافی کا خیال آ جاتا۔ اور وہ جلدی سے چشمے کے برفاب کے دو گھونٹ پیتا اور نیلے پتھروں پر نیم دراز ہو کر سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں کے تصور میں کھو جاتا۔ لمبی پلکوں والی چرواہن کے خیال میں قوس قزح کے رنگوں اور ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کے تقدس کا امتزاج تھا۔ اس میں کلیوں کی حیا اور تیلیوں کی شوخی اور چشمے کی روانی تھی، لیکن وہ چشمہ کہاں تھا؟ وہ تلی کن خیابانوں میں کھو گئی تھی۔ اور وہ کہستانی کلی کون سے کنج میں پھنپ گئی تھی؟

چوتھے روز اُس نے چرواہن کو چشمے پر دیکھا۔ وہ چشمے پر جھکی گا کر میں پانی بھر رہی تھی۔ اور دن بے حد روشن تھا۔ اور درختوں میں پرندے بہار کے نغمے الاپ رہے تھے۔ وہ جھاڑیوں اور پتھروں میں سے ہوتا ہوا چشمے پر گیا اور چرواہن کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ چرواہن نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور اس کے معصوم چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے گردن جھکالی۔ اور فیصل چشمے پر جھک گیا۔ اور پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور پانی کی ننھی مٹی لہروں سے کھیلنے ہوئے بولا۔

”تم نے آنا کیوں چھوڑ دیا لاجی؟“

لاجی کچھ نہ بولی اور گاگر پانی میں ڈوبنے لگی۔ جب وہ پانی سے بھری ہوئی گاگر باہر نکالنے لگی۔ تو اس کا گنگن کانس کی گاگر سے ٹکرا گیا۔ فیصل نے لاجی کا کھڑا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور آہستہ سے بولا۔

..... نہیں لاج! ہم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ محبت بہار۔

لاہجہ کی شہرہ آفاق آواز ڈوب سی گئی۔ اور فیصلہ نے اس کی پلکوں کو چومّا۔  
 ابروؤں کو چومّا۔ کانوں کی باریک بالیوں کو چومّا۔ گردن کے سپاہ تل کو چومّا۔  
 اور سخت ہاتھوں کو چومّا۔ کھردری اور بھدی انگلیوں کو چومّا۔ اور اس کے ہنٹ  
 مخمور ہو گئے۔ اور آنکھیں اپنے آپ بند سی ہونے لگیں۔ اور اس نے خواب ایسے  
 عالم میں لاہجہ کو گا کر اٹھانے میں مدد دی اور اوپر پتھروں کے پاس کھڑا چروان  
 کو ڈھلوان پگھنڈی پر سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے دیکھتا رہا۔

چندن کوٹ کی وادی میں بہا را اپنے جوہن پر تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں شیریں پھلوں کے بوجھ سے جھکنے لگی تھیں۔ اور میٹھی خوبانیوں کا رنگ سنہری ہو گیا تھا۔ چشموں کا سرد پانی کھیتوں اور باغوں میں سے گزرتے ہوئے نیلے نیلے گول تپھڑ سے ٹکراتا اور جلتے رنگ سے سج اٹھتی اور چناروں کے جھنڈ میں رنگین پرندے دن بھر چہچہایا کرتے۔ رات کو نیلے آکاش پر چمکیلے ستاروں کے پھول کھلتے۔ تو خشک

لگتی۔ اور فیصل اُس پر جھک جاتا۔ اور اپنے ہونٹ اُس کی گردن کے دھڑکتے ہوئے سیاہ تل پر رکھ دیتا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اُن کے دھونکنی کی مانند چلتے ہوئے سانس اور گرم دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو جاتیں۔ لاجی کے منہری بال بالے کی شکل میں اس کے سر کے گرد گھاس پر پیچھے ہوتے۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے فیصل کا سر تھام لیتی۔ اور اس کے بالوں میں نگلی سی کرنے لگتی۔ پھر وہ اسے زور سے گدگداتی فیصل ایک دم سمٹ سا جاتا۔ اور لاجی مچھلی کی طرح تڑپ کر ایک طرف لٹھک جاتی۔ اور فوراً اٹھ کر قہقہے لگاتی بھاگنا شروع کر دیتی۔ فیصل ہم ہما کر اٹھتا۔ اور پوری تیزی سے لاجی کے پیچھے بھاگنے لگتا۔ لیکن دقت اس سے زیادہ تیز رفتار سی سے بھاگ رہا تھا۔ اڑا جا رہا تھا۔ اور اُسے کوئی فیصل کوئی لاجی نہ پکڑ سکتی تھی۔

ایکھ کی فصل کاٹی جا چکی تھی۔ کہ چندن کوٹ کے ایک بوڑھے گڈریئے نے اپنی بیٹی کا بیاہ رچا دیا۔ اس رات گاؤں والوں نے رت جگا منایا اک منزلہ کچے مکانوں کے آگے گھاس کے ہموار تلے میں آگ کا الاؤ روشن کر دیا گیا۔ اور نوجوان چرواہے نہیں ڈھونڈ سکے اس کے گرد بیٹھ گئیں۔ اور پہاڑیوں کے دامن درد بھرے رخصتی کے گیتوں سے گونجنے لگے۔ لاجی نے اُس رات فیصل کو چستے پر آنے کے لئے کہا تھا۔ فیصل گرم چمڑے سے کندھے ڈھانپنے بہت پہلے چستے کے پتھروں پر جا بیٹھا، جس وقت لاجی اوپر آئی۔ گنجان درختوں کے عقب میں ہلکی روشنی کا مدھم سا غبار پھیل رہا تھا۔ اور گول گول سرخ چاند ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں پر طلوع ہونے والا تھا۔ وہ دونوں اوپر کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر نیچے الاؤ کے گرد بیٹھی ہوئی چرواہوں کے گیت سنتے رہے۔ الاؤ میں زرد زرد شعلوں کی زبانیں اوپر کو اُٹھ رہی تھیں۔ اور وادی میں دھوئیں کا ایک ستون سا بن گیا تھا۔ آگ کی دھیمی روشنی میں حلقہ باندھ کر بیٹھی ہوئی عورتوں کے چہروں پر گلاب کے پھولوں کا لگان ہو رہا تھا۔ گیتوں کے لیے اور سو گوارا سر کو بہتانی رات کی سنگین خاموشی میں گہرے شگاف سے ڈال رہے تھے۔ فیصل نے لاجی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے

اسے اپنے ساتھ لگایا۔ لاجی کا جسم گرم تھا۔ اور اس میں سے بھنی ہوئی کٹی کی خوشبو اُٹھ رہی تھی۔

وہ دونوں ایک اُونچے سے چورس پتھر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے، رات خنک تھی۔ اور اس گرنے لگی تھی۔ فیصل نے آدھا چپٹر لاجی کے شانوں پر ڈالتے ہوئے ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد حائل کر دیا۔ لاجی نے ایک بھر بھری سی لی۔ اور فیصل کے ساتھ لگ گئی۔ فیصل نے پوچھا۔

”سردی تو نہیں لگتی ہے؟“

چرواہا نے چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں اٹھا کر فیصل کو عجیب بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور دھیمے شیریں لہجے میں کہا۔

”نہیں۔“

فیصل نے اسے اور اپنے ساتھ لگایا۔

”لاجی! اجت ٹھنڈے دلوں کو اونی مفکر کی مانند اپنی گرم لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اور پھر جی ہوئی رگوں میں منجھ خون اُبلنے لگتا ہے۔“

لاجی، فیصل کی اس بات پر نہیں پڑی۔ اور اس کے خوب صورت دانت تاروں کی مدھم روشنی میں چمکنے لگے۔

”کیوں؟ اس میں ہسنے کی بات کیا ہے؟“

”کچھ نہیں، بس یونہی ہنسی آگئی تھی۔“

”یونہی مجھے ہنسی کیوں نہیں آتی؟“

”میں کیا جانوں۔“

لاجی نے لمبی پلکیں تیزی سے جھپکاتے ہوئے یہ جملہ بڑے بھولپن سے ادا کیا۔ فیصل ایک دم کھوسا گیا۔ وہ جلدی سے بولا۔

”لاج! پھر کہو.....“

”کیا؟“

”یہی۔“

”یہی کیا؟“

”جو تم نے ابھی ابھی کہا تھا۔“

”پر دیسی! تم کتنے عجیب ہو۔ تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟“

”ہربات میں فائدہ نہیں ڈھونڈا کرتے۔“

”تو پھر ہربات کا فائدہ کیا ہوا؟“

اس جملے میں بھی وہی بھولپن اور معصومیت تھی۔ فیصل نے لاجی کو اپنے سینے سے لگایا۔ اور اس کے سنہری بالوں کے اُچھے ہوئے تار چومنے لگا۔ اس وقت چاند

کا زرد ادا اس چہرہ درختوں کے اوپر نمودار ہوا۔ اور اس کی پھکی پھکی افسردہ روشنی دیران پگ ڈنڈی پر راکھ کی مانند بچھ گئی، لاجی نے درختوں کے لمبے سیالوں کو سکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”پر دیسی! آج میری ایک سہیلی کا بیاہ ہے، منہ اندھیر سے کہا اُسے بالکی

میں بھلا کر اوپر رشی کنڈ کے گاؤں میں لے جائیں گے۔ میں سوچتی ہوں۔ ایک روز

مجھے کہا بالکی میں بھلا کر دن نکلنے سے پہلے کسی نامعلوم گاؤں کی جانب چسل

پڑیں گے..... اور میری آنکھیں غون کے آنسو روتی رہ جائیں گی۔ اور میری

چیخیں شادیانوں کے شور میں ڈوب جائیں گی.....“

لاجی کانپ گئی اور اس نے فیصل کی گرم آغوش میں منہ چھپا کر آنکھیں بند

کر لیں۔ نیچے الاؤ کی روشنی میں کنواریاں رخصتی کا گیت گارہی تھیں،

پل پل جاناں مائے

ساڈی ملی اداری مائے

کس دیس جاناں

کس دیس جاناں

فیصل نے دیکھا، لاجی چاندی کا زیور پہنے دہن بنی بالکی میں بیٹھی ہے اور

اس کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہے۔ اور گوری بائیں سرخ لمپوڑیوں نے ڈھانپ

رکھی ہیں۔ اور کلائیوں میں لال ڈوری کے کیرے لٹک رہے ہیں، وہ چادر میں سر جھکائے رو رہی ہے، اور نیلیگوں جھیلوں میں سات سمندروں کے طوفان اُٹھائے ہیں۔ اور اس کی ہیلیوں کی آنکھیں پر نم ہیں۔ اور کہا روں نے پاکی اٹھال ہے۔ اور وہ آنسوؤں، آہوں، فریادوں کی پروائے بغیر ویران گھاٹیوں کی سمت چل پڑے ہیں۔ کس دیں جاناں؟ کس دیں جاناں؟..... اس نے بے اختیار لاجی کو اپنے ساتھ چٹالیا

”نہیں..... ایسا نہ ہوگا۔ میں ایسا کبھی نہ ہونے دوں گا۔ پھر میں کیوں کر زندہ رہوں گا؟ نہیں نہیں..... میں تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔ لاج!..... میں تمہیں اپنے ساتھ شہر لے چلوں گا۔ وہاں ہمارا گھر ہے۔ میری ماں ہے اور بہنیں ہیں۔ اور وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی، بہت خوش..... چلوگی لاج؟“

لاج نے بھیگی ہلکی اٹھا کر فیصل کو عجیب والہانہ انداز سے دیکھا اور غشی سے کانپتی ہوئی خشک آواز میں کہا۔

”ہاں پردیسی! مجھے لے چلو۔“

اور اپنے محبوب کی چھاتی سے لگ کر رُک رُک کر سسکیاں بھرنے لگی۔  
”بس ٹھیک ہے، ہم کل ہی شام یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ میں صبح اُٹھتے ہی خچروں کا انتظام کرتا ہوں، سامان جو کیدار کے ہاتھ پہلے بھجوا دوں گا۔ اور دن چھپنے کا انتظار کروں گا۔ اور جب تم دودھ لے کر آؤ گی۔ تو ہم شام کے پھیلتے اندھیروں میں چندن کوٹ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں گے“  
کیوں لاج! ٹھیک ہے ناں؟“

لاج کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کے سب کچھ جیسے خواب کے عالم میں ہو رہا تھا، اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پردیسی اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔  
”پردیسی! مجھے چھوڑ مت دینا.....“

”کیسی باتیں کرتی ہو؟ تمہیں چھوڑ دینا ہو۔ تو پھر اپنے ساتھ کیوں لے جاؤ؟“

وای کل شام بالکل تیار ہو کر آنا۔ کپڑے لٹے لانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام شہر میں ہو جائے گا..... او میری لاج!.....“

دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں کھو گئے۔ اور چاند اُن کے اوپر آگیا اور چاندنی نکھر کر دودھیا ہو گئی۔ اور رشی کندھے سے آنے والے جھونکوں نے اُن محبت کرنے والی ردحوں پر جنگلی گلاب کی خوشبوؤں سے مہکی ہوئی چادر ڈال دی۔ اور چشے کی سُرل سُرل رگ گئی۔ اور نیچے وادی میں اٹھ چڑا مہنوں کے گیت مدھ مڑ گئے۔

مکان پر پہنچ کر فیصل جلدی سے اپنے بستر میں گھس گیا۔ اور شہر میں بھولی بھالی چرواہوں کے ساتھ بسر ہونے والی زندگی کے متعلق سوچنے لگا۔ کلشوم کو واقعی اس کا بڑا دکھ ہوگا۔ لیکن وہ اس سے معافی مانگ لے گا۔ اُسے آج معلوم ہوا تھا۔ کہ کلشوم کے ساتھ اس کی محبت کس قدر سطحی تھی۔ اس کے پیار میں شام کی چائے ہر روز کی ملاقات اور جنسی تشنگی کا ہاتھ تھا۔ اور پھر کلشوم اکثر بیمار رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے۔ شادی کے بعد اس کی تنخواہ کا بیشتر حصہ ڈاکٹروں کی جیبوں میں چلا جایا کرے۔ اور لاجی بہار کا تروتازہ پھول ہے۔ جس کی پنکھڑیوں سے شبنم کی بوندیں ٹپک رہی ہوں، جہاں اُسے جدید طرز کے خوب صورت کپڑے پہنا دیئے گئے۔ تو اس کا خواب آگیاں حُسن قیامت خیز حد تک نکھر جائے گا۔ اور اس کے دوست اس پر رشک کیا کریں گے۔ اور جب وہ انجینئرنگ کالج سے نکل کر انجینئر بن گیا۔ تو ہر بڑے افسر کی بیوی لاجی..... نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی لاجی سے دوستی پیدا کرنے کی خواہش مند نظر آئے گی..... وہ لاجی کو گھر میں بڑھا لکھا کرنئی روشنی کے تمام آداب سکھا دے گا۔ پھر اُس کی زندگی ایک طویل اور روشن دن ہوگا۔ جو ادک کے گنجان سائے میں پائپ پیتے اور برتنے کا ناول پڑھتے گزر جائے۔ انہی سنہری پنوں کے جال بنتے فیصل کو نیندا گئی اور وہ سو گیا۔

صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ وہ بیدار ہو گیا۔ اُس نے اُٹھتے ہی سب سے



پہلا کام یہ کیا۔ کہ چوکیدار کو دو خچروں کے فوری بندوبست کے لئے کہہ دیا۔ چوکیدار سمجھ گیا۔ کہ بابو صاحب شہر واپس جا رہے ہیں۔ اس نے کوئی سوال نہ کیا۔ اور بستی کی جانب خچروں کا انتظام کرنے چل پڑا۔ اتنی دیر میں فیصل دیگر تیار یوں میں مصروف ہو گیا۔

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد چوکیدار بھورے اور ہلکے نسواری رنگ کی خچریں ساتھ لئے اوپر ریگ ڈنکی پر نمودار ہوا۔ فیصل ضروری سامان باندھنے کے بعد دھوپ میں آرام کرسی پر نیم دراز پائپ کے ہلکے ہلکے کش کھینچ رہا تھا۔ اور آنکھوں میں بالوں کے پت بناتی ہوئی لاجبھی کی تصویر گھوم رہی تھی۔ چوکیدار نے دونوں خچروں کو چیر کے درختوں کے ساتھ باندھا۔ اور فیصل کے قریب آکر صدری کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

”خط علی جان رات کو ہی لے آیا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے پاس ہی رکھ چھوڑا۔“

”خط بے کیسا خط؟“

فیصل نے گہری محویت سے چونک کر پوچھا۔

”کہہ رہا تھا۔ پتہ اسی مکان کا ہے۔ دیکھ لیئے۔“

چوکیدار نے ہلکے نیلے رنگ کا میلا سا لفاظہ نکال کر فیصل کی جانب بڑھایا۔ فیصل فوراً پہچان گیا۔ یہ کلثوم کا خط تھا۔ وہ ہمیشہ ہلکے نیلے رنگ کے لفاظہ استعما کرتی ہے۔ پتہ انگریزی کے میدھے لمبوترے حروف میں لکھا تھا۔ فیصل نے پائپ تپائی پر رکھ دیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفاظہ چاک کر کے خط پڑھنے لگا۔ خط محبت کے عمیق جذبات سے لبریز تھا۔ اس میں جدائی کے موگوار دونوں اور ویران راتوں کا ذکر تھا۔ اور اُن لمحات کی یاد دہائی کرائی گئی تھی۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے پیار بھری سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے۔ اور وہ فیصل کے لئے خوب دوا رچائے بنایا کرتی تھی۔ اور اس کے پائپ میں تمباکو بھرا کرتی تھی۔ اور سُرخ منظر کو گردن کے گرد لپیٹا کرتی تھی۔ فیصل نے خط تپائی پر رکھ دیا۔ اور اس کے چہرے پر گہرے غور و فکر کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس کی

آنکھوں میں سے تھوڑی دیر پہلے کی شگفتگی ایک دم غائب ہو گئی۔ اور اس کی جگہ ہلکی ہلکی فکر مندانہ پتھر مردگی نے لے لی۔ اس کا ہاتھ غیر شعوری طور پر اپنی گردن کی طرف چلا گیا۔ اور وہ بے پروائی سے ڈالے ہوئے سُرخ منظر کو درست کرنے لگا۔ بے چاری کلثوم..... اُسے فیصل کا کتنا خیال رہتا ہے۔ مگر یہ خط اس وقت کیوں آیا۔ وہ تو آج شام لالچ کو ساتھ لے کر شہر جا رہا تھا..... پھر کیا ہوا؟..... وہ کلثوم کے پاؤں پڑ جائے گا۔ کلثوم اُسے ضرور معاف کر دے گی۔ وہ اس سے شدید محبت کرتی ہے۔ اور اس کا دل بے حد نیک ہے۔ لیکن اس کے دل پر یہ حادثہ گہرا زخم لگا جائے گا۔ شاید وہ اس زخم کی آفتیت برداشت نہ کر سکے۔ اور مر جائے۔ اگر وہ مر گئی۔ تو بہت بُرا ہوگا یہ گناہ اُسی کے سر پر ہوگا۔ فیصل سوچتے سوچتے بے چین سا ہو گیا۔ اور پائپ سلگانے لگا۔

پھر کیا ہو؟ کلثوم کو مرنا نہیں چاہیئے۔ اُسے زندہ رہنا چاہیئے۔ پر وہ زندہ نہیں رہے گی۔ لاجبھی کا غم اُسے کھا جائے گا۔ وہ پہلے ہی بڑی غم خور لڑکی ہے۔ فیصل نے پائپ کا صاف اور نیلگوں دھواں اڑاتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ کلثوم کا خط اپنے ساتھ شہر کی ہنگامہ پرور زندگی کی یاد بھی لایا تھا۔ فیصل کی آنکھوں کے سامنے فراتے بھرتی کاریں گزرنے لگیں۔ اور اُن کے خوش آواز بارن بجنے لگے۔ اس نے جو راہوں میں خوش بوش لوگوں کے میحوم دیکھے۔ اور میزوں کے گرد بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکیوں کو اپنے دوستوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا۔ اور پھر اسے ایک ایسا منظر دکھائی دیا۔ جس نے اس کے جسم پر کیگی سی طاری کر دی۔ اس نے دیکھا۔ کہ وہ لاجبھی کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو رہا ہے۔ لاجبھی بہترین لباس میں ملبوس ہے۔ وہ بے حد حسین دکھائی دے رہی ہے۔ اور ہر آدمی اُس کے کہتانی حُسن سے متاثر معلوم ہو رہا ہے۔ وہ بڑی گھبرائی ہوئی سی ہے اور اس کے معصوم چہرے پر پسینہ آ رہا ہے۔ اور قدم بے ترتیبی سے اُٹھ رہے ہیں۔ وہ فیصل کے ساتھ ایک خالی میز کی طرف بڑھتی ہے کہ اچانک اُس کا جوتا چکنے فرش پر سے پھسل جاتا ہے۔ اور وہ دھڑام سے گر پڑتی ہے۔ اور لوگ منہ نہ

کر کے ہنسنے لگتے ہیں۔ اُف فیصل نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے تپائی پر کلثوم کا خط کھلا تھا۔ جس کے ایک طرف ”میرے فیصل“ لکھا ہوا تھا نظر آ رہا تھا۔

اس نے سوچا۔ لیکن کلثوم بھی تو اس طرح پھسل سکتی ہے..... مگر شاید وہ ہوٹل میں داخل ہو کر گھبرائے گی نہیں۔ اور اس کے ماتھے پر پسینہ نہیں آئے گا۔ فیصل اٹھ کر بے قراری سے گھاس پر ٹہلنے لگا۔ اس کا ذہن اب اُس سے عجیب عجیب قسم کے سوال پر چڑھ رہا تھا۔ وہ لاجی کو شہرے جا کر رکھے گا کہاں؟ اگر اس کے ماں باپ نے اس گنوار لڑکی سے شادی کی اجازت نہ دی۔ تو پھر وہ کہاں جائے گا؟ اس نے ابھی تعلیم بھی مکمل نہیں کی..... فیصل حیران تھا۔ کہ یہ ذہن اس وقت کہاں تھا؟ جب وہ چشتے کے پاس لاجی کو اغوش میں لئے بیٹھا تھا اور اس کے سنہری بالوں کو چوم رہا تھا۔ اور چاند درختوں کے اوپر آگیا تھا۔ اور نیچے وادی میں لاؤ کے گرد کنواریاں گیت گارہی تھیں..... شاید رات اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ روشنیوں اور خوشبوؤں سے مہکا ہوا خواب ایسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ اُس نے پہاڑ کی کسی آن پڑھ لڑکی کو شہرے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جہاں وہ اس سے بیاہ کر لے گا۔ اور اُسے اپنے ساتھ لے کر ہوٹلوں اور کلبوں میں گھومے گا۔ بھلا کہاں موضع چندن کوٹ کے کچے مکان اور کہاں کیفے دی بالزاک کا چکیلا بال روم!..... لاجی کو ہمراہ دیکھ کر ہر آدمی اُس کا مذاق اُڑائے گا۔ سوسائٹی اسے مشتبیہ نگاہوں سے گھورے گی۔ ہر ایک پر سیاہ بات کھل جائے گی۔ کہ وہ اس لڑکی کو پہاڑ پر سے بھگا کر لایا ہے۔ اور شریف آدمی اس پر اپنے گھروں کے دروازے بند کر دیں گے۔ وہ شہر بھر میں بدنام ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے۔ اُسے کالج سے بھی برخواست کر دیا جائے۔ پھر وہ کیا کرے گا؟ اُس کا سارا مستقبل تباہ ہو جائے گا..... فیصل اس خیال سے سہم گیا۔!

اُس نے جلدی سے کلثوم کا خط اور لٹافہ جیب میں ڈالا اور تمباکو کا ڈبہ اٹھا کر چوکیدار کو آواز دی۔ چوکیدار ہاتھ پونچھتے ہوئے باورچی خانے کے دروازے

پر نمودار ہوا۔

”سامان خچر پر رکھو۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔“

”ابھی؟“ چوکیدار نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں! ابھی۔ اسی وقت۔“

اور وہ اندر جا کر جلدی جلدی کوٹ پہننے لگا۔

شام ابھی نہیں ہوئی تھی۔

ابھی سورج کا تھال لیکھم پور کی پہاڑیوں سے بہت اُپر تھا۔ ابھی جہاں گاہوں میں بیٹھ بکریاں ہری ہری گھاس چر رہی تھیں۔ اور ابھی فیصل لیکھم پور کے اڈے پر شہر جانے والی لاری پر اپنا سامان رکھوا رہا تھا۔ کہ لاجی دودھ کی گائے گھٹائے پکڑ لڑی پر نمودار ہوئی۔ آج اس نے سنہری بال لسی سے دھوئے تھے۔ اور نیلی آنکھوں میں کاجل ڈال رکھا تھا۔ اس کے رخساروں کا رنگ شہابی ہو رہا تھا۔ اور بالوں میں نیلوفر کا پھول لگا تھا۔ وہ ہر شے پر غزدہ الوداعی نظریں ڈال رہی تھی۔ چڑھائی طے کر لینے پر وہ اُپر والے چورس پتھر پر رُک گئی تھی۔ اور اس نے اُداس نگاہوں سے اپنے کھریا مٹی سے پلے ہوئے مکان کی چھت کو دیکھا تھا۔ اور اُسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال آگیا تھا۔ اور ہر وقت اچھل کود مچانے والی شریر اُگی یاد آگئی تھی۔ جس کے سر پر اُس نے جُدا ہوتے وقت محبت سے ہاتھ پھرا تھا اور جو بڑے بڑے دیدے گھما کر اُسے خوشی سے دیکھنے لگی تھی۔ لاجی نے چشتے پر اُگے ہوئے پیدے کے گھنے درختوں کو دیکھا۔ ان درختوں کی چھاؤں میں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ اور اب وہ انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی تھی۔ درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ اور ان کی لنگتی ہوئی لمبی شاخیں آہستگی سے جھول رہی تھیں۔ لاجی کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اس نے ہلکی سی آہ بھری۔ اور گاگر سنبھال کر اپنے پر دیسی محبوب سے ملنے چل پڑی۔

جس وقت وہ پتھر کی سیڑھیاں اتر کر مکان کے صحن میں آئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ برآمدہ خالی تھا۔ وہاں کوئی کرسی نہ تھی۔ دروازہ بند تھا۔ اور چوکیدار غائب تھا۔ لاجی نے گاگرزین پر رکھ دی۔ اور جلدی سے برآمدے میں آگئی۔ دروازہ پر زنگ آلود تالا پڑا تھا۔ لاجی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ جیسے وہ تالا نہ ہریے ناگ کا بھن ہو۔ وہ نیم دیوانوں کی طرح بھاگ کر باورچی خانے کی طرف گئی۔ باورچی خانے میں بھی قفل لگا تھا۔ لاجی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اگر وہ کھڑی رہی۔ تو اس کا دل سینہ چیر کر نکل آئے گا۔ وہ آہستہ سے زمین پر بیٹھ گئی۔ مٹا ایک طرف سے چوکیدار کا چہرہ نمودار ہوا۔ لاجی اس کی طرف دیران نگاہوں سے تکتے لگی۔ وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ چوکیدار باورچی خانے کی دیوار کے پاس خاموش کھڑا تھا۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتا لاجی کے پاس آیا۔ اور اس کے سنہری بالوں میں لگے ہوئے نیلوفر کے پھول کو محبت سے مہلاتے ہوئے بولا۔

”اب کیا فائدہ بیٹی! مسافر تو کوچ کر گیا۔“

اس نے بڑی محبت سے لاجی کو اُپر اٹھایا۔ اور اس کے سر پر ہاتھ پھرنے لگا۔ میں سب کچھ جانتا ہوں لاج! لیکن تمہیں جی ہلکا نہیں کرنا چاہیئے پردیسی اور بیچی کا کیا اعتبار..... تیرا نازک دل ضرور ٹوٹ گیا ہوگا۔ پردل تو ٹوٹنے کے لئے ہی ہوتا ہے۔“

مگر لاجی کچھ نہ سن رہی تھی۔ وہ کچھ نہ سمجھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ ایک دم ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ اور رخساروں کا شہابی رنگ اڑ گیا تھا اور نیلی آنکھوں کی جھیلیں خشک ہو گئی تھیں۔ اور وہ پتھرائی ہوئی نگاہوں سے کسی نہ معلوم نقطے کو گھور رہی تھی۔ اس کے سامنے سوچ پہاڑوں پر جھک آیا تھا۔ اور جنگلوں پر ڈھلتی دھوپ کی افسردہ گرد سی اُڑنے لگی تھی۔ اُنہی جنگلوں کے درمیان وہ تپلی سی بیج دار سڑک بھیجی تھی۔ جو لیکھ پور کو جاتی تھی۔ اور جس پر زرخیز

کی گھنی چھاؤں تلے عبور سے رنگ کی دخنچیں چلی جا رہی تھیں۔ ایک پر سنہری بالوں والی کوئی چرواہن سوار تھی۔ اور دوسری پر سُرخ منظر پہنے ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ دونوں ہر موڑ پر پیچھے گھوم کر دیکھ لیتے تھے۔ اور خچروں کی رفتار اور تیز کر دیتے تھے۔ چوڑے جنگلوں کی خوشبودار سوا میں لڑکے کا سُرخ منظر اور چرواہن کے سنہری بال اُڑ رہے تھے۔ اور لیکھ پور کے قریب پہنچ کر وہ ایک جگہ اُتر پڑے اور انہوں نے قریب ہی ایک پھوٹی سی ندی پر خچروں کو پانی پلایا۔ ایک دوسرے کو محبت کی عمیق نگاہوں سے دیکھا اور مسکائے۔ اور پھر خچروں پر سوار ہو گئے اور لیکھ پور پہنچ گئے۔ اور وہاں لاری تیار کھڑی تھی۔ اور وہ اس میں بیٹھ گئے۔ اور ہوا ایک دم تیز ہو گئی اور درخت جھومنے لگے۔ اور پیچھے کی طرف بھاگنے لگے۔ اور شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ اور فیصل نے لاجی کو اپنی طرف کر لیا۔ اور وہ اس کے ساتھ لگ گئی۔ اور اس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

”پردیسی!..... مجھے اپنے اندر چھپا لو.....“

.....

چوکیدار نے لاجی کو اپنے کشادہ سینے سے لگایا۔

”مت یاد کرو اُسے بیٹی..... وہ تو تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اُسے تمہارا

خیال تک نہیں آیا۔ پھر تم اس کی یاد میں آنسو کیوں بہاؤ؟ پردیسوں کے دل پہاڑوں سے بھی زیادہ محنت ہوتے ہیں۔ تم بھی اس کا خیال بھلا دو۔ تمہارا باغ تمہارا چشمہ، تمہاری اکی اور تمہارے سید کے درخت بھلا تم سے کم محبت کرتے ہیں۔ وہ تو تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گے۔ اور تمہیں دُور سے باہنیں پھیلا کر بلایا کریں گے..... پھر تم اُداس کیوں ہوتی ہو؟ پھر تم آرزو کیوں ہو؟“

لاجی نے اپنا سر بوڑھے چوکیدار کی چھاتی سے لگا دیا۔ اور آنکھیں بند

کر لیں۔ اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اور چونک کر اپنا کانپتا ہوا بوڑھا ہاتھ اُس کے بالوں پر پھرنے لگا۔  
 ”..... رومت میری بچی! بہار پھر آئے گی۔ پھول پھر کھلیں گے۔ اور آلوچوں کا رنگ سنہری ہو جائے گا۔ اور وہ شہد سے بھر جائیں گے۔ اور تمہارا پردیسی تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ لیکن تمہاری محبت تم سے جدا نہیں ہوئی۔ یہ کنول ہمارے دل کے تال میں سدا خوشبو دیتا ہے..... رومت  
 ” رومت لاجی! رومت لاجی!“

لاچ کے آنسو ختم ہو گئے تھے۔ اور نیلی جھیلیں سوکھ گئی تھیں۔ اُس نے چونکدار کی چھاتی سے اپنا سر ہٹایا۔ اور دودھ سے بھری ہوئی کانگرا اٹھائی اور یوں گھر کی سمت چل پڑی۔ گویا اپنے مردہ بچے کو دفنانے قبرستان جا رہی ہو۔ پاک ڈنڈی پر درختوں کی لمبی ٹہنیوں نے جھک کر لاجی سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ چنار کی شاخوں میں ایک گلغدار نے چیخ کر اس کے غم میں فریاد کی۔ مگر لاجی خاموش رہی۔ اور ہلکیں جھکائے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ٹھوکریں کھاتی آگے گذرتی گئی۔ چشے کے پاس پاک ڈنڈی پر سے نیچے اترتے ہوئے لاجی نے پردیسی کی آواز سنی۔

”..... میں تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا لاجی!..... میں تمہیں شہرے چلوں گا۔ وہاں ہمارا گھر ہے۔ میری ماں ہے۔ اور بہنیں ہیں..... اور وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی..... بہت خوش..... چلو گی لاجی!“  
 لاجی کیا جواب دیتی۔ لاجی کیا جواب دے سکتی تھی، اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے فیصل کے بازوؤں میں اپنا منہ چھپایا..... اور فیصل نے اُسے اپنے ساتھ بیٹھ لیا اور لاجی کے تنفس کی حدت بڑھ گئی۔ اور روشن اور ٹھنڈا چاندیو لپٹس کی ٹہنیوں پر سے اُن پر نیلگوں چاندنی بکھرنے لگا۔ وہ پتھر پر بیٹھے تھے۔ اور اُن کے اوپر خوشبودار چاندنی کا دودھیا غبار تھا۔ اور نیچے

..... دُور نیچے الاؤٹے گڑچروا ہنوں کے مصوم چہرے جھک رہے تھے۔ اور اُن کے درد بھرے گیتوں کے سروادی کی خاموش فضا میں گونج رہے تھے۔

ساڈی لمبی اڈاری مائے  
 ساڈی لمبی اڈاری مائے

.....

چشے کی طرف سے بھڑوں کے میانے اور ان کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ شام ہو گئی تھی۔ اور چرواہے اپنے ریوڑوں کو بانکتے گھروں کی سمت لوٹ رہے تھے۔ لاجی نے ہستہ سے گردن پھیر کر چشے کی طرف دیکھا اور درختوں تلے اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ اور جگنوؤں کے پھول چمکنے لگے تھے۔ اور چشے کے پانی کی سرل سرل صاف سنائی دے رہی تھی۔ اور سردی بڑھ گئی تھی لاجی نے کمرے کی آستین سے پلکوں پر آئے ہوئے آنسو پونچھے۔ اور دھڑکتے ہوئے دل کو دبائے نیچے اترنے لگی۔

اس رات چندن کوٹ کی وادی سے بہار شبنم بہاتی رخصت ہو گئی اور درختوں کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور اُن کے قدموں پر بھڑے ہوئے پتوں کا فرش بچھ گیا۔ سرشام بلند ٹیلیوں پر کبھر کے بادل جھک آتے۔ اور چپڑ کے جنگلوں میں خزاں کے جھکڑات بھر چمکتے رہتے۔ گھائیوں میں گھاس کے خوشے زرد پڑ گئے، اور چٹانوں کے سنگین سائے منجمد ہو گئے، شاخوں پر سے پتے جھڑتے ہی میٹھی بولیاں بولنے والے پرندے میدانوں کی جانب اڑ گئے۔ اور ریشمی کنڈکی غیر مہوار چڑیاں اہند کے دبیز غلات میں ڈوب گئیں۔ چندن کوٹ سے اُد پر چشے کو آنے والی پاک ڈنڈی گرے پڑے پتوں میں چھپ گئی تھی۔ لاجی ان سوکھے پتوں پر سے گذر کر ہر روز چشے پر آتی۔ اور گھٹنوں پر بیٹھی افسردگی سے پانی کی سطح پر گری ہوئی مردہ ٹہنیوں کو دیکھتی رہتی۔ ہوا اس کے اوپر درختوں کی بے برگ دیوار شاخوں میں سے غم آلود کراہ کے ساتھ گزرنے لگتی۔ اور خشک پتے اڑا کر

اس کے گرد آلود ننگے پاؤں چومنے لگتے، لیکن لاج انہیں پیار کا ایک لفظ نہ کہتی، اور پتھر کی بے جان مورتی بنی بیٹھی رہتی۔ کیا وہ اپنے پردیسی کا انتظار کر رہی ہے۔ مگر پردیسی کبھی لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔ اور اس کا پردیسی کیسے ڈی بازاک میں کلثوم کے ساتھ بیٹھا ہوگا، اور دونوں سیاہ کافی پی رہے ہوں گے اور بال روم تمباکو کے دھوئیں۔ کافی کے فلیور، نیم عریاں جسموں کی گرمائش اور مصنوعی قہقہوں اور مغربی موسیقی کے بے ہنگم شور سے لبریز ہوگا اور پائپ کے کش لیتے ہوئے پردیسی کلثوم کی آنکھوں میں بہار کا حسن دیکھ رہا ہوگا۔ اور سوچ رہا ہوگا۔ وہ کس قدر خوش قسمت ہے۔ خوشبودار تمباکو، ایک دلچسپ لڑکی کا قرب اور کافی کی پیالی..... یہ ہے زندگی کا نروان۔ یہ ہے حیات کی ملتی۔ کاش گوتم بدھ زندہ ہوتا۔!

لیکن گوتم بدھ مرجکا تھا۔ اور لاجی بھی مرجکی تھی۔ ایک نے کائنات کی نجات چاہی تھی، دوسرے کو اپنی محبت کا گیان حاصل ہوا تھا۔ اور موت نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ گوتم کایت بدھی مندر میں تھا۔ اور لاجی پتھر پر بیٹھی تھی۔ اور وہ ہر روز وہاں آکر بیٹھتی۔ اور کتنی دیر تک وہاں بیٹھی رہتی۔ اور ویران ویران آنکھوں سے کبھی درختوں کی ننگی ٹہنیوں، کبھی پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی دھند اور کبھی فیصل کے مکان کو جانے والی پتوں سے ڈھکی ہوئی پگڈنڈی کو تکتے لگتی۔ کسی وقت اسے ایک چرواہن کی میٹھی آواز سنائی دیتی۔

”ماؤ۔ ہو۔ ہو۔ اکی مان جاؤ۔ ہائے میں کیا کروں.....“

اور اسے چٹنے کی پرلی جانب، بلغ کی مینڈھ پر نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی ایک لڑکی کمان بنی جھکی دکھائی دیتی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھڑکی ہوتی۔ اور دوسرے ہاتھ میں بھڑکی گردن سے بندھی ہوئی رسی، پھر اسے ایک اور آواز سنائی دیتی پہلی آواز سے زیادہ میٹھی..... زیادہ مترنم! ”میں..... میں شہر سے آیا ہوں۔ میں یہاں پردیسی ہوں اور سامنے وہ

لکڑی کے مکان میں رہتا ہوں۔ اور اس گاؤں کا آسمان بڑا نیلا ہے، اور اس چٹنے کا پانی بہت میٹھا ہے۔ اور پھر وہ لمبے قد اور دبلے جسم والے ایک لڑکے کو دیکھتی جس نے بھورے رنگ کا سویٹر پہن رکھا ہوتا۔ اور جس کی تپلی سی ناک کے سرے پر چھوٹا سا تلی ہوتا۔ اور گردن کو قدرے خم دیئے، وہ سنہری بالوں والی لڑکی کو تنک رہا ہوتا۔ اور لڑکی شرم سے سمٹ جاتی۔ اور بھڑکی پشیم پر ہاتھ پھیرنے لگتی، اور لڑکا اس کے قریب آجاتا۔ اور پھر یہ منظر دھندلا ہو جاتا۔ اور فضا میں تحلیل ہو جاتا۔ اور پتھر پر بیٹھی ہوئی لاجی کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ آتا وہ بے جان آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتی۔ اور خزاں کی دھیمی دھیمی ہوا میں یوگلیٹس کی ٹہنیوں پر سے رہے سہے پتے ایک ایک کر کے اس کے بالوں، اس کی جھولی اور اس کے پاؤں پر گرتے رہتے۔ لاج کو محسوس ہوتا۔ کہ درخت بھی اس کے غم میں شریک ہیں، وہ ان پتوں کو وہیں پڑے رہنے دیتی۔ بھڑے افسردہ پتے..... درختوں کے آنسو..... مدفون محبت کے کتبے، گم شدہ بہاروں کے نشان! اور جب پہلے روز برف گری تھی۔ تو رات کو خوفناک طوفان آیا۔ آسمان دیکھتے دیکھتے سیاہ بادلوں میں چھپ گیا..... اور دایلوں میں تیز آنکھوں کے جھلکے چھتے چلاتے شور مچانے لگے۔ بجلی کی چمک چوند کر دینے والی چمک کے ساتھ ہی بادل ہیبت ناک انداز میں گر جا اور تڑپنا تڑپنا اولوں کا مینہ برسنے لگا۔ بارشوں میں دبی ہوئی بھڑکی میاں لگیں۔ اور بادلوں کے مہیب قہقہے تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔ لاجی اپنے اک منزلہ مکان کی چھت تلے لفافے میں دبی جاگ رہی تھی۔ اور طوفان کی جھین سن رہی تھی۔ کوٹھڑی میں دیا بجھ چکا تھا۔ اور اس کی بوڑھی ماں دوسری چارپائی پر سو رہی تھی۔ لاجی سوچنے لگی۔ پردیسی اس وقت کہاں ہوگا؟ شاید اس کے دیس میں بھی بادل گرج رہا ہو اور او بے پڑ رہے ہوں۔ اور وہ اپنے گرم بستر میں گہری نیند کا لطف اٹھا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں پردیسی کی شکل گھومنے لگی۔ پتلا ساناک اور ناک پرتلی

چمکیل آنکھیں اُچھے اُچھے بال، اور ہونٹوں سے اٹھتی ہوئی تباہی کو کیڑی کیڑی کرطوی  
ہو، ہائے وہ مجھے چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟

لاجی کی آنکھوں میں گرم گرم آنسو اُٹکے۔ اس نے لحاف دانتوں میں دبا  
لیا۔ اور ہولے ہولے سسکیاں بھرنے لگی،

بادل ایک مرتبہ زور سے گر جا۔ اور لاجی کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کوئی بند  
دروازے کے باہر کھڑا مدد کے لئے پکار رہا ہو۔

”پردیس یہ تم ہو؟ تم آگئے؟ تم چلے کیوں گئے تھے؟“

بادل پھر زور سے گر جا اور لاجی کو بڑے زور سے دروازے پر دستک سنائی  
دی۔ وہ باہر کھڑا ہے، اس کا سویر بیگ گیا ہوگا۔ اور اس کے بال بارش میں  
شرابور ہوں گے اور.....

لاجی جلدی سے لحاف پھینک کر اٹھی۔ اور دروازے کی طرف بھاگ اُس  
نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ او لے مگر نا بند ہو گئے  
تھے۔ اور اب ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سرد ہوا میں لاجی کے بال اڑنے لگے  
اور اس کی پیشانی پر مینہ کی پھوار سی پڑنے لگی۔ اس نے مرطوب اندھیرے میں  
چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ لیکن پردیس کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ نا اُمید ہو  
کر چلا گیا ہے..... ہائے! میں نے پہلی آواز پر دروازہ کیوں نہ کھولا؟ وہ.....

کہاں گیا ہوگا؟ شاید چشمے پر میرا انتظار کر رہا ہو!

لاجی نے سیاہ کبل سے جسم ڈھانپا۔ اور گیلی پگ ڈنڈی پر قدم اٹھاتی  
اُدھر چڑھنے لگی۔ طوفان کا زور کم ہو گیا تھا۔ مگر گنجان جنگلوں کی طرف سے تیز  
ہواؤں کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آسمان تاریک بادلوں میں گم تھا۔ اور  
سرد ہوا لاجی کے کبل کو اڑا رہی تھی، چشمے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ کسی درخت  
کی بڑی سی ڈال ٹوٹ کر چشمے سے اُدھر گری ہوئی تھی۔ اور درخت سائیں  
سائیں کر رہے تھے۔ اور جیسے لاجی کو کہہ رہے تھے۔

تمہارا پردیس یہاں نہیں آیا۔ یہاں اس طوفان میں کون آئے گا آج؟“

.....

نہیں..... تم جھوٹ بولتے ہو۔ وہ ضرور آیا ہے۔ میں نے اس کی آواز سنی  
ہے۔ وہ چوکیدار کے ہاں گیا ہوگا۔!

اور لاجی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لکڑی کے مکان پر پہنچ گئی۔ جہاں کبھی  
اس کا محبوب ٹھہرا تھا۔ اور جہاں وہ شام کو دودھ لے کر جایا کرتی تھی۔ وہ لپک  
کر برآمدے میں پہنچی۔ اور اس نے دیکھا۔ کہ دروازوں پر تالے پڑے تھے۔ اور  
صحی میں پودوں کی ٹہنیاں اولوں کی مار سے ایک طرف کو جھک گئی تھیں۔  
وہ بے چین نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ بارش رُک گئی تھی۔ اور اب  
سپید سپید بحری سی گرنے لگی تھی۔ اندھیرا پہلے سے زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ اور  
تمام رستے بادلوں کی دھند میں چھپ گئے تھے۔ تیز ہوا میں بادل کا بڑا سا  
مکڑا اوپر پنگ ڈنڈی پر سے آگے کو گذرا، تو مٹا لاجی کے منہ سے ہلکی سی  
چرخ نکل گئی۔ اور وہ پانگلوں کی طرح پتھر کی سیڑھیاں الانگتی اُدھر پنگ ڈنڈی  
پر آگئی۔ اور ایک طرف کو بھاگنے لگی۔ اُس نے پردیس کو اپنی کھوئی محبت کو  
سڑک پر سے رشی کنڈ جانے والے رستے کی جانب مڑتے دیکھ لیا تھا۔ پتھروں  
پر سے پھسلتی، گرتی پڑتی وہ بادلوں میں بھاگی جا رہی تھی اور اس کا دم پھول  
گیا تھا۔ اور کبل کسی خاردار جھاڑی نے کیخ لیا تھا۔ اور جو تانکچہ میں دھنس  
کر پیچھے رہ گیا تھا۔ اور اب بحری نہیں گر رہی تھی۔ اب برف گرنے لگی تھی۔ او  
برف کے سپید گالے دھنکی ہوئی روٹی کی مانند ہوا میں چکرا رہے تھے۔ اور لاجی  
کو لمحہ بہ لمحہ گہرے ہوتے ہوئے بادلوں کی سُر مٹی دھند نے نکل لیا تھا۔ اور  
برفانی ہواؤں کے تپند جھونکے درختوں کی ٹنڈ منڈ ٹہنیوں سے سڑپک رہے  
تھے۔ غرارہے تھے۔ بیخ رہے تھے۔ چناروں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور  
وہ اپنی بانہیں پھیلا کر لاجی کو آوازیں دے رہے تھے۔

آواز دی۔

”وہ چائے تیار ہے جناب۔“

بوڑھے انجینیئر نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔  
پل بھر ٹھہر کر ملازم نے اپنا جملہ پھر دہرایا۔ بوڑھا انجینیئر بدستور بت بنا بیٹھا  
رہا۔ ملازم نے شبہ آمیز نگاہوں سے اپنے صاحب کو گھورا۔ اور آہستہ سے  
چل کر اس کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ اور جھجک کر بولا۔  
”جناب! کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

بوڑھے انجینیئر کے جسم میں خفیت سی حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں  
سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور بوجھل اور خشک آواز میں صرف اتنا کہا:-  
”انہیں..... انہیں بٹھلاؤ.....“

ملازم بے آواز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔  
انجینیئر کی بوڑھی انگلیاں کانپ رہی تھیں اور وہ آنکھیں بند کئے لاج کو یاد  
کر رہا تھا..... جس کی گردن پر سیاہ تل تھا اور جس کی آنکھیں نیلی تھیں اور  
بال سنہری تھے۔ اور جسے چاند کی نیلگوں روشنی میں ٹیلے کے پتھر پر بیٹھے اس  
نے کہا تھا۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ لاج! تمہیں شہرے چلوں گا.....“  
اور جسے چھوڑ کر وہ چپ چاپ چندن کوٹ سے بھاگ آیا تھا۔ اور جو اس  
کے انتظار میں سارا سارا دن چشمتے کے پتھروں پر بیٹھی رہتی تھی۔ اور اس  
کی آنکھوں میں آنسو ہوتے تھے۔ اور درختوں کے مڑھائے ہوئے پتے  
اس کی جھولی میں گرتے رہتے تھے۔ اور جس کی لاش ایک روز بوڑھے چوکیدار  
کو برف میں دبی ہوئی ملی۔ اور چوکیدار نے کہا تھا۔

”جب میں نے اس کی لاش کو برف میں سے نکالا۔ تو اس کی گردن پر  
سیاہ تل بالکل ویسا ہی تھا۔ اور نیلی آنکھوں کی جھیلیں منجمد ہو گئی تھیں۔ اور

”..... لاج کہاں جا رہی ہو؟ لاج! واپس کب آؤ گی؟ لاج! بہار میں  
ہم سُرخ کلیوں کے چراغ جلائے تمہاری راہ دیکھیں گے۔ تمہارا انتظار کریں  
گے۔ لاج! بہار میں واپس آ جانا۔ تم نہ ہو گی۔ تو ہمارے چراغ بجھ جائیں گے  
اور ہماری ٹہنیوں پر بسیرا لینے والے پرندے تمہیں چندن کوٹ میں نہ پا کر ہم  
سے ناراض ہو جائیں گے..... ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے..... لاج! کلین  
پروں والے پتھروں کا خیال رکھنا۔ اور سُرخ کلیوں والے چناروں کو بھول  
نہ جانا۔

..... لاج! لاج! پیاری لاج!..... ہماری لاج!..... رشی کنڈ کی  
دیوی! پہاڑوں کی رانی! برف کی بیٹی.....“  
چناروں کی فریادیں ڈوب گئیں۔ ان کی پھیلی ہوئی بانہیں منجمد ہو گئیں اور  
برف آلود جھکڑوں کا شور تیز ہو گیا۔ اور کسی لاج نے پلٹ کر انہیں جواب نہ  
دیا۔ کسی رشی کنڈ کی دیوی نے بہار میں آنے کا وعدہ نہ کیا۔ اور برف گرتی  
رہی۔ گرتی رہی۔ گرتی رہی۔  
اور اس روز تمام رات برف گرتی رہی۔

ملازم نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔  
کمرے میں خشکی بڑھ گئی تھی اور بوڑھا انجینیئر آتش دان کے پاس صوفے  
پر بیٹھا تھا۔ وہ دونوں کہنیاں گھٹنوں پر رکھے قدرے آگے کو جھکا بجھے ہوئے  
کوٹلوں کو گھور رہا تھا۔ دروازے کی جانب اس کی پشت تھی۔ اور ملازم صرف  
اس کے اُچھے ہوئے بال ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس کا سیاہ پائپ اس کے پاؤں  
میں اوندھے منہ پڑا تھا۔ اور دھوپ کے ڈھل جانے سے کمرے میں روشنی  
کا سنہرا غبار سا پھیل رہا تھا۔ اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر آہستہ سے

اس کا بدن کاچ کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا۔“

اور وہ شہر میں کلثوم سے بیاہ رہا کر بڑا افسر بن گیا تھا۔ اور خوب صورت سر کوٹھی میں رہنے لگا تھا۔ اور اس کے پاس اپنی چھوٹی سی کار تھی۔ اور اُسے کار کا الاؤنس ملتا تھا۔ اور لوگ رشوت کی ڈالیاں لے کر گھر پہنچتے تھے اور اس کے بچے کانٹنٹ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اور کلثوم بے حد موٹی ہو گئی تھی۔ اور کار میں بیٹھ کر صبح ہوا غوری کو جاتی تھی۔ اور چندن کوٹ کی دیوی..... بھولی اور معصوم چرواہن اس کی یاد اپنے سینے میں دبائے برف کے طوفان میں گم ہو گئی تھی۔ اور اس کی نیلی آنکھیں پتھر اگئی تھیں۔ اور بالوں میں الجھا ہوا خوبانی کا شگوفہ زرد پڑ گیا تھا۔

”مجھے معاف کر دینا لالچ..... اس غمزدہ بوڑھے کو معاف کر دینا لالچ!“

بوڑھے انجینئر کے ہونٹ کپکپائے اور وہ لرزتی پلکوں پر آئے ہوئے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ صوفے کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بھاری قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اُسی شام اُس نے سڑک بنانے والوں کے نام کچھ احکام جاری کئے۔ اور چندن کوٹ کی وادی سے رخصت ہو گیا۔

اگلے دن راستے میں آئی ہوئی قبر ڈھادی گئی۔ اور سڑک اوپر نکل گئی۔